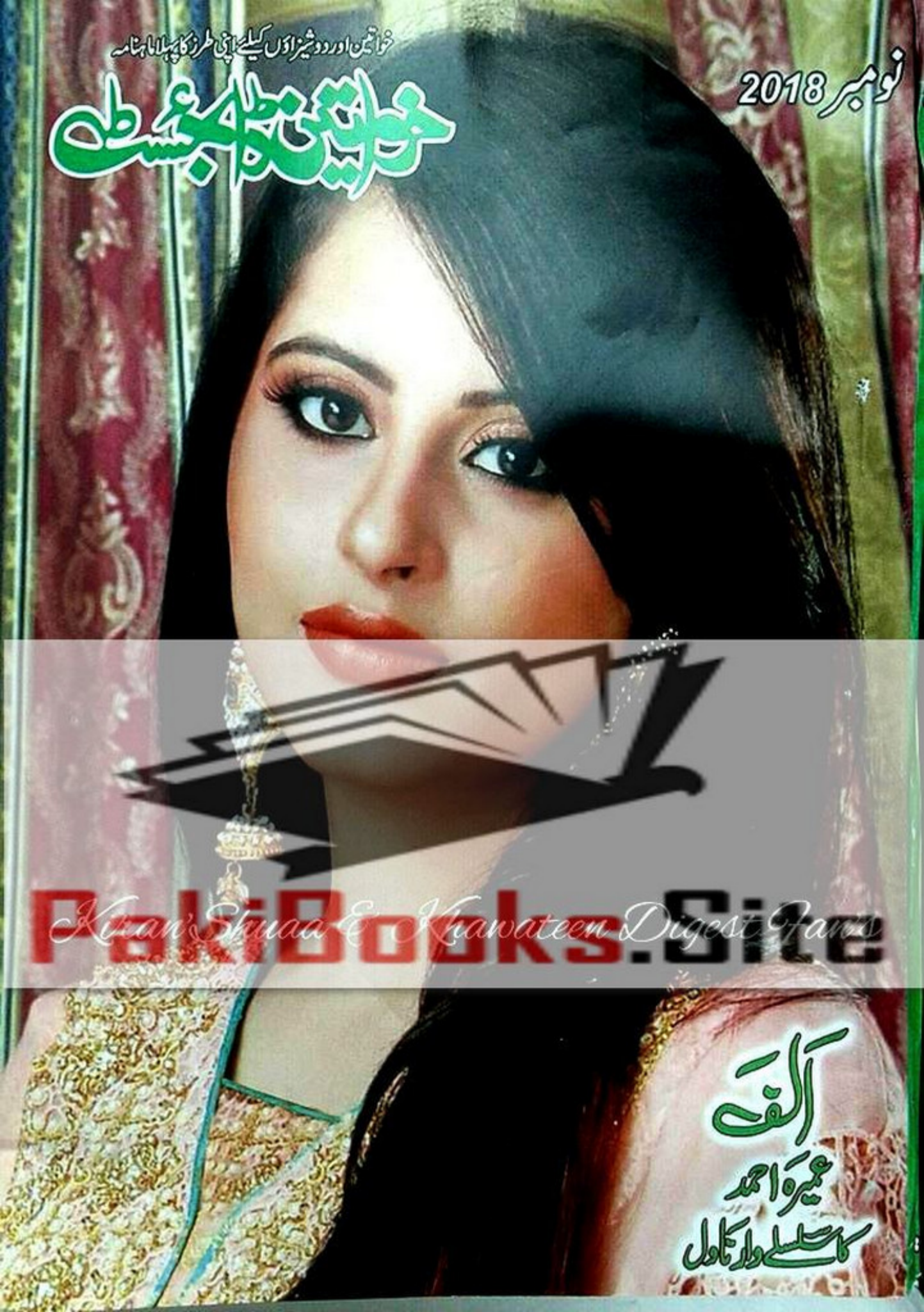


خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

نومبر 2018

خواتین کا مہینہ



Kiran Shuaa & Khawateen Digest Fans
PakiBooks.Site

آلف
عمیرہ احمد
سلسلے وار کامل

بہنئی سنٹی،
کرن کرن روشنی،
ہمارے نام،

12 مسیر

13 ادارہ

242 نادر خاتون



غیر احمد
غیر احمد

الف،
حالم،



سمیر احمد
نعیم فخر

ام الیقین،
رزقِ زوال،

18 افشاجی

قصہ آبِ زوال کا،



آوا مید بائیں،
عائتہ تنویر،
میر دلیر میر کے ساتھ،
افین نعیم

240

امت الصبور

میری ڈائری سے،



26 شاہین رشید

بائیں الغم تنویر سے،



حیثیہ کا ہنس،
رشتے کی دھلک،
بشریہ
آسیر عید



20 شاہین رشید

شنیل اسکندر،



نظمیں غزلیں

234 جاذب قریشی

235 سید عارف

234 زبیر فیصل عباسی

235 جواد مقصود

غزل
غزل
غزل
نظم

رنگارنگ پہول

236 رنگارنگ سلسلہ شگفتہ جاہ

میری بیاض سے

239 آپ کی بیاض سے خالہ جیلانی

پکوان

255 موسم کے پکوان خالہ جیلانی

254 آپ کا باورچی خانہ سلمیٰ ناز

بیوٹی بکس

258 بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور

نفسیات

256 نفسیاتی لادرواحی تجزیں حدسان

نومبر 2018

جلد 46 شمارہ 7

قیمت 70 روپے

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر کا شمار ایسے ماضی میں۔ شائیں اور صبیحیں ٹکی کا احساس دلاتی ہیں لیکن اس شہر پہ مٹی میں جسے عروس البلاد کہتے ہیں، گرمی کی شدت میں جون کی یاد دلانے ہی ہے۔

سب سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب سارے موسم اپنا احساس دلاتے تھے۔ دم جم برستی بارش کی بوندیں دھج کو شاداب کرتی تھیں۔ موسم سرما کی طویل بریلیاں، بریلیاں اور چاروں اور خاموشی سوچ کے دوا کرتے تھے۔ سوز و گداز کی کیفیت طاری کرتی تھی۔ خزاں میں ٹوٹے پھرتے۔ زرد پتے اور منڈ شاخیں ٹپپ سی اُداسی بکھر دیتیں اور ہسٹل کی دستک پر چاروں اور ہریالی اور پھولوں کے رنگوں میں قدرت کی جلوہ گرمی ایک سرخوشی کی کیفیت طاری کر دیتی تھی۔ سارے موسم کہیں کھو گئے ہیں۔ بے ہنگم ٹریک اب تو گلتا ہے جسے زمینیں کر دھ لیتا بھول گئی ہیں۔ سارے موسم کہیں کھو گئے ہیں۔ بے ہنگم ٹریک کا شور، آلودگی، گنجان آبادیوں کی گھن، صنعتی زندگی، دھواں دھواں فضا، موسموں کا سارا طعنہ ہی چرلے گئی ہیں۔ اب نہ بارشیں ہیں نہ سرد موسم کی بریلیاں۔ ہمارے بھی سارے رنگ مر جاتے ہیں۔ انسان نے کار فطرت میں مداخلت کی تو فطرت نے بھی اپنے حسن کو مستور کر لیا۔ فطرت کے اصول ان میں اور قانون فطرت میں مداخلت کی سزا بھی جھگٹنا پڑتی ہے۔

یوں تو صنعتی زندگی نے پوری دنیا میں ماحول کو تبدیل کیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کوئی پلاننگ نہ ہونے کے سبب اس کے اثرات زیادہ واضح نظر آ رہے ہیں۔ خصوصاً کراچی میں بے پناہ بڑھتی آبادی، درختوں کی کمی، اور شجر کاری نہ ہونے کے سبب کئی سالوں سے بارش نہیں ہوئی ہے۔

پچھلے دہائی میں میٹرک لگائی گئی جو درخت لگانے اور انہوں نے اس شہر کو مزید بخر افروذر کر دیا۔ بنا حقیقی صرف کم قیمت کو ملنے نظر آتے تھے۔ ہمارے کو تو کارپس کے درخت لگانے کی وجہ سے صرف سالوں کی بیماریاں ہیں اضافہ ہوا بلکہ ان درختوں نے زمین کی ساری نمی بھی چوس لی۔

اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ ہمارے قریب، ملکی محلوں میں جہاں یہ درخت ہوں، انہیں اکھاڑ پھینک لیں۔ اگر استطاعت اور سہولت ہو تو ایک درخت اپنے گھر کے قریب ضرور لگائیں۔ یہ کاروبار ہے اداس میں ہماری آئندہ نسلوں کی بقا بھی پر مشید ہے۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ الف - عمیرہ احمد کا ناول،
- ۲۔ ام الیقین - سمیرا حمید کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ۳۔ رزق قتال - نغمہ ناز کا مکمل ناول،
- ۴۔ انشیں نعیم اور عائشہ تنویر کے ناول،
- ۵۔ بشری احمد، آسیہ حمید، فریض فیاض اور عزیزین دل کے افسانے،
- ۶۔ مشہور صحافی علامہ مسعود اور منیبہ مسعود کا بندھن،
- ۷۔ کن کن رشتہ - پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- ۸۔ ہمارے نام، لہجائی از دواچی الجینس اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کین کین روشنی

ادارہ

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی آوازیں سنیں، وہ کہہ رہے تھے۔

”ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد کر دیا۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

تو لوگوں نے کہا کہ۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیدیوں کو آزاد کر دیا ہے۔“

تو سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اپنے بیٹے سے) کہا۔ ”اے عبد اللہ! اس لونڈی کے پاس جا اور اس کو بھی چھوڑ دے۔“

(مسلم)

نذر، پورا کرنے کا حکم

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسئلہ پوچھا۔

نذر (ماننے) کے مسائل

اللہ کی اطاعت

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حائلف سے لوٹنے کے بعد (مقام) حیرانہ میں تھے تو کہا۔

”یا رسول اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے جاہلیت میں ایک دن مسجد حرام میں عکاف کرنے کی نذر کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”جا ایک دن کا عکاف کر۔“

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نذر میں سے ایک لونڈی ان کو عنایت کی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب قیدیوں کو آزاد کر دیا تو

ہے اور مسکینوں کو فائدہ ہوتا ہے۔)

نذر اور تقدیر

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”نذر کسی ایسی چیز کو آدمی سے نزدیک نہیں کرتی جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں نہیں لکھی، لیکن نذر تقدیر کے موافق ہوتی ہے۔ نذر کی وجہ سے بخیل کے پاس سے وہ مال نکلتا ہے جس کو وہ نکالنا نہیں چاہتا۔“

جو نذر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہو

راوی نے کہا کہ ”انصار کی ایک عورت قید ہو گئی اور عصباء بھی قید ہو گئی پھر وہ عورت قید میں تھی اور کافر اپنے گھروں کے سامنے اپنے جانوروں کو آرام دے رہے تھے۔ وہ ایک رات قید سے بھاگ نکلی اور اونٹوں کے پاس آئی۔ جس اونٹ کے پاس جانی وہ آواز کرتا، وہ اس کو چھوڑ دیتی یہاں تک کہ اس عصباء کے پاس آئی تو اس نے آواز نہیں کی اور وہ بڑی غریب اونٹنی تھی۔ عورت اس کی پیٹھ پر بیٹھ گئی پھر اس کو ڈانٹا تو وہ چلی، کافروں کو خبر ہو گئی، وہ عصباء کے پیچھے چلے (اپنی اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر) لیکن عصباء نے ان کو تھکا دیا (یعنی کوئی پکڑ نہ سکا کہ عصباء اتنی تیز رہی) اس عورت نے نذر کی۔

”کہ اے اللہ اگر عصباء مجھے بچالے جائے تو میں اس کی قربانی کروں گی۔“

جب وہ عورت مدینہ میں آئی تو لوگوں نے دیکھا اور انہوں نے کہا۔

”یہ تو عصباء ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی۔“

وہ عورت بولی کہ ”میں نے نذر کی ہے کہ اگر عصباء پر اللہ تعالیٰ مجھے نجات دے تو اس کو نذر کروں گی۔“

یہ سن کر صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

”میری ماں پر نذر تھی اور وہ اس کے ادا کرنے سے پہلے ہی مر گئی۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس کی طرف سے تو ادا کر دے۔“

خود کو مشکل میں ڈالنا

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ ”میری بہن نے نذر مانی کہ بیت اللہ تک منگے پاؤں پیدل جائے گی۔“ تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھنے کا کہا۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”پیدل بھی چلے اور سوار بھی ہو۔“

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو اپنے دونوں بیٹوں کے درمیان تکیہ لگائے جا رہا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔ ”اس کا کیا حال ہے؟“

لوگوں نے کہا۔ ”اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ اس عذاب کے دینے سے بے پروا ہے۔“

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو سوار ہو جانے کا حکم کیا۔

(مسلم)

نذر کسی چیز کو واپس نہیں کر سکتی

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نذر سے منع فرمایا اور فرمایا۔

”اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ (یعنی کوئی آنے والی بلا نہیں رکھتی اور تقدیر نہیں پھرتی) بلکہ بخیل کے دل سے مال، نذر کے سبب سے نکالا جاتا ہے۔“

(یعنی بخیل یوں تو خیرات نہیں کرتا اور جب آفت آتی ہے تو نذر ہی کے بہانے پیسہ دیتا

کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (تجب سے) فرمایا۔ ”سبحان اللہ! اس عورت نے عضاء کو کیا برا بدلہ دیا (یعنی عضاء نے تو اس کی جان بچائی اور وہ عضاء کی جان لیتا چاہتی ہے۔) جو نذر گناہ کے لیے کی جائے وہ پوری نہ کی جائے اور نہ وہ نذر پوری کی جائے جس کا انسان مالک نہیں۔“

نذر کا کفارہ

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”کہ نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔“ (یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو لباس پہنانا یا غلام آزاد کرنا۔ اگر ان کاموں کی طاقت نہ ہو تو پھر تین دن کے روزے رکھنا)

قسم کے مسائل

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ تم کو باپ دادا کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ”اللہ کی قسم میں نے باپ دادا کی قسم اس وقت سے نہیں کھائی جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہنا ہے، نہ اپنی طرف سے نہ دوسرے کی طرف سے۔“

اللہ کے سوا قسم

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص قسم کھاتا چاہے وہ کوئی قسم نہ کھائے سوائے اللہ کی قسم کے۔“

اور قریش اپنے باپ دادا کی قسم کھایا کرتے

تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

”اپنے باپ داداؤں کی قسم مت کھاؤ۔“

طاغوت (بت وغیرہ اور جھوٹے معبودوں

کی قسم کی ممانعت)

سیدنا عبد الرحمن بن سرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”مت قسم کھاؤ بتوں کی اور نہ اپنے باپ داداؤں کی۔“

بتوں کی قسم

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص تم میں سے لات اور عزی (نامی بتوں) کی قسم کھائے تو وہ کہے کہ لا الہ الا اللہ اور جو کوئی کسی دوسرے سے کہے۔ آؤ جو اٹھیلیں تو وہ صدقہ دے۔“

قسم میں ان شاء اللہ کہنا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کے نبی سلیمان بن داؤد علیہ السلام نے کہا کہ میں اس رات کو ستر عورتوں کے پاس ہواؤں گا (ایک روایت میں نوے ہیں، ایک میں ستانوے اور ایک میں سو) ہر ایک ان میں سے ایک لڑکا بنے گی جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا۔“

ان کے ساتھی یا فرشتے نے کہا۔ ”کہو ان شاء اللہ تعالیٰ۔“

لیکن انہوں نے نہیں کہا، وہ بھول گئے۔ پھر

کسی عورت نے بچہ نہ جنا سوائے ایک کے، (تو وہ بھی آدھا بچہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر وہ ان شاء اللہ کہتے تو ان کی بات نہ جاتی اور ان کا مطلب پورا ہو جاتا۔“

قسم کا مطلب

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”قسم کا مطلب قسم کھانے والے کی نیت کے موافق ہو۔“

غلط قسم کھانا

سیدنا ابوامامہ (یعنی حارثی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جو شخص مسلمان کا حق (مال ہو یا غیر مال جیسے مردے کی کھال، گوبر وغیرہ اور قسم کے حقوق جیسے حق شفعہ حق شرپ، حد قذف، بیوی کے پاس رہنے کی باری) مار لے قسم کھا کر تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا۔“

ایک شخص بولا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر وہ ذرا سی چیز ہو؟“
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اگر چہ پیلو کی ایک ٹہنی ہو۔“

جھوٹی قسم کھانا

”سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضر موت سے ایک شخص اور کندہ کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ حضر موت والے نے کہا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس شخص نے میری زمین دہالی ہے جو میرے باپ کی تھی۔“
کندہ والے نے کہا۔ ”وہ میری زمین ہے، میرے قبیلہ میں ہے۔ میں اس میں کھیتی کرتا ہوں اس کا پتہ حق نہیں ہے۔“

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضر

موت والے سے فرمایا۔ ”تیرے پاس گواہ ہیں؟“ وہ بولا کہ ”نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”تو پھر اس سے قسم لے۔“

وہ بولا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو قاجر ہے۔ قسم کھانے میں اس کو ڈر نہیں اور وہ کی بات کی پروا نہیں کرتا، وہ قسم کھا سکتا ہے۔“

پھر وہ قسم کھانے چلا۔ جب اس نے پیٹھ موڑی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”دیکھو اگر اس نے دوسرے کا مال ناحق اٹھا لینے کو قسم کھائی تو وہ اللہ سے ملے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے منہ پھیر لے گا۔“

قسم کا کفارہ

”سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس چند اشعریوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سواری مانگنے کے لیے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کی قسم! میں تم کو سواری نہیں دوں گا اور میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے جو تمہیں دوں۔“

پھر ہم ٹھہرے رہے جتنی دیر کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اونٹ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سفید کوہان کے تین اونٹ دینے کا حکم کیا۔

جب ہم چلے تو ہم نے یا بعضوں نے کہا۔

”اللہ تعالیٰ ہمیں برکت نہ دے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور سواری مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم کھائی کہ ہمیں سواری نہ ملے گی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سواری دی۔“

لوگوں نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

وہ بولا کہ ”نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

خرچ کرلو) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ لٰن تالوا لبر حتی تعلقو مما تحبون۔

غور سے سنو! یہ اونٹ مجھے اپنے مال میں سے بہت اچھا لگتا ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ میں اسے اپنے (کام آنے کے لیے) آگے (آخرت میں) بھیج دوں۔

(اخرجہ ابو نعیم فی الحلیۃ ۱/۱۶۳)

ہبہ واپس لینے کی کراہیت

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

روایت ہے، بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اپنے بے کو واپس لیتا ہے وہ اس کتے کی طرح ہے جو تے کر کے اپنی تے کو چاٹتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے: ”اس شخص کی مثال جو اپنا صدقہ واپس لیتا ہے، اس کتے کی طرح جو تے کرتا ہے، پھر اپنی تے میں لوٹتا اور اسے چاٹتا ہے۔“ ایک اور روایت میں ہے: ”اپنے بے کو واپس لینے والا اپنی تے میں لوٹنے والے کی طرح ہے۔“

اس کی شناعیت و قباحیت اس سے واضح ہے کہ ایک تو ایسے شخص کو جو ہبہ واپس لیتا ہے، کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور دوسرے، موہوب چیز کو تے سے تعبیر کیا جس سے انسان سخت کراہیت محسوس کرتا ہے۔ تاہم علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم انجی آدمی کے لیے ہے۔ اگر انسان اپنی اولاد یا پوتوں پر پوتوں کو کوئی چیز ہبہ کرے تو اسے واپس لینے کا یہ حکم نہیں ہے، اس کا واپس لینا اس کے لیے جائز ہے۔



”میں نے جنہیں سوار نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے سوار کیا اور میں تو اگر اللہ چاہے تو کسی بات کی قسم نہ کھاؤں گا مگر پھر اس سے بہتر دوسرا کام دیکھوں گا تو اپنی قسم کا کفارہ دوں گا اور وہ کام کروں گا جو بہتر ہے۔“

غلط قسم کھانا

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس دیر ہو گئی پھر وہ اپنے گھر گیا تو بچوں کو دیکھا کہ وہ سو گئے ہیں اس کی عورت کھانا لائی تو اس نے قسم کھائی۔ ”میں اپنے بچوں کی وجہ سے نہ کھاؤں گا۔“ پھر اس کو کھانا مناسب معلوم ہوا اور اس نے کھالیا۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا تو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو شخص کسی بات کی قسم کھائے لیکن پھر دوسری بات اس سے بہتر سمجھے تو وہ کرے اور قسم کا کفارہ دے۔“

مال کے شریک

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ ”ہر مال میں تین شریک ہوتے ہیں۔ ایک تو تقدیر ہے جو مال کے ضائع ہونے اور جانوروں کے مرجانے کی صورت میں تیرا مال لے جاتی ہے اور تجھ سے پوچھتی بھی نہیں ہے کہ وہ تیرا عمدہ مال لے جائے یا کھلیا۔“

دوسرا شریک وارث ہے جو اس کا انتظار کر رہا ہے کہ تو (قبر میں) سر رکھے۔ یعنی تو مرجائے اور وہ تیرا مال لے جائے۔ وہ تیرا مال بھی لے جائے گا اور تو اس کی نگاہ میں برا بھی ہوگا اور تیرا شریک تو خود ہے۔

لہذا تم اس بات کی پوری کوشش کرو کہ تم ان تینوں شریکوں میں سے سب سے کمزور شریک نہ بنو۔ (یعنی تم ان دونوں سے زیادہ مال اللہ کے راستہ میں

قصہ آجروان کا

الشاج

کنوارے کا "میں دل خوش خان کا احوال۔

☆☆☆

لاہور سے اس قسم کی خبریں بھی آئی ہیں کہ اگرچہ چوک پر ٹریفک کی چھتری کے نیچے کوئی ایسی سائیکل کھڑی کر دی گئی کہ تک سب سے درست کچھ طریقہ داری بھی رکھتی ہو تو بعض موٹروں والے اس چھتری کا طواف شروع کر دیتے ہیں۔ برائے وہیں گھوم رہے ہیں، سنا ہے ان کو نظر بد سے بچانے کے لیے یہ بھی کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی مرد کا ٹشیل بھی رہے جو لوگوں کو بٹو بچو کرتا رہے، چونکہ بعض مرد کا ٹشیل وہ بھی طرح دار ہوتے ہیں، اس لیے اس جوڑے پر اور سختی کو متعین کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے گی یوں ٹریفک کا مسئلہ حل ہونہ ہو، لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ، بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

ان ہی دنوں خبر آئی کہ برٹش باردوت نے پکڑا، برٹش باردوت کو سب ہی جانتے ہیں، قاتل ہے، یہ خبر فرانس کی ہے اور راوی یوں بیان کرتا ہے مس باردوت نے ایک شخص کو جھٹ پر فرار ہوتے کر سختی سے ڈانٹا، اس شخص نے حکم کی تعمیل کی اور اس خواب گاہ سے چرائی ہوئی رقم اور زیور اس کے حوالہ کر دیے، مس باردوت کو چاہیے تھا کہ چور کی اس خود قربان ہو جاتیں یعنی اپنے گھر سے خود ہی جاتیں لیکن انہوں نے پولیس کو نوں کر دیا اور انہوں اس نامعلوم شخص کو آکر گرفتار کر لیا۔ مس باردوت تعلق فلموں سے ہے۔ ان کو چور بھی ملے گا، وہ کہ بے چارہ پہلے ہی موصوف کی زلف مرہ کیر کا ہو چکا تھا۔ پولیس کی گرفتاری کو قدر سمجھتا چاہیے عام زندگی میں لوگ ایسے سیدھے نہیں ہوتے، روکے یا لکارے تو چاقو یا پستول سے جواب دیتے

لاہور میں زمانہ پولیس کے ٹریفک سنبھالنے کی خبریں کراچی پہنچی ہیں اور منو بھائی کے کالم کے باوجود بہت سے لوگ لاہور جانے اور اپنا چالان کرانے کے لیے برتول رہے ہیں، بلکہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ کراچی میں بھی ایسا ہی کیا جائے تاکہ لوگوں کو چالان کرانے اور مار کھانے کے لیے دور کا سفر نہ اختیار کرنا پڑے، لاہور کے اخباروں میں یہ آیا ہے کہ جہاں زمانہ پولیس کو ٹریفک کنٹرول کے لیے متعین کیا گیا، وہیں ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ تماشا کی جھوم کر آئے، ٹھٹھک گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ یہاں اس ٹریفک کنٹرول کرنا جانتی ہوں گی اور کر تیں گی لیکن ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے۔

آب رواں کے اندر چھلی بنائی تو نے
چھلی کے تیرنے کو آب رواں بتایا
ٹریفک کنٹرول کرنا بلکہ کسی طرح کا بھی کنٹرول عورتوں کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ یہ تو سڑک کی آمدورفت ہے، اس دنیاے رنگ و بو میں، کوئی ان کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا، اسی لیے جب نیستی سے ہستی کے راستے پر کنٹرول کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے لیے منصوبہ بندی کے جھگے بنتے ہیں تو عورتوں ہی سے پہل کی جاتی ہے کہ کسی کو آنے نہ دیں، بہت رعایت کی تو ایک یادو کا کوٹہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی قطرہ قطرہ بہت ہو جاتے ہیں، رات کو دیر سے گھر آنے والے بہت سے صاحبان بھی خواتین کی ٹریفک کنٹرول کرنے کی صلاحیتوں کا تجربہ رکھتے ہوں گے۔ بعض تو دروازے پر لالہ بتی دیکھ کر دیوار پھاندا مستحسن سمجھتے ہیں یا اپنے ساتھ کسی نوچ کر کوڑھتے ہیں تاکہ بلیں یا مہماؤ کا پہلا وار اسی پر ہو، تفصیل کے لیے دیکھیے۔ ہماری کتاب "قصہ ایک



ہیں۔ پولیس کو ٹیلی فون کرنے کی اجازت تو جہاں تک ہمارا خیال ہے کوئی بھی نہیں دیتا۔ ہمیں تو یہ سارا افسانہ لگتا ہے، اک ذرا پلاٹ اس میں کمزور ہے۔

☆☆☆☆

چوری کے ساتھ کوئی اور قافیہ باندھتے منو بھائی سے ڈر لگتا ہے لیکن بندہ بشر ہے۔ فوجی وردی ہی میں کیوں نہ ہو، ہمیں ڈر ہے، یہ بیبیاں کہیں سراج ہی کو لال جتی نہ دکھانا شروع کر دیں اور یہ منظر نہ ہو کہ سراج تو آ کر لال جتی پر ٹھٹک گیا اور انہوں نے ہری جتی کے رخ سڑک پار بھی کر لی اور کسی راہ گیر کا ہاتھ پکڑے پکڑے قاصی کے ہاں راضی ہونے پہنچ گئیں، جن لوگوں نے لاہور میں زمانہ پولیس کا ڈول ڈالا ہے۔ انہوں نے شاید گس کے باغ میں جانے اور پروانے کا خون ناحق ہونے کا قصہ نہیں سنا، بس اتنا دیکھا کہ جہاں کسی لیڈی کا ٹیبل نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ ٹھہرو، وہاں دس آدمی ٹھہر گئے بلکہ پوچھنے لگے کہ حترمہ! آگے کیا حکم ہے۔ کھڑے رہیں یا چلے جائیں، اس کا باعث قانون کے احترام کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆

گھر آئے چور کو پولیس کے حوالے کرنے کی بات ہمیں پسند نہیں آتی، ویسے جو چاہے برٹی بارود کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ اس چور سے ہمیں ادھنری کے ایک قصہ کا چور یاد آیا جو ایک شخص کے

ہاں چوری کرنے گیا تھا، پستول دکھا کر کہنے لگا۔

”ہاتھ کھڑے کر دو۔“

اس شخص نے ایک ہاتھ کھڑا کیا، چور نے کہا۔

”دوسرا بھی۔“

اس شخص نے معذرت کی کہ گھٹیا ہے، اس ہاتھ کو میں جنبش نہیں دے سکتا، چور نے پوچھا۔

”درم بھی ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ پہلے تھا، اب نہیں ہے، اس پر مکالمہ بازی شروع ہو گئی۔

”کوڑیا لے سانپ کا تیل استعمال کیا؟“

”بہت کیا۔“

”بقراطی گولیاں استعمال کیں؟“

”پانچ مہینے متواتر، ان کے علاوہ لبوب کبیر معجون فلاسفہ اور اطریفل جالینوس بھی استعمال کر دیکھے، حتیٰ کہ لعوق خراسانی بھی کھاتا ہوں۔“

اب چور اپنا کام تو بھول گیا، مشورے دینے لگا اور بولا۔

”پھر تو ایک ہی دوا ہے، شراب کے دو گھونٹ جو کام کرتے ہیں، وہ ان تیلوں اور بخونوں کے بس کی بات نہیں۔ چلو ذرا کپڑے پہنو، باہر کوئی شراب خانہ کھلا ہو تو دو گھونٹ پی آئیں، تکلف مت کرو، پیسے میرے پاس ہیں۔“

☆☆



سنیلا سکندر ہذا عمار مسعود

شاہین رشید

سنیلا سکندر کا ایک تعارف تو یہ ہے وہ کافی عرصہ میڈیا سے وابستہ رہ چکی ہیں۔ اب فری لانس صحافی ہیں۔ اخبارات میں کالم بھی لکھتی ہیں اور مختلف این جی اوز کے ساتھ میڈیا کنسلٹنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔

سنیلا کا دوسرا تعارف یہ ہے کہ وہ مشہور صحافی، کالم نگار، افسانہ نگار اور ٹی وی پروگرام رات گئے کے میزبان عمار مسعود کی شریک حیات اور مشہور و مقبول شاعرانہ اور مسعود کی بہو ہیں۔

عمار مسعود کا شمار ان صحافیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ہمیشہ کسی فائدے یا لالچ کے بغیر اپنے ضمیر کی آواز پر لکھا اور بولے۔ وہ دلائل کے ساتھ موثر اور خوب صورت انداز میں اپنی بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ٹی وی پر ان کے تجزیے، ان کے متوازن اور سنجیدہ ہوئے ذہن کے عکاس ہیں۔ بلاشبہ انہیں الفاظ کے استعمال پر قدرت حاصل ہے۔ انتہائی غصہ اور اشتعال دلانے والی کیفیت میں بھی عمار مسعود غیر

مہذب الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ عمار مسعود کی شخصیت کا ایک پہلو ادب انہیں وراثت میں ملا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ”محبت کا نیلا رنگ“ شائع ہو چکا ہے۔ عمار مسعود کے افسانوں میں بھی وہی اثر افسانہ سوز و گداز، سادگی و پرکاری اور محبت و غلوں آتا ہے جو ان کی شخصیت اور مزاج کا حصہ ہے۔ انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز ڈگری لینے والی سنیلا سکندر نے اپنے کیریئر کا آغاز طلعت حسین ساتھ کیا۔ بہت سے چینلوں میں ان کے ساتھ کیا۔ مگر شادی کے بعد میڈیا کو خدا حافظ صحافت کی فیلڈ میں آ گئیں۔

سنیلا سکندر آج ہماری مہمان ہیں۔ ہم انہیں منون ہیں کہ انہوں نے اپنی بے شمار معروضات سے ہمارے قارئین کے لیے وقت نکالا۔

”کیسے مزاج ہیں؟“

”الحمد للہ آپ بتائیں۔“

”جی اللہ کا شکر ہے..... مجھے خوشی ہے کہ میں آج

ایک معروف اور باصلاحیت فیملی کی ایک ذہین اور معروف شخصیت کا انٹرویو کر رہی ہوں۔ میں چاہوں گی کہ آپ اپنا فیملی بیک گراؤ بتائیں؟“

”جی..... بنیادی طور پر ہم ”پنجابی“ ہیں۔

والدین کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بھی لاہور میں ہی پیدا ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی لاہور سے ہی حاصل کی۔ میرے والد ”ایف فورس“ میں تھے۔ آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ جبکہ والدہ گھریلو خاتون ہیں۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ دو بہنیں اور دو بھائی۔

بڑے بھائی عدنان ہیں جنہوں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ماسٹرز کیا ہے اور آج کل ایک سرکاری

ادارے میں جاب کر رہے ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔

بہن مریم نے آرٹس میں ماسٹرز کیا ہے۔ شادی شدہ

ہے۔ ماشاء اللہ سے دو بچے ہیں۔ وہ اور اس کے

میاں پی ٹی وی سے وابستہ ہیں۔ اور ایک چھوٹا بھائی

عمران ہے جو کہ ٹیلی کام انجینئر ہے اور ”ہم نیوز“ کے

ساتھ وابستہ ہے۔ میں نے پشاور یونیورسٹی سے

انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا ہے۔“

”عمار صاحب کے بارے میں بھی کچھ

بتائیے۔“

”جی..... عمار صاحب کے پانچ بہن بھائی

ہیں۔ بڑے بھائی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ ان کی بیگم

امجد اسلام امجد کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی بڑی بہن

فاری کی پروفیسر ہیں۔ چھوٹی بہن بزنس وومن ہیں۔

چھوٹا بھائی سرکاری ادارے سے وابستہ ہے۔ ان کے

والد انور مسعود کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی

والدہ صدیقہ نور کالج میں اردو اور فارسی کی پروفیسر

رہی ہیں، ریٹائرمنٹ کے بعد اب گھر پر خواتین کو

قرآن ترتیل کے ساتھ پڑھا رہی ہیں اور اب تو میں

بھی ان سے پڑھتی اور سیکھتی ہوں۔ مطلب اصلاح

لیتی ہوں۔“

”شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا اور بچے؟“

”اس سال نومبر میں ہماری شادی کو چار سال

ہو جائیں گے۔ ہمارے ابھی تک بچے نہیں ہوئے۔

عمار کی پہلی بیوی سے بھی اولاد نہیں ہے۔“

”عمار صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں

اور کس حوالے سے ہوئی؟“

”پہلی ملاقات دنیا نیوز کی طرف سے دیے گئے

ایک افطار ڈنر میں ہوئی۔ عمار چونکہ میری بہن کو

جانتے تھے تو انہوں نے ہی تعارف کروایا۔ ہماری

ارنج میرج تھی۔ میرا عمار سے ایک دو ملاقاتوں کے

بعد کوئی رابطہ نہیں رہا اور دلچسپ بات تو یہ کہ وہ پہلی

ملاقات جو افطار ڈنر میں ہوئی تھی، وہ عمار کو یاد ہی نہیں

تھی۔

دراصل میری بہن کی عمار سے کافی پرانی جان

پہچان تھی۔ تو ایک تقریب میں عمار نے اپنی بہن مینا کو

میری بہن سے ملوایا۔ مینا کو مریم اچھی لگی۔ وہاں انہیں

میرے بارے میں پتا چلا تو ایک دن اپنی امی کے

ساتھ مینا ہمارے گھر آئیں کہ ہم ملنے آئے ہیں اور

واپس جانے کے ایک گھنٹہ بعد ہی میری امی کو فون

کر کے رشتے کی بات کی۔ بس یوں سمجھیں کہ چٹ

مٹگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔ ایک ماہ کے اندر

ہماری شادی ہو گئی۔“

”آپ عمار صاحب کی سکیڈٹ وائف بن کے

آئیں۔ تو دل میں کچھ خدشات تھے؟ اور سسرال

والوں کو کیسا پایا؟“

”آپ پہلی بیوی بن کے آئیں یا دوسری،

خدشات تو ہر شادی ہونے والی لڑکی کے دل میں

ہوتے ہی ہیں۔ عمار کی پہلی بیوی صائمہ بہت اچھی

خاتون تھیں۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ سب ان

سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک جذباتی وابستگی تھی۔

لیکن مجھے بھی سب نے پیار، عزت و احترام دیا۔ مجھے

کسی بھی لمحے کسی نے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں

ان کی جگہ آئی ہوں اور ان کی جگہ نہیں لے سکتی۔ ایسا

بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور میری ساس تو بہت جگہوں پر بر ملا کہتی ہیں کہ یہ میری ”جیتی بہو“ ہے۔ میری ساس میری ہر کاوش کو سراہتی ہیں اور بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ عمار تو اکثر چڑ کر کہتے ہیں کہ آپ میری ماں ہیں یا شہیلا کی۔ تو وہ فوراً کہتی ہیں کہ ”شہیلا کی“۔

”عمار صاحب سے شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟“ اور زندگی کون سی اچھی ہے، شادی سے پہلے والی یاد کی؟“

”اگر میں اپنی شخصیت کی بات کروں تو شادی کے بعد کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میری کسی روٹین کو عمار نے ڈسٹرب نہیں کیا اور نہ ہی اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ ہاں ایک ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا ہے کہ گھر چلانا ہے اور سارے معاملات دیکھنے ہیں۔“

شادی سے پہلے گھر کے سارے معاملات امی ہینڈل کرتی تھیں۔ مگر اب یہ گھر میرا ہے اور مجھے ہی سنبھالنا ہے۔ سسرالی رشتے نبھانا۔ ان کی خوشی غمی میں شریک ہونا..... آپ کی طبیعت کیسی تھی کیوں نہ ہو۔ مہمان گھر آرہے ہیں تو منع نہیں کرتا۔ یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جو شادی کے بعد نبھانی پڑتی ہیں۔ لائف دونوں اچھی ہیں۔ شادی سے پہلے کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی اور شادی کے بعد کی لائف میں صبر اور تحمل کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھانا..... میں نے دونوں ادوار انجوائے کیے۔ شادی ایک جوا ہے جو ضرور کھیلنا چاہیے۔“

”عورت گھر کو ہناتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی ہے۔ آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟“

”گھر بنانے اور بگاڑنے میں دونوں فریقین شامل ہوتے ہیں لیکن عورت کو کپڑے زیادہ کرتا پڑتا ہے۔ گھر بنانا مشکل اور بگاڑنا بہت آسان ہے۔ کسی بھی چھوٹی بات کو ایڈجسٹ کر لیا کیونکہ تو جتنی چیزیں نود بخود بکڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر فیصلے جذبات سے نہیں عقل سے کیے جائیں تو گھر بجتے ہی ہیں، بکڑنے

کوئی معاملہ میرے ساتھ نہیں ہوا۔ عمار کے بھانجے بھانجیاں، صائمہ کے بہت قریب تھے۔ وہ ہماری شادی سے پہلے کہتے تھے کہ ماموں کی شادی ہو بھی گئی تو ہماری ممانی صرف صائمہ ہی رہیں گی۔ ہم کسی اور

کو قبول نہیں کریں گے۔ لیکن آج سب بچے مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میری بڑی نند کی بچیاں میری بہت اچھی فرینڈ بن چکی ہیں۔“

”عمار صاحب کی پہلی بیگم ”بیسارت“ سے محروم تھیں اور عمار صاحب کے دل میں تھیں۔ آپ کو ان کے دل میں گھر کرنے میں کتنا عرصہ لگا؟“

”میں بالکل بھی اس ارادے یا سوچ کے ساتھ نہیں آئی تھی کہ مجھے ان کی یادوں کو کھرچ کر اپنی یادیں بھرنی ہیں۔ ہر انسان کا آپ کی زندگی میں ایک مقام ہوتا ہے۔ جو کسی کے آنے جانے سے کم نہیں ہوتا..... مجھے عمار کے دل میں جگہ بنانے میں وقت نہیں لگا۔ کیونکہ میں نے اپنی جگہ خود بنائی۔“

کسی کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے کبھی بھی کسی بھی لئے صائمہ سے جیسی محسوس نہیں ہوئی۔ مجھے کبھی بھی یہ نہیں لگتا جب کوئی ان کا ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ سب نے مجھے میرا مقام دیا ہوا ہے۔ عمار نے بھی میرا موازنہ صائمہ سے نہیں کیا۔ کبھی مجھے یہ نہیں کہا کہ اس میں یہ خوبی تھی اور تم میں یہ خامی ہے۔

مجھے عمار نے بہت عزت، بہت احترام اور بہت محبت دی ہے۔ صائمہ عمار کی زندگی کی ایک حقیقت تھیں جس کو ہٹایا نہیں جاسکتا۔ مجھے اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے کوئی تک و دو نہیں کرنا پڑی.....“

”شادی سادگی سے ہوئی یا دھوم دھام سے؟“

”نہیں امی، شادی بالکل سادگی سے ہوئی تھی۔ منہدی، بارات، ولید، سب فنکشنز ہوئے تھے۔ سب ریمیں ہوئی تھیں۔ کافی دھوم دھام سے سب فنکشنز ہوئے تھے۔ میرا اسرال ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ میرے ساس سرگرم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ عمار کے بہن بھائی اور بھابھیاں سب اچھے

نہیں۔

”آپ دونوں جاب کرتے ہیں تو پھر گھر کون سنبھالے گا؟ کیا جوائنٹ فیمیلی سسٹم ہے۔“
 ”نہیں، ہمارا جوائنٹ فیمیلی سسٹم نہیں ہے۔ میں اور عمار علیحدہ رہتے ہیں۔ امی، ابو عمار کے چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتے ہیں۔ میری جاب کی نوعیت ایسی نہیں کہ مجھے روزانہ گھر سے جانا پڑے جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں زیادہ تر ”فری لانس“ کام کرتی ہوں یا پھر عمار کے میڈیا پروجیکٹس میں ان کی مدد کر دیتی ہوں اور یہ ساری چیزیں گھر سے بھی منجے ہو جاتی ہیں۔ اس لیے گھر میں ہی سنبھالتی ہوں۔“
 ”اگر عمار صاحب آپ کی ساری سرگرمیاں ختم کر دیں اور کہیں کہ صرف گھریلو ذمہ داریاں نبھائیں تو کیا ایسا کرنا آپ کے لیے ممکن ہوگا؟“

”عمار کبھی مجھی ایسا حکم نہیں دیں گے۔ عمار شخصی آزادی پر یقین رکھنے والے انسان ہیں۔ انہوں نے آج تک مجھے کسی بات، کسی کام سے نہیں روکا۔ شادی کے بعد میڈیا کی جاب میں نے اپنی مرضی سے چھوڑی۔ اور آج اگر میں دوبارہ میڈیا جوائن کر لوں تو عمار خوش ہوں گے۔ انہوں نے مجھ پر کبھی بھی کسی چیز کا پریشر نہیں ڈالا۔ اور اگر انہوں نے ایسا کوئی حکم دیا تو میں قبول کر لوں گی کیونکہ اس کی یقیناً کوئی بڑی وجہ ہوگی کہ عمار مجھے کسی کام سے روکیں۔ ورنہ عمار ان لوگوں میں سے نہیں جو بلا وجہ کی پابندیاں لگاتے رہیں۔“

”عمار صاحب مزاج کے لیے ہیں؟ اور آپ مزاج کی کیسی ہیں؟“

”عمار بہت ہنس مکھ ہیں یہ جو آپ ٹی وی پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ سیاسی تجزیے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عام زندگی میں اس سے مختلف ہنسنے ہنسانے والے انسان ہیں۔ عمار اپنے بھانجے بھانجیوں کے پسندیدہ ماموں اور بھتیجیوں کے پسندیدہ چاچو ہیں۔ نیچے ان کی کہنی بہت انجوائے کرتے ہیں۔ مگر سنجیدہ



مفکروں میں ان سے زیادہ سنجیدہ انسان بھی کوئی نہیں ہوتا۔ غصے کے تیز ہیں مگر کبھی کبھار ہی غصہ آتا ہے اور اتر بھی جلدی جاتا ہے جبکہ عمار کے مقابلے میں مجھے غصہ آتا بھی جلدی ہے اور میں غصے کی تیز بھی ہوں۔“
 ”آپ کی اپنی ایک پہچان ہے لیکن آپ عمار صاحب اور انور مسعود صاحب کی وجہ سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ کس پہچان پر زیادہ فخر ہوتا ہے یا اچھا لگتا ہے؟“

”ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اپنی ایک انفرادی پہچان ہو۔ مجھے اچھا لگتا ہے کہ جب لوگ میرے کالم پڑھ کر یا میرے کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے میری تعریف کرتے ہیں۔ لیکن مجھے عمار اور انور ابو کے حوالے سے پہچان بھی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس وقت بہت اچھا لگتا ہے جب لوگ رشک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کے لیے کتنے اعزاز کی بات ہے کہ آپ انور مسعود کی بہو ہیں۔ تو ابو کی طرف سے ملنے والی شہرت کو میں انجوائے کرتی

”گھر کا بھٹ کون بناتا ہے؟ عموماً بیوی اپنی کمائی گھر کے خرچ نہیں کرتی کہ یہ شوہر کی ذمہ داری ہے۔“

آپ کی طرف کیا صورت حال ہے؟“

”گھر کا بھٹ بنانے کی کوشش تو بہت کرتے ہیں۔ مگر بھٹ بھی بنائیں۔ خرچ کے معاملے میں ہم نے بھی ”تیری میری“ نہیں کی۔ میں جو کمائی ہوں، وہ میرے اور عمار کے جوائنٹ اکاؤنٹ میں جاتا ہے

لیکن گھرانے کے پیسوں سے چلتا ہے اور مجھے جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے، میں ان سے مانگ لیتی ہوں۔“

”میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہے کہ مل میں لڑائی اور مل میں صلح۔ آپ دونوں کی لڑائی میں صلح کون کرتا ہے یعنی کون پہل کرتا ہے؟“

”ہماری لڑائی بڑی معمولی نوعیت کی ہوتی ہے کسی بڑے ایٹھ پر بھی لڑائی نہیں ہوتی۔ بس لڑائی عموماً اس بات پر ہوتی ہے کہ زیادہ سگریٹ نہ پیئیں۔ انہیں یورک ایسڈ کا ایٹھ ہے تو میں گوشت کم کھانے کا کہتی ہوں۔ عمار کو یہ مسئلہ رہتا ہے کہ تم بہت کم کھاتی ہو۔ وقت پر نہیں کھاتیں۔ ناشتہ بہت لیٹ کرتی ہو بس چھوٹی موٹی لوک جو تک چلتی رہتی ہے۔ اور منانے میں پہل عمار ہی کرتے ہیں۔ ویسے بھی زندگی کا مزہ تو لیتا ہے کہ شوہر ہی منائے اور ناز اٹھائے۔“

”فارغ اوقات میں آپ دونوں کا موضوع گفتگو کیا ہوتا ہے؟“

”ویسے مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہم میاں بیوی کم اور سیاسی تجزیہ نگار زیادہ ہیں۔ ہم ملکی حالات اور ملک کی سیاست پر فیہات کرتے ہیں۔ ہماری بحث بھی خاندان، اور خاندانی سیاست کے گرد نہیں گھومتی۔ کبھی جب فراغت زیادہ ہو تو پھر لیوچ کے بارے میں ضرور منصوبہ بندی کرتے ہیں کہ گھر کیسا بنائیں اور کہاں گھومنے پھرنے ہمارے۔“

”مودی دیکھنے کا شوق ہے یا مطالعہ کا شوق ہے

آپ دونوں کو؟“

”دونوں جنم کے ساتھ ساتھ ملتی جلتی۔ مگر مودی کو پڑھنے سے بغیر سوچیں سکتی اور عمار لازمی حالت کا الگ الگ ہے دیکھتے ہیں لیکن چونکہ دونوں کا مودی میں دیکھتے۔ البتہ پاکستانی مودی ضرور دیکھتے ہیں ایک ساتھ جا کر، وہ بھی اپنے سینما کو پڑھتے کرتے کے لیے۔“

”کسی تقریب میں جانا ہو تو عمار خاص طور پر ہوتا ہونے کا کہتے ہیں یا کہتے ہیں کہ جیسے ملے میں ہوا میں چلی چلو؟“

”عمار کو میں بنی سنوری اچھی لگتی ہوں۔ جب بھی کسی تقریب میں جانا ہو۔ عمار کی خواہش ہوتی ہے کہ میں خوب تیار ہو کر جاؤں، عمار کی خاطر میں ٹیبلٹ شادیوں میں پارلرز سے تیار ہو کر جاتی ہوں۔ وہ عام طور پر میں بہت سادہ رہتی ہوں۔ مجھے زیادہ سنور نے کا شوق نہیں ہے۔ لیکن میاں کی خاطر پڑتا ہے سب کچھ۔“

”عمار صاحب میں ایسی کون سی عادت یا عادت ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو یہ ایک آئیڈیل شوہر ہوتا۔“

”عمار واقعی ایک آئیڈیل شوہر ہیں۔ میں شادی سے ڈرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ پتا نہیں کیا جسم میں ملے گا۔ مجھ پر پابندیاں نہ لگ جائیں۔ فکری حریت ہو، بہت سے خدشات تھے لیکن عمار نے میرا سارے خدشات کو غلط ثابت کر دیا۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ عمار سے اچھے شوہر مجھے مل سکتے تھے۔ عمار نے مجھے عزت، احترام، مل اور محبت کا ہے۔ میں اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہوں۔ میں جب بولتا اور کل کر لکھتی ہوں تو مجھ پتا ہوتا ہے کہ اگر میں دنیا بھی میرے خلاف ہو جائے تو ایک شخص بھی میرے پیچھے کھڑا ہے مجھے حوصلہ دینے کے لیے۔ باقی چھوٹی موٹی باتیں ساتھ دینے کے لیے۔“

”ہاں ہر انسان میں۔ ان کا سگریٹ دیا اور

صبر اپن بھی کبھی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔“
 ”ہمارے معاشرے میں طلاقیں بہت ہونے لگی ہیں۔ اس میں قصور کس کا ہوتا ہے۔ لڑکی لڑکے کا یا ان کے گھر والوں کا؟“

”معاشرے میں طلاق کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ آج کل کے بچے بچوں کا بے صبر اپن اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا ایٹو بن جاتا ہے۔ جب ہماری شادی ہوئی۔ ہماری امی نے ایک ہی نصیحت کی تھی کہ اپنے گھر کے معاملات خود سنبھالنے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی

باتیں لے کر ہماری طرف نہ چلی آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی میرے اور عمار کے معاملات نہ میرے گھر والوں کو پتا ہوتے ہیں نہ عمار کے گھر والوں کو..... ہم اپنے سارے مسائل خود ہی حل کرتے ہیں۔

آج کل کی بچیاں صبح اٹھ کر سب سے پہلے اپنی ماؤں کو فون کر کے ایک ایک بات بتاتی ہیں جس کی وجہ سے بہت سارے مسائل جنم لیتے ہیں۔ دلوں میں رنجشیں بھی بڑھتی ہیں اور نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ میاں بیوی جب ایک دوسرے پر اعتماد کرنا شروع کر دیں گے تو طلاق کا ریشہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔“

”گھریلو معاملات میں کون زیادہ دلچسپی لیتا ہے کہ اس رشتے دار کے یہاں جانا ہے۔ اس کے یہاں نہیں، گفت دینا ہے یا کیش۔ کیسے تعلقات رکھنے ہیں۔“

”یہ سارے معاملات میں ہی ہینڈل کرتی ہوں۔ عمار صرف اپنے بہن بھائیوں کے گھروں میں ہونے والی تقریبات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ باقی ان کے انضیال و دھیال میں ہونے والی تقریبات میں، میں اپنی ساس کے ساتھ ہی شرکت کرتی ہوں..... عمار ان تقریبات سے دور بھاگتے ہیں چونکہ میں نے اپنی امی کو یہ سارے رشتے بھاتے دیکھا تھا اس لیے عمار کی عدم دلچسپی کے باوجود جہاں میری ساس مجھے

چلنے کے لیے کہتی ہیں، میں ضرور ان کے ساتھ جاتی ہوں۔ اسی طرح میری فیملی میں ہونے والی شادی کی تقریبات میں کسی ایک میں عمار شریک بھی ہوتے ہیں۔ باقی فرائض میں ہی نبھاتی ہوں۔ رشتہ داروں سے ملنا ملانا، دنیا دلانا یہ سب میرے ہی کام ہیں..... عمار ان سب چیزوں سے دور بھاگتے ہیں..... لیکن عمار میزبان بہت اچھے ہیں۔ کسی کے گھر نہ جانا پڑے لیکن ہمارے گھر سب آئیں اور کھانا کھائیں اور خوش گویاں کریں۔“

”جن لڑکے لڑکیوں کی شادی نہیں ہوئی، ان سے کچھ کہنا چاہیں گی؟“

”میں یہی کہوں گی کہ شادی ضرور کریں۔ یہ ایک خوبصورت بندھن ہے۔ لیکن اس کو نبھانے کی نیت سے کریں۔ بہن بھائی جو سالوں آپ کے ساتھ ہیں، ان سے بھی اختلافات ہو جاتے ہیں۔ یہ تو پھر آپ کی نئی رشتے داریاں بن رہی ہوتی ہیں۔ سو ایک دوسرے کو وقت دیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اگنور کریں تو زندگی بہت سہل ہو جاتی ہے۔ رشتے بنانے مشکل ہوتے ہیں مگر بگڑتے بہت آسانی سے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کی شخصی آزادی کو تسلیم کر لیں تو مجھے نہیں لگتا کہ اس بندھن کو نبھانے میں کوئی رکاوٹ ہوگی۔“

”اور آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی۔“

”جی..... بالکل..... آخر میں خواتین اور شعاع کا بہت شکریہ۔ میں 1995 سے ان ڈائجسٹوں کی قاری ہوں۔ اس وقت سے آج تک کے تمام شمارے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ لڑکیوں کی کردار سازی میں اس ادارے اور ان میں کام کرنے والے لوگوں اور رائٹرز کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اللہ مزید کامیابیوں سے نوازے (آمین)۔ ڈرامہ انڈسٹری کو بہت سے رائٹرز بھی اسی ادارے کے توسط سے ملے..... ورنہ ڈرامہ انڈسٹری تو ایک جوہر کا شکار تھی۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ہیلنا سکندر سے اجازت چاہی۔



ایاتین انعم تنویر سے

شایین رشید

PakiBooks.Site

- 1۔ "اصلی نام؟"
 - 2۔ "پیار کا نام؟"
 - 3۔ "تاریخ پیدائش؟"
 - 4۔ "قد/ستارہ؟"
 - 5۔ "مادری زبان؟"
 - 6۔ "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"
 - 7۔ "شادی؟"
 - 8۔ "کبھی نہیں ہوئی۔"
 - 9۔ "شوپز میں آؤ؟"
 - 10۔ "گھر والوں کا رد عمل؟"
- "نہیں جی انکھروں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ کام کروں۔"

الحق

میں جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار غلط لکھ کر اپنی غلطی کی ماگنی ہے۔

ایک پرتو از سے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ حجاب کا خیر ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آ گیا ہے۔

ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ نیک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے روشنیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔

قلب مومن انڈسٹری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر، اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔ مومن سلطان ایک باصلاحیت فنکار ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کبھی کبھی نہیں ہے۔ انڈسٹری میں ہیروئین اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔

مومنہ کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہنہ مان ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے انڈسٹری سے آؤٹ ہے۔ مومنہ کی ماں شریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے۔ انڈسٹری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومنہ کے اکلوتے بھائی جہاںگیر کے گردے جواب دے چکے ہیں، وہ ڈائلاکس ہے۔

Pakibooks Site



مردے کے ٹرانسپلانٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومنہ لکھنؤ میں کام نہیں کرتا چاہتی۔ اسے فلم انڈسٹری پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔
 قلب مومنہ نئی فلم بنانے کا اعلان کرتا ہے تو داؤد مومنہ کی سٹارٹ کرتا ہے۔ وہ آڈیشن کے لیے قلب مومنہ کے پاس جاتی ہے تو قلب مومنہ اس کو دوپٹا اتارنے کے لیے کہتا ہے۔ مومنہ الکار کر دیتی ہے تو وہ اسے اسٹوڈیو سے نکل جانے کے لیے کہتا ہے۔
 مومنہ باہر نکل جاتی ہے تو اس کو یاد آتا ہے کہ وہ جہانگیر کی میڈیکل ٹیموں کی فائل اسٹوڈیو میں بھول آئی ہے۔ وہ لوٹ کر جاتی ہے تو قلب مومنہ اس کے ساتھ بہت جھگڑا میزانداز میں پیش آتا ہے جو اب مومنہ بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی اور اسے کمری کمری سنا کر آئینہ دکھا دیتی ہے۔
 وہ کہتی ہے کہ تمہارا کام چپ اور تم اس سے زیادہ چپ ہو، عورت کا جسم دکھا کر جو تم آرٹ کی خدمت کر رہے ہو، میں اس کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔

طہ عبدالعلی اپنے باپ کو خط لکھتا ہے اور اس میں معذرت کے ساتھ اپنی تکلیف بھی بیان کرتا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ وہ طہ کو معاف کریں گے تو علی اللہ اسے معاف کرے گا۔
 قلب مومنہ کو اس کی ماں ایک خط دیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خط اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ خط پڑھنے پر اسے علم ہوتا ہے کہ یہ خط اللہ نے نہیں اس کے دادا عبدالعلی نے لکھا ہے وہ اس سے ملنے آ رہے ہیں۔
 حسن جہاں کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر بھی واپس آ رہا ہے تو وہ خوب جتنی سنورتی ہے اور بے تحاشا خوش ہوتی ہے۔ قلب مومنہ اپنی ماں کو اس طرح دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ اور ماں سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے۔
 مومنہ کو اس کی ماں سمجھاتی ہے کہ اسے عقل کرنی چاہیے مٹی اور یوں الکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جہانگیر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور سہرا بنے گی۔ جبکہ مومنہ اداکارہ نہیں بننا چاہتی۔ اسے خطا ملی سے دلچسپی ہے۔
 مومنہ اپنی انا کو مار کر اپنی دوست سے کہتی ہے کہ وہ ایک بار پھر داؤد سے بات کر لے۔ شاید قلب مومنہ اسے موقع دے دے، جہانگیر کی دن بدن بگڑتی حالت اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ قلب مومنہ سے کام مانگے۔
 جبکہ دوسری جانب مومنہ نیا کو پر دوڑ کر دیتا ہے اور ایک بے حد ہستی انکسٹی اسے پہناتا ہے۔ قلب مومنہ کے گھر ہونے والی ایک اور پارٹی میں پوری انڈسٹری مدعو ہوتی ہے۔ لیکن اچانک ملازم کسی نئے مہمان کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جسے دیکھ کر قلب مومنہ ساکت رہ جاتا ہے۔
 قلب مومنہ اللہ کو خط لکھتا ہے۔

کچھ دن بعد اس سے اس کے دادا ملنے آتے ہیں لیکن باپ نہیں آتا۔ عبدالعلی سے حسن جہاں کو علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر عبدالعلی کے پاس بھی نہیں گیا۔ عبدالعلی قلب مومنہ کے لیے ایک پیٹنگ لے کر آتے ہیں جو ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے۔ کچھ دن بعد مومنہ ان سے نیپا کی ملاقات کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس کی قریبی دوست ہے۔
 مومنہ حالات سے مجبور قلب مومنہ کے پاس جاتی ہے لیکن وہ اسے بے عزت کر کے آفس سے نکال دیتا ہے۔ وہ انتہائی دھمکی اور نفوٹی حالت میں ماسٹر ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں وہ شہید قرآن پاک کی مرمت کا کام کرتے ہیں۔ وہ اسے تسلی دیتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوتی ہے۔
 مومنہ کو اس کی دوست کا فون آتا ہے وہ اسے آڈیشن کے لیے لاہور بھیجتی ہے جہاں اس کا آڈیشن کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے ہالی وڈ کی فلم کے لیے سائن کر لیا جاتا ہے۔
 قلب مومنہ اور نیپا کا جھگڑا ہو جاتا ہے جس کی وجہ ضوٹی ہے۔ مومنہ کراچی واپس آتی ہے تو اسے داؤد کا رویہ عجیب لگتا ہے وہ گھر کے بجائے اسے مردہ خانہ لے آتا ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

تمہارا حال پوچھنا چاہتا ہوں..... پوچھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا۔ تمہارا حال تو جانتا ہوں میں..... اور میں ہی توجہ دیتا ہوں تمہیں اس حال میں لانے کی..... تمہیں کیا لکھوں۔ میری بیٹی کیا لکھوں؟ بہت ساری باتیں ہیں جو تم سے کہنا چاہتا ہوں لیکن لفظ..... لفظ اس کاغذ پر وہ لکھنے سے قاصر ہیں جو میرے دل میں ہے۔ لیکن تمہارا دوبارہ سامنا کرنے سے تمہارے نام یہ خط لکھنا آسان ہے میرے لیے۔

تم سے کیا کہوں.....؟ کہ میں شرمندہ ہوں یا یہ اعتراف کروں تم سے کہ میں گناہ گار ہوں کہ حسن جہاں تمہارا وہ گھماؤ بھر جائے جو میرے ہاتھوں لگا اور تم مجھے معاف کر سکو۔

میں نے اپنی ساری زندگی کیونٹس اور کاغذ پر صرف اللہ کی بڑائی اور صفائی بیان کرتے گزاری ہے۔ روشنائی اور رنگوں سے خطاطی کرتے عمر بسر کی ہے، مگر یہ سمجھ نہیں پایا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرتے کرتے غرور کا وہ کون سا لمحہ تھا جس میں میں خود کو بھی ”بڑا“ مان بیٹھا تھا..... نیک، مٹی، پرہیز گار۔ گناہ نہ کر سکنے والا..... یا نہیں حسن جہاں! میں مومن سے کافر کس وقت ہوا تھا..... لیکن کبھی نہ کبھی کچھ تو ایسا کر بیٹھا تھا میں کہ ٹھوکر کھائی تو اللہ نے سنبھالا نہیں، گرنے دیا..... اور میں گرتا ہی چلا گیا۔

اور اب جب یہ خط لکھنے بیٹھا ہوں تو یہ کاغذ آئینہ بن کر مجھے میرا وہ عکس دکھا رہے ہیں جن سے میں نظریں نہیں ملا سکتا۔

اس عمر میں اکلوتی جوان اولاد کو کھودینے کے بعد میری زندگی کا وہ مخور گم ہو گیا ہے جس کے گرد میری زندگی گھومتی تھی۔ اب کچھ بھی یاد نہیں رہتا مجھے۔ نہ کھانا نہ پینا..... نہ سونا جا گنا..... نہ ہی دنیا کی کوئی اور چیز..... سب کچھ لے گیا ہے میرا..... بس میرا وجود چھوڑ گیا ہے اپنے اس پچھتاوے کے ساتھ جو ہر وقت میرا گلا گھونٹتا رہتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اب اس پچھتاوے کا کروں کیا اور اس وجود کا مصروف کیا رہ گیا ہے۔

وہ خطاطی جو کئی نسلوں سے خون کی طرح ہماری رگوں میں بہتی آئی تھی لٹ کے جانے کے بعد سو کھٹے لگی ہے۔ اب میری اگلی نسلوں میں کوئی اللہ کی کبریائی اور بڑائی بیان کرنے والا نہیں آئے گا۔ یہ میری سزا ہے۔ میرے غرور کی..... میں اس کی شکایت کسی سے نہیں کر سکتا۔

لٹ مٹی ہو گیا..... میں مٹی بھی نہیں ہو سکتا..... اس دنیا سے جانے کی باری میری تھی۔ مہلت اس کو نہیں ملی۔ اس عمر میں جو تم میرے حصے میں آیا ہے، وہ جمیلا نہیں جا رہا۔ یہ جو گھر ہے جس میں میں رہتا ہوں یہاں کی ہر شے، ہر دیوار کے ساتھ اس کی یادیں لپٹی ہیں۔ میں ہر روز صبح اس کی یادوں کو درختوں کی بڑھی ہوئی شاخوں کی طرح کاٹ کر باہر پھینک آتا ہوں۔ وہ رات تک پھر سے اُگ آتی ہیں، پرانی یادوں کی رہ جانے والی جڑوں میں سے..... میں یہ فصل کاٹتے کانٹے چھننے لگا ہوں۔ گھر طے سے خالی ہو گیا اُس کی یادوں سے خالی ہونے کو تیار نہیں۔

وہ تمہارے ساتھ چلا گیا تھا تو اس گھر میں اس کی یادیں اس طرح نہیں اُگتی تھیں۔ میری نفرت اور غصہ ہر اُگنے والی یاد کو کھا جاتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب میرے اندر کچھ بھی نہیں رہا۔ فخر، غرور، آن، غصہ سب ختم ہو گیا..... اگر کچھ بچا ہے تو روشنی کی وہ کرن جو قلب مومن کے نام سے تمہارے گھر کو روشن کیے ہوئے ہے۔ میں ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا ہوں جب اپنے اندر باہر ہر طرف اندھیرا ہو جاتا ہے تو اُس کے چہرے کی روشنی مجھے راستہ دکھانے لگتی ہے۔ کیا اسے اپنا یہ بوڑھا دادا یاد آتا ہے.....؟ مگر میں اُسے کیوں یاد آؤں گا؟ میں نے اُس کو دیا ہی کیا ہے؟ اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے لگاٹ کا بچپن لوٹ آیا وہ بچپن میں قلب مومن جیسا ہی تھا۔ ویسا ہی معصوم چہرہ ویسی ہی میٹھی آواز، ویسے ہی سوال اور شرارتیں..... پر قلب مومن تو شرارتیں نہیں کرتا۔ وہ تو

بس ملے کیا کرتا تھا، قلب مومن تو بس سوال کرتا ہے اور ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں..... اس کا مجرم ہوں میں..... میں نے اُس سے شرارتیں چھین کر یہ سوال تھما دیے۔ میں نے بڑا ظلم کیا۔ میری بیٹی حسن جہاں..... تم مجھے معاف کر دو۔ دل سے معاف کر دو۔ قلب مومن کو میرا بہت پیار دیتا۔ اُس سے کہنا وہ اللہ کو ایک خط اپنے دادا کے لیے بھی لکھے۔ اللہ سے کہے..... اُس کے دادا کا ہنر اُسے واپس کر دے۔ قلب مومن کا ہر خط اللہ کو پہنچ جاتا ہے وہ تمہارا بیٹا ہے نا اس لیے۔

والسلام
قلب مومن کا دادا

☆☆☆

قلب مومن نے اسٹریچر پر لیٹی حسن جہاں کو دیکھا جسے پیرامیڈ کس گھر سے باہر کھڑی ایسبولنس کی طرف لے جا رہے تھے اور پھر اُس نے اپنے دادا کو دیکھا جو بتے آنسوؤں کے ساتھ اُس اسٹریچر کے پیچھے آ رہا تھا۔ قلب مومن اور اُن کی نظریں ملی تھیں اور قلب مومن کے چہرے کا خوف جیسے عبدالعلی کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔ مومن سائیکل سے گرنے کے بعد اپنی چوٹوں کو بھول گیا تھا اور اپنی اُس سائیکل کو بھی جو رستے میں گری پڑی تھی۔ وہ بس ایسبولنس کی طرف بھاگا تھا اور دادا نے اُسے روک لیا تھا۔

”مئی کو کیا ہوا؟ میری مئی کو کیا ہوا؟“ عجیب خوف کے عالم میں اُس نے عبدالعلی سے پوچھا تھا۔
”دعا کرو کچھ نہ ہو۔“ عبدالعلی نے اُسے ساتھ لیٹاتے ہوئے کہا تھا۔
ایسبولنس اب دور جا رہی تھی اور قلب مومن کو عبدالعلی کی ٹانگوں سے لپٹ کر جیسے عجیب سکون کا احساس ہوا تھا وہ کسی چڑیا کے بچے کی طرح کانپ رہا تھا۔ عبدالعلی نے اُسے گود میں اٹھالیا۔ وہاں کھڑے اُس پاس کے گھروں میں رہنے والے لوگ اب وہاں سے آہستہ آہستہ جانے لگے تھے۔ دادا کی گود میں چڑھے قلب مومن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں اس کے لیے ترس کیوں تھا..... وہ اس عمر میں بھی اُس احساس کو پہچان سکتا تھا۔
”مئی کے پاس جاتا ہے۔“ اُسے ایک دم ماں کی یاد دو بارہ آئی تھی اور تب ہی اس نے عبدالعلی کی آنکھوں سے مسلسل بہتے ہوئے آنسو بھی دیکھے تھے۔ وہ شاید اُس کی مئی کے لیے رو رہے تھے۔ قلب مومن نے خود ہی سوچ لیا تھا، اُن آنسوؤں نے قلب مومن کے دل کو جیسے کچھ اور نرم کیا تھا عبدالعلی کے لیے۔
آئی سی یو میں حسن جہاں بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور عبدالعلی کے ساتھ قلب مومن بھی اُسے ششے سے دیکھ کر رُئی طرح بے چین ہوا تھا۔

”مئی کو کیا ہوا ہے دادا؟“ اس نے عبدالعلی کے ہاتھ کو بے تابی سے ہلایا تھا۔ اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے عبدالعلی نے اُس سے کہا۔

”وہ بیمار ہو گئی ہیں۔“ اُسے بتاتے ہوئے ان کی آواز بھر آئی۔
قلب مومن نے اس بار ان آنسوؤں پر غور کیا۔ ”آپ کیوں رو رہے ہیں؟“ اس بار وہ جیسے پوچھے بغیر نہیں رو سکا۔

”مجھ سے ایک گناہ ہو گیا ہے مومن۔“ عبدالعلی کا جیسے حوصلہ جواب دے گیا۔
مومن کو یک دم یاد آیا، اُس کی ماں نے بھی تو کسی گناہ کی بات کی تھی جس کو اُس کے باپ نے معاف نہیں کیا تھا اور اب دادا بھی کسی گناہ کی بات کر رہے تھے۔
”مئی نے کہا تھا، اُن سے بھی کوئی گناہ ہوا تھا۔“ اس نے بے اختیار عبدالعلی سے کہا۔
”نہیں تمہاری مئی نے کوئی گناہ نہیں کیا مومن..... یہ میرے گناہ کی سزا ہے۔“ وہ ہلکے ہلکے گونے لگے تھے۔

قلب مومن کو اس لئے عبد اعلیٰ پر بہت زیادہ ترس آیا۔ اس کا دل چاہا، وہ انہیں اپنے ساتھ لگا کر چلے جیسے وہ اسے تھکتے تھے۔

”اللہ تعالیٰ کیا ہم سب کو سزا دیتے ہیں؟ مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا ہے دادا۔“ عبد اعلیٰ کا ہاتھ دوبارہ تھاتے ہوئے قلب مومن نے جیسے اپنا خوف اُن کی بھولی میں ڈالا۔

”اللہ سزا نہیں دیتا..... ہم سب دیتے ہیں۔“ انہوں نے جیسے اس ننھے بچے کے دل سے اُس خوف کو مٹانے کی کوشش کی۔

”کیا اللہ تعالیٰ ہم سے سزا دینے کو کہتے ہیں؟“

”مومن! مجھ سے وہ سوال مت پوچھو جس کا جواب میرے پاس نہیں۔“ اس نے عبد اعلیٰ کو ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔ آئی سی یو کے ششے سے اُس نے بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی حسن جہاں کو دیکھا۔ قلب مومن کو اُس وقت احساس ہوا اُسے صرف حسن جہاں کی ضرورت تھی بابا کی نہیں وہ اُن کے بغیر رہتا سیکھ چکا تھا..... وہ حسن جہاں کے بغیر رہنا سیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلے دو دن وہ دادا کے ساتھ ہسپتال جاتا رہا اور پھر اُس نے بالآخر حسن جہاں کو آنکھیں کھولتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جنہیں وہ ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا۔ یہ آنکھیں خالی تھیں، اُن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس آٹھ سال کے بچے نے وہ تبدیلی محسوس کی تھی اور بڑی شدت سے کی تھی۔ کچھ ہوا تھا اُس کی ماں کو مگر کیا ہوا تھا۔ یہ وہ جان نہیں بارہا تھا۔

”ننی! آپ ٹھیک ہو گئیں میں نے اتنی دعائیں کی تھیں۔“ اُس نے حسن جہاں سے لپٹ کر جیسے اُس میں وہی گرمی وہی تمازت ڈھونڈنے کی کوشش کی جو ہمیشہ سے وہ اُس کی آغوش میں محسوس کرتا تھا۔ حسن جہاں نے اُسے لپٹا لیا تھا۔ قلب مومن نے اُسے کہتے سنا۔

”میں نے بھی بڑی دعائیں کی تھیں۔ میری تو کوئی دعا قبول نہیں ہوئی.....“

قلب مومن نے حسن جہاں کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر عبد اعلیٰ کی آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اُس نے انہیں ہاتھ جوڑتے۔ حسن جہاں سے کہتے سنا۔

”مجھے معاف کر دو بیٹی، مجھے معاف کر دو۔“ حسن جہاں بڑبڑاتی تھی۔

”آپ کو معاف کر دوں گی..... اپنے آپ کو کیسے کروں گی۔“ وہ کیا پہیلی تھی جو عبد اعلیٰ اور حسن جہاں کی گفتگو میں پنہاں تھی۔ وہ کیا گناہ تھا جو انہیں سزا دے کر گیا تھا اور وہ کیا شے تھی جس سے وہ محروم ہوئے تھے۔ قلب مومن سمجھ نہیں پایا..... سمجھ میں آئی تھی تو صرف ایک بات..... وہ دونوں اب اُس کے باپ کی بات نہیں کرتے تھے اور اُس کو پہلے کی طرح ڈھونڈ بھی نہیں رہے تھے..... مگر قلب مومن اب حسن جہاں سے کوئی ایسی بات نہیں پوچھنا چاہتا تھا جو اُس کی ماں کو رلاتی اور پتا نہیں کیوں اُسے لگتا تھا، وہ یہ سوال کرے گا تو اُس کی ماں روئے گی۔

اللہ کو ایک اور خط لکھنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ قلب مومن کو کوئی جواب اپنی دنیا اور اپنے رشتوں سے نہیں مل رہا تھا۔

”جب غلطیاں ہو جاتی ہیں تو کیا وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتیں اور جب گناہ ہو جائیں تو کیا ہمیشہ اُن کی سزا ملتی ہے..... کیا اللہ معاف نہیں کر سکتا؟“

قلب مومن کو اب اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کرنے تھے کیونکہ وہ اپنے گھر میں دو لوگوں کو تکلیف میں دیکھ رہا تھا اور وہ اُس تکلیف کی جڑ کو کھوجنا چاہتا تھا۔

جنگل میں تنے پر دھرا اس کا لیٹر ہا کس غائب تھا۔ قلب مومن کو چند لمحے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔

دو شاہ کی فلاح تھی۔ آپ کا کیا قرار ہے؟ ہول.....! آخر وہ اسے دلوں کے بعد آیا تھا اس جنگل میں جو کچھ
 بھی راستہ نہیں ہوتا تھا۔ مدد سے کی کیفیت میں وہ اس درخت کے کمرے ہوئے تھے کہ ہاتھ ہاتھ
 بہت سارے دوسرے کمرے ہوئے وہ دلوں پر بھی چڑھ چڑھ کر اپنے لیلر بائس کو دھوکہ دے رہا تھا۔
 بائس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملا تھا۔ بے حد مایوسی کے عالم میں وہ اس دن واپس گھر آیا تھا اور اپنے
 میں جانتے ہی وہ ہلکا ہوا تھا۔ وہ لیلر بائس ایک ایک گھبراہٹ میں پڑا تھا۔ ایک ہی لمبی لمبی سے آواز اٹھائی
 باہر۔ قلاب مومن بے چینی کی کیفیت میں اس لیلر بائس کو دیکھتا رہا۔ نئی نوپسے چا تھا کہ اس نے دو لیلر
 وہاں اس جنگل میں اس درخت پر رکھا تھا اور وہ اس کے اندر بیٹھا تھا..... کیا انہیں یہ بھی چاہتا تھا.....
 اسے مزید سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ دوسرے جہاں کی آواز بھی جس نے اسے چھٹکا پڑا تھا۔

”مومن انہم پاکستان ہمارے ہیں۔“ وہ بے اختیار پلٹا تھا۔ ”جس جہاں کمرے کے دھوکے میں گمراہی تھی۔“
 ”کیوں؟“ وہ جہاں ان ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی ماں کا تعلق پاکستان سے تھا مگر اس کا تو نہیں تھا۔
 ”رہنے کے لیے..... اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ پاکستان میں رہیں گے۔“

محم آواز میں جو اس نے حسن جہاں کی زبان سے سنا اس نے مومن کو دہرایا تھا..... اس کی ماں نے
 وہاں سے کیوں گئی اور جب لے جانا چاہتی تھی، یہ اس کی بیچ میں نہیں آیا تھا۔ وہ مزید سوال کرتا چاہتا تھا مگر وہ
 لٹی تھی۔ وہ جب سے ہاتھل سے آئی تھی، اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ اگر کسی سے بات کرتی تھی تو وہ
 تھے مگر وہ ساری باتیں سرگوشیوں اور آنسوؤں کی زبان میں ہوتیں اور قلاب مومن ان دلوں چنے والے سے بے
 ہو کیا تھا۔ اس پتیلی سے بھی اس کیل سے بھی۔

بدا بدا

ریلے سے اسٹیشن پر انہیں دادا چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اس شہر سے دوسرے شہر ریل سے جاتے پھر وہاں
 سے ہوائی جہاز پر پاکستان چلے جاتے۔ مومن کو یہ سب یاد تھا کیونکہ یہ اسے دادا نے بتایا تھا۔

”آپ ہمارے گھر میں رہیں گے؟“ اس نے دادا سے پوچھا تھا۔
 ”نہیں مومن میں واپس چلا جاؤں گا۔“ عبد اعلیٰ نے جواباً اسے بتایا۔
 ”واپس کہاں؟“ مومن نے کریدا۔

”جہاں سے میں آیا ہوں۔“ اس نے دادا کو محمد آواز میں کہتے سنا۔ وہ ان کا سامان گھر سے باہر رکھ کر
 کوتاہی کر رہے تھے۔ مومن نے حسن جہاں کو دیکھا۔ وہ اس گھر کو نہیں دیکھ رہی تھی، بس اس کی طرف جاتی
 تھی جو ان کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ قلاب مومن نے اس گھر کو چھوڑتے ہوئے عجیب اُداس محسوس کی۔ اسے
 رونا بھی آیا مگر دادا نے اسے اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔

اور اب ریلے سے اسٹیشن پر دادا کو خدا حافظ کہتے ہوئے قلاب مومن کو پھر رونا آیا تھا۔ دادا اب اسے لٹے
 کٹے گئے تھے۔

”دادا! آپ ہمارے ساتھ چلیں۔“ اس نے عبد اعلیٰ کا ہاتھ تھامے ان سے کہا۔
 ”ابھی نہیں جاسکتا..... پھر بھی آؤں گا۔“ اس نے دادا کو کہتے سنا۔

”آپ بابا کو دھوکہ لینا اور ان کو ساتھ لے کر آنا۔“ ان کے گلے لگتے ہوئے قلاب مومن نے ان کے کان
 میں سرگوشی کی۔ اسے ہفتوں کے بعد آج پہلی بار اس نے باپ کا ذکر کیا تھا مگر وہ سمجھ دار تھا اس نے ماں کو اس کی
 خبر نہیں ہونے دی تھی۔ عبد اعلیٰ نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا بس اس کا سر اور ہاتھ چومنا تھا۔ قلاب مومن نے اپنے
 ماتھے پر ان کے آنسوؤں کی لمبی محسوس کی تو اسے ہاتھ سے چھوا۔ لرزین چلنے والی تھی۔ حسن جہاں کے سر پر ہاتھ

رکھتے ہوئے اس کے دادا نے انہیں رخصت کیا تھا۔ قلب مومن نے ان دونوں کے درمیان کسی اور جملے کا تبادلہ نہیں سنا تھا۔ ماں کی انگلی پکڑے ٹرین کے دروازے تک پہنچتے قلب مومن نے پلٹ کر دیکھا۔ اُس کے دادا وہیں کھڑے رو رہے تھے جہاں وہ اُن سے الگ ہوئے تھے۔ اُس نے گردن موڑ کر حسن جہاں کو دیکھا، وہ بھی بے آواز رو رہی تھی۔ قلب مومن کا دل دکھا۔ اُسے یقین تھا وہ دونوں بابا کے لیے رو رہے تھے اگر باہل جاتے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ مگر وہ انہیں ڈھونڈ نہیں سکے تھے۔ اُس نے مایوسی سے سوچا۔

”بابا مل جاتے تو کوئی بھی ایسے نہ روتا۔“ اُسے پاکستان میں ایک بار پھر سے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنا تھی جہاں وہ لیٹر باکس رکھتا اور پھر اُس میں وہ خط ڈالتا جس میں اللہ سے کئے گئے سوال اور فرمائشیں ہوتیں۔

☆☆☆

”یہ ہمارا گھر ہے؟“

قلب مومن نے بے یقینی کے عالم میں اُس وسیع و عریض شان دار بنگلے کے دروازے کو دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا تھا جس کے باہر وہ ٹیکسی سے اتر کر کھڑے تھے اپنے سامان کے ساتھ۔ حسن جہاں نے اُسے دیکھے بغیر سر ہلایا تھا۔ وہ جیسے کسی سوچ میں گم تھی، کوئی ادھیڑ بن کرتے ہوئے۔ قلب مومن اپنی خوشی پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ اتنا بڑا گھر..... وہ تو ولا تھا۔ ترکی سے پاکستان آ جانے کا اُنم یک دم غائب ہو گیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر گیٹ سے پرے نظر آنے والی اُس دو منزلہ شان دار عمارت کو دیکھتا رہا۔ جس کا گیٹ کسی مرد نے کھولا تھا۔

”کون؟“ وہ کوئی ملازم تھا مگر اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ حسن جہاں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس نے بے اختیار گیٹ کھول دیا تھا۔ حسن جہاں سامان چھوڑ کر قلب مومن کا ہاتھ پکڑے کھلے دروازے سے اندر آئی تھی۔

”مئی ہم رچ (امیر) ہو گئے ہیں؟“ قلب مومن نے بے پناہ خوشی کے عالم میں گھر کے اندر کھڑی گاڑیوں اور لان کو دیکھتے ہوئے ماں کے ساتھ چلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ وہ جواب دیے بغیر اُس کی انگلی پکڑے جب چپ چلتی رہی۔

”ہم گاڑی میں بیٹھا کریں گے اب؟“ قلب مومن کو پروا نہیں تھی کہ اُس کے پچھلے سوال کا جواب آیا تھا یا نہیں۔ وہ اُن چمکتی دھنکی گاڑیوں سے مرعوب ہو رہا تھا جن کو اُس نے ٹی وی پر یا ترکی کی سڑکوں پر دیکھا تھا۔

حسن جہاں اب اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے گھر کے اندر لے آئی تھی اور قلب مومن نے پہلی بار اُس گھر کی دیواروں پر جگہ جگہ حسن جہاں کی تصویریں لگی دیکھی تھیں۔ بے حد بھڑکیلے کپڑوں میں میک اپ سے لتھڑے ہوئے چہرے کے ساتھ عجیب عجیب پوز اور پوچھرز میں..... ایک لمحہ کے لیے اُسے لگا وہ اُس کی محبتیں۔ اُس کی مٹی تو بھی ایسے کپڑے نہیں پہنتی تھیں اور اُس تو بھی نہیں کر سکتیں اس طرح۔

”مئی! یہ آپ کی تصویریں ہیں؟“ وہ حسن جہاں سے جیسے تعریفی چاہتا تھا۔ حسن جہاں نے اُس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اُن بہت سارے لوگوں کی طرف متوجہ بھی جولاؤنگ میں بیٹھے تھے اور انہیں دیکھ کر جیسے وہ سب ہکا بکا ہو گئے تھے۔

”اماں..... میں آگئی۔“ قلب مومن نے حسن جہاں کو اُن پانچ چھ لوگوں میں شامل ایک عورت کو مخاطب کرتے دیکھا۔ مومن نے اُن بھی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ جیسے ماں کا دہاں موجود لوگوں سے رشتہ سمجھتا چاہتا تھا۔

ایک تخت لہا کا کچ پر گاؤں جیسے سے لپک لگائے وہ ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی جسے حسن جہاں نے ماں کہہ کر پکارا تھا اور جس کے سامنے وہ اب قلب مومن کے ساتھ بحرمانہ انداز میں سر جھکائے کھڑی تھی۔

”آتا ہی تھا تو نے حسن جہاں..... آتا ہی تھا..... تو مجھے اعلان کر کے کیا بتا رہی ہے۔“ اُس عورت نے آلتی پاؤں مارے بیٹھے بیٹھے اپنا گاؤں کی سیدھا کیا۔ اُس کی کاٹ دار نظریں قلب مومن پر ایک لمحہ کے لیے لگی تھیں پھر

دوبارہ حسن جہاں پر چلی گئی تھیں۔

”اب آگئی ہے تو بیٹھ جا..... پانی پلا اسے۔“ اسی عورت نے حسن جہاں سے کہتے کہتے کسی ماں کی بات کی تھی۔ حسن جہاں میکانیکی انداز میں ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔ قلب مومن کو اس نے اسی صوفہ پر ساتھ لٹا لیا تھا۔ قلب مومن نے باری باری اُن سب لوگوں کو دیکھنا شروع کیا جو وہاں کھڑے تھے۔ اُن سب کی ناکوں اور آنکھوں میں اُس نے اپنی ماں کے لیے ایک ہی تاثر دیکھا تھا۔ نفرت کا۔ قلب مومن کا دل ایک دم لمبا لپکا تھا۔ شان دار گھر اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا نہ ہی وہاں موجود لوگ۔ اُن میں سے کسی کی تو وہ قلب مومن پر کبھی نہ دیکھی تھی۔

”ممتاز نے حسن جہاں بنایا اور تو چلی گئی تھی۔“ قلب مومن نے اسی عورت کو تیز انداز میں دیکھا۔

بہن کے ساتھ اپنی ماں سے کہتے سنا۔ اُس نے ماں کا چہرہ دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر ہنس بھی نہیں تھا۔

”خود غرضی دیکھیں اماں اس کی..... ہمارا نہیں سوچا اس نے۔“ اس بار قلب مومن نے ایک مرد کو بلند آواز میں کہتے سنا تھا۔

”ہم مرتے یا جیتے، اس نے پروا نہیں کی۔“ وہ وہاں کھڑی ایک اور لڑکی تھی جس کی شکل اس کی ماں سے ملتی تھی۔ قلب مومن نے اُس کی بات سنتے ہوئے غور کیا۔

”پروا کیوں کرتی یہ.....؟ یہ تو پیار کر رہی تھی..... پیار بڑا ہوتا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی سے بھی بڑا۔“

تو مسیحا بن کر آیا تھا اس کے لیے..... شیطان تو ہم تھے..... کیوں حسن جہاں۔“

قلب مومن نے ایک بار پھر اُسی ادھیڑ عمر کی عورت کو کہتے سنا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پتیلی پر کچھ رکھ کر دوسرے ہاتھ کی پتیلی سے اُسے ملتے ہوئے منہ میں ڈال رہی تھی۔ اُس کی مولی مولی آنکھیں سیاہ کا جل کے ساتھ اس وقت بے خوف ناک لگی تھیں مومن کو۔ اور اُس کے ہونٹوں اور دانتوں دونوں پر عجیب سا لال رنگ لگا ہوا تھا۔ قلب مومن اُسے بنور دیکھ رہا تھا۔ وہ اُس کی پانی تھی حسن جہاں نے ایک بار اُسے بتایا تھا کہ چاند کی بڑھیا کی طرح اُس کی بھی ایک ہانی تھی۔ جو دور دیس میں رہتی تھی مگر قلب مومن نے جو تصور اپنی اُس نالی کا بنایا تھا وہ ممتاز جہاں جیسا نہیں تھا۔

”ایسے تو کوئی سوتیلے رشتوں کے ساتھ نہیں کرتا جس طرح اس نے سکے رشتوں کے ساتھ کیا۔ گارڈ بار شروع کیا تھا میں نے اور یہ اُس وقت بھاگ گئی۔ میرا کاروبار ڈبو گئی۔“

قلب مومن نے اُسی مرد کو دوبارہ بلند آواز میں کہتے سنا جس نے پہلے اُس کی ماں کو ملامت کی تھی۔ عجب بے چینی کے ساتھ اُس نے حسن جہاں کو دیکھا تھا۔ وہ ویسے ہی بیٹھی تھی خاموش سر جھکائے، خشک آنکھوں کے ساتھ۔ مومن بے قرار ہوا۔ اُس کی ماں کو بولنا چاہیے تھا، کچھ کہنا چاہیے تھا۔ اس طرح کیوں اُسے برا بھلا کہہ رہے تھے وہ سب لوگ۔ وہ ماں کو بھجھوڑنا چاہتا تھا۔

”مجھے فلم میں کامیاب ہونا تھا پر نہیں۔ باجی کو کیا؟ بس خود نمبروں رہتی..... اپنا سکھ چلا رہتا۔ بھگت جانے بھاڑ میں۔“ اب وہ لڑکی تھی سے کہہ رہی تھی۔ قلب مومن نے حسن جہاں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

وہ ماں کو اُن سب کی باتوں سے بچانے کے لیے فی الحال صرف یہی کر سکتا تھا۔

”کیسی کیسی باتیں کی تھیں میں نے..... ماں کی سالوں کی محنت کو پیار کی بھٹی میں نہ جھونک۔“

نمبر ایک

ہیر وین بنا کر راج کروا رہی تھی ممتاز، کروڑوں مردوں کے دلوں اور دماغوں پر..... اس کو چاہیے تھا ایک مرد کے نام کا پٹا..... اور یہ کچھ..... اب ممتاز کیا کرے تیرا..... اچھا ڈالے..... اماں میں آگئی۔“ ممتاز اب بالآخر اپنے کاؤنچ سے اتر آئی تھی اور اپنی پاٹ دار آواز میں حسن جہاں کو لعنت ملامت کرتے ہوئے اُس نے اس کی اصل اتاری اور پھر لاؤنچ سے کھل گئی۔ اُس کے پیچھے باری باری وہ سارے لوگ بھی وہاں سے چلے گئے تھے جو صبح

جہاں کو متاز کی طرح وقفے وقفے سے برا بھلا کہہ رہے تھے۔

عجب خاموشی تھی جو ان سب کے جانے کے بعد وہاں در آئی تھی اور اسی خاموشی میں قلبِ مومن نے پہلی بار وہاں اُس شخص کو نمودار ہوتے دیکھا جو ان کے ترکی والے گھر آیا تھا تو ان کی زندگی تباہ کر کے چلا گیا تھا۔ قلبِ مومن کی آنکھوں میں اُس کا چہرہ نقش تھا۔ وہ اتنے عرصہ بعد بھی اُسے پہلی نظر میں پہچان گیا تھا۔ کسی تعارف کے بغیر۔ وہ شخص بلی کی طرح دبے قدموں اندر آیا تھا اور اندر آتے ہوئے اُس کی نظریں صرف حسنِ جہاں پر تھیں۔ وہ سیدھا اُس کے سامنے آیا تھا۔ پھر مومن نے اُسے اپنے سامنے کھڑے ہوتے دیکھا۔ وہ حسنِ جہاں کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھا رہا تھا۔ حسنِ جہاں اور اُس کی نظریں ملی تھیں۔ مومن کا دل چاہا وہ اپنی ماں کی ٹھوڑی کے نیچے لگے اُس کے ہاتھ کو جھٹکے۔ مگر اُس کی ماں اُس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا کر کے آئی ہیں؟“ اُس شخص نے عجیب دل گرفتگی کے عالم میں حسنِ جہاں سے کہا تھا۔ پانی سیلاب کی طرح حسنِ جہاں کی آنکھوں میں اُمڈا تھا۔

”پیارے کے آئی ہوں۔“ قلبِ مومن نے حسنِ جہاں کو کہتے سنا۔ اُس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اپنی ماں کو ہنستے دیکھا۔ وہ اب اُس شخص سے لپٹی رو رہی تھی۔ وہ شخص بھی رو رہا تھا۔ صرف قلبِ مومن تھا جس کا دل اس وقت بھول کا کاٹنا بن گیا تھا۔

☆☆☆

مومنہ کو لگا جیسے کسی چیز نے اس کے پیٹ میں مکا مارا اور وہ داؤد اور اقصیٰ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اُسے وہاں کیوں لائے تھے مگر اُس کی زبان پر وہ سوال نہیں آ رہا تھا۔ وہ بدترین خدشات کے درمیان جھولنے کی اس کیفیت سے جیسے باہر نکل آنے کی جرأت نہیں کر پا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے جہاں تگیر کا چہرہ آ رہا تھا۔ دردِ اب پیٹ سے پسلیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اُس نے یاد ہونے کے باوجود انگلیوں کی پوروں پر وہ دن گئے جتنے دنوں سے اُس نے جہاں تگیر کی آواز نہیں سنی تھی..... چار دن..... اور ان چار دنوں میں اُسے اگر کچھ ہوا تھا تو اُسے پتا کیوں نہیں چلا تھا۔ اُس کی سانس کیوں نہیں رُکی تھی، اُس کا دل کیوں نہیں رُکا تھا؟ ”مومنہ۔“ برابر بیٹھی اقصیٰ نے اُس کا نام پکارا۔ اُس نے میکا کی انداز میں گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔ اقصیٰ یک دم اُس سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔

”جہاں تگیر۔“ اُس نے بس ایک لفظ کہا تھا۔ مومنہ نے ایک بھی نہیں۔ سارے اندازے، قیاسے اُس کی پوروں پر تھے۔ وہ جہاں تگیر کا نام نہ بھی لیتی تو بھی وہ جان گئی تھی، وہ کہاں تھا۔ گاڑی کی کچھلی سیٹ پر وہ کسی بت کی طرح بیٹھی رہی۔ اقصیٰ اُس سے لپٹی رو رہی اور مومنہ سلطان اُسے دیکھتی رہی۔ اُسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ آنسوؤں کو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ خشک نہیں ہوئے تھے، بہنا بھول گئے تھے۔ داؤد نے اُس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اقصیٰ اُس سے الگ ہو گئی۔ مومنہ میکا کی انداز میں کھلے دروازے سے باہر آئی تھی اور اسی انداز میں ہی اُس نے مردہ خانہ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

اقصیٰ نے اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا، اُس نے پکڑنے دیا۔ داؤد اس کے پیچھے آیا تھا۔ مردہ خانہ کے دروازے سے باہر تیرا آمدنے کی سیر جیون میں اُس نے دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھے ٹریا اور سلطان کو دور لے دیکھا تھا۔

”تمہارے جانے کے بعد اگلے دن طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی اُس کی لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں نہ بتائیں۔ آنٹی نے مجھے فون کیا تھا۔ ہم بڑی جگہ لے کر پھر رہے اُسے لیکن اُس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ دونوں کردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا..... کل وہ.....“ اقصیٰ نے بات مکمل نہیں کی۔ اُس سے آگے جو کہتا تھا، وہ

مومنہ جانتی تھی۔ مگر اب جیسے وہ یہ سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔

ثریا اور سلطان نے اُسے دور سے دیکھ لیا تھا۔ سلطان اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں رورہا تھا جیسے کوئی بچہ کسی بڑے کو دیکھ کر تسلیم کرنے والے انداز میں روتا ہے۔ مومنہ نے ثریا کو دیکھا، وہ وہیں بیٹھی تھی۔

کے ساتھ، مگر صدمہ۔ مومنہ کو دیکھ کر بھی نہیں اٹھی تھی۔
"لاش نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں پہلے ہسپتال کے بل کلیئر کرو۔" اپنی آنکھیں ریڑھتے، روتے ہوئے
سے لپٹے سلطان نے کہا تھا۔ مومنہ سلطان کی سالوں سے اس گھر کا کمانے والا مرد تھی۔ اور زندگی میں
اُسے اپنے اس کردار پر رنج نہیں ہوا۔ اُس وقت وہاں کھڑے اُس نے زندگی میں پہلی دفعہ خواہش کی تھی
کمانے والی ذمہ داری کا ش بھی اُس کے کندھوں پر نہ ہوتی، کوئی اور ہوتا اسے نبھانے والا۔ کوئی اور۔
جہاں تک اُس کی سوچوں کو جیسے بریک لگا تھا۔ جہاں تک گناہ جیسے اُسے ایک بار پھر ہوش میں لے آیا تھا۔
"انکل! میں مل چکا ہوں اندر فائنس والوں سے، آپ پریشان نہ ہوں۔ ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔"
نے سلطان کو تسلی دی تھی۔ مومنہ باپ سے الگ ہو گئی۔ روتے سے زیادہ بڑے کام کرنے تھے اُسے
رونے کے لیے تو زندگی پڑی تھی۔

"ابا! میں کرتی ہوں کچھ۔" مومنہ نے یہ ہم آواز میں باپ سے نظریں ملانے بغیر کہا۔ روتے جلتے سلطان
کو عجیب قرار ملا۔ مومنہ جب بھی یہ جملہ بولتی تھی، کچھ نہ کچھ کر ہی لیتی تھی۔ وہ ثریا کے پاس نہیں گئی صرف اُس
دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ثریا نے بھی اُس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔
"کتنا بل ہے؟" مومنہ نے پلٹ کر داد سے پوچھا۔

☆☆☆

"پونے تین لاکھ۔ کیسے بنا دیا آپ نے اتنا بل۔" وہ بل کی رقم سن کر کراہ کر رہ گئی تھی۔ وہ اقصیٰ اور داد
کے ساتھ اس وقت بلز لیے ایڈمن آفس میں تھے اور وہاں موجود ڈاکٹر اُن سے بحث کر رہا تھا۔
"دیکھیں، یہ پرائیویٹ ہسپتال ہے۔ اس شہر کا سب سے بہترین ہسپتال۔ آئی سی یو میں رکھا آپ
چھٹ کو، ڈائلاکس ہوتا رہا۔ میڈیسنز اور انجکشنز دیے جاتے رہے۔ آپ کو سارا بریک ڈاؤن اس بل میں
جائے گا۔" وہ بڑے مشینی انداز میں اُنہیں تفصیلات بتا رہا تھا۔

"میں کلیئر کر دوں گی سارا بل۔ لیکن ابھی نہیں کر سکتی۔ آپ اُسے لے جانے دیں۔ میں یہ سارا بل کلیئر
کر دوں گی۔" مومنہ نے منت سے کہا تھا۔

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن یہ میرا ہسپتال نہیں ہے۔ میں بھی ملازم ہوں یہاں۔۔۔۔۔ بل کلیئر ہونے
بغیر میں لاش آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر نے بڑی نرمی لیکن بڑی صاف گوئی سے اُس سے کہا تھا۔
"آپ نہیں زیادہ نہیں بس تین چار دن کی مہلت دے دیں۔ میں گارنٹی کے طور پر اپنی گاڑی رکھوا چکا ہوں
یہاں۔" اس بار داد نے مداخلت کرتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا تھا۔

"دیکھیں آپ میری پوزیشن سمجھیں۔ ہسپتال اس طرح کی ڈیپارٹمنٹ نہیں رکھتا اور گاڑی نہیں لیتا۔ آپ لوگ
کسی سے لون لے لیں ہم اور ٹائم دے دیتے ہیں آپ کو۔" ڈاکٹر اسے اپنے سامنے رکھی ایک فائل کو بند کرتے
ہوئے کہا تھا۔

"اور ٹائم دیں گے لیکن اُسے لے جانے میں دیں گے؟" اس بار اقصیٰ نے کہا تھا۔ ڈاکٹر چپ رہا۔ مومنہ کو
کس دم ہوش آ گیا تھا۔ اناجیک کھول کر اس نے وہ لائف لائن شروع کیا جس میں اُس کی فلم کا ایڈوائس کا چمک

تھا۔ لفافہ مل گیا تھا۔

”یہ..... یہ ایک لاکھ کا چیک ہے..... آپ اس وقت یہ لے لیں..... باقی بھی کل پرسوں تک دے دیتی ہوں۔“ اُس نے لفافے سے وہ چیک نکال کر ڈاکٹر کی میز پر رکھا تھا۔

”یہ چیک آپ کے نام ہے۔ ہسپتال اس کا کیا کرے گا اور ہم لوگ ویسے بھی چیک میں نہیں کیش میں پے منٹ لیتے ہیں۔“ اُس ڈاکٹر نے چیک پیچھے کھسکاتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

”آپ انورڈ نہیں کر سکتے تھے یہ ہسپتال..... آپ کو لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ چند لاکھ تو بہت معمولی رقم ہے۔ یہاں تو اس سے بھی زیادہ رقم کے بلز لوگ ایک بھی سوال کئے بغیر پے کر کے جاتے ہیں۔“ اُس ڈاکٹر نے جیسے اُن کو اُن کی حیثیت کا احساس دلایا تھا۔

”زندگی بچانے کے لیے لائے تھے..... کسی بھی قیمت پر مل جاتی..... وہ آپ نے بجائی ہی نہیں..... مرنے کے لیے تھوڑی لائے تھے۔“ مومنہ کی آواز پہلی بار بھرائی تھی۔ اسے پہلی بار لگا وہ رو دے گی مگر آنسو صرف اُس کی آواز کو ہلا گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں کو چھونے کی کوشش نہیں کی انہوں نے۔

”تم دیکھنا، میں یہ سب میڈیا پر دوں گی۔ سوشل میڈیا پر کمپین چلاؤں گی تمہارے ہسپتال کے خلاف..... تم لوگ گھٹھا اور کمینے ہو۔“

اقصی ایک دم آپے سے باہر ہو کر اُس ڈاکٹر اور اُس کے ساتھ بیٹھے فائننس کے لوگوں پر چلائی تھی۔ مومنہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر دبا یا یوں جیسے اُسے روکنا چاہتی ہو۔

”اُس سے کیا ہوگا میڈم..... زیادہ سے زیادہ ہماری بدنامی..... بدنامی سے بزنس تو ختم نہیں ہوتا بل تو پھر بھی ہسپتال والے لیں گے آپ سے..... وہ تو مجھ سے بھی لے لیتے اگر آپ کی جگہ میں ہوتا۔“ اُس ڈاکٹر نے جیسے نرم لفظوں میں اُسے اپنی حیثیت اور اوقات کا بھی احساس ڈھکے چھپے لفظوں میں کر دیا۔

”میں ایکٹریس ہوں..... اپنے کام کو حلال بنانے کے لیے مر رہی ہوں پر آپ کو تو حلال کو بھی حرام بناتے ہوئے کوئی تکلیف، کوئی شرمندگی نہیں ہو رہی۔“

اقصی کا ہاتھ پکڑے اُس نے ڈاکٹر سے کہا تھا۔ اُس آفس سے نکلتے ہوئے زندگی میں پہلی بار مومنہ سلطان کو اپنا پروفیشن اتنا حرام نہیں لگا تھا جتنا ہمیشہ لگتا تھا۔

☆☆☆

پچاس نہیں اُس رات وہ کہاں کہاں پونے تین لاکھ کی رقم اکٹھا کرنے اقصیٰ اور دادو کے ساتھ گئی تھی۔ جہاں گھر کے پچھلے کئی سالوں سے ہونے والے علاج نے انہیں پہلے ہی بہت سے لوگوں کا مقروض کر رکھا تھا اور وہ کوشش کے باوجود بھی پرانا قرض ادا نہیں کر پائے تھے اور اب اس اجا تک آ جانے والے پونے تین لاکھ کی رقم کے ملنے نے جیسے مومنہ سلطان کا سارا دم ختم نکال دیا تھا۔ اُس کے پاس کچھ دنوں کا وقت ہوتا تو وہ اس رقم کو اقصیٰ اور دادو کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی طرح پورا کر لیتی۔ مگر اُسے دو دن سے اُس مردہ خانہ میں پڑے ہوئے جہاں گھر کو اب گھر لانا تھا۔ اُسے اپنے آخری گھر بھیجنا تھا تا کہ اُس کے ماں باپ کو کچھ سکون مل جاتا۔ مومنہ سلطان کے ہاتھ میں بس اب اتنا ہی سکون دینا چاہتا تھا اُن کو۔

دادو کی پرانے مال مال کی آغوش سوزو کی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی مومنہ سلطان نے شہر کی سڑکوں پر رات کو در بدر پھرتے پچاس نہیں کس کس کو فون کیا تھا..... بڑی بڑی رقموں کے لیے نہیں..... چھوٹی چھوٹی رقموں کے لیے..... تین..... پانچ..... سات..... اُس کا حلقہ احباب اتنی ہی رقم قرض میں دے سکتا تھا۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھی جانے والی ہر رقم اُس کی زندگی کے گلاس کو پانی کے قطرہ کی طرح بھر رہی تھی۔ عزت نفس اور خودداری کو وہ مردہ خانہ کے باہر بیٹھے ہوئے

سلطان اور شہزادے کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ تاکہ وہ کم از کم اس رات مومنہ سلطان کے پیروں کی زنجیر نہ بنیں۔
 ہمیشہ سے جہانگیر کی زندگی اور علاج کے لیے اس طرح پیسے جمع کرنے سے روک رکھا تھا۔
 ”دیکھ مومنہ! ابھی تمہیں ایک لاکھ دیا گیا ہے ایڈوانس میں اور اب تم چاہ رہی ہو کہ مزید رقم دی جائے۔
 ممکن نہیں ہے۔ اور میری تمہیں ایڈوانس ہے کہ اس اسٹج پر اس طرح کے مطالبے نہ کرو ورنہ پروڈکشن سٹاپ ہو جائے گی۔“
 نکال دے گی اس فلم سے۔ یہ بڑے پروفیشنل لوگ ہیں۔ پاکستانی بہانے اور جھوٹ نہیں مانتے۔ یہ۔“
 اُس نے اس فلم کے کاسٹنگ ایجنٹ کو فون کیا تھا۔ جو فلم وہ سائن کر کے آئی تھی اور اُس نے فون پر ہی
 پوری بات سنے بغیر فون نہ کہتے ہوئے بند کر دیا تھا۔ ”میں کچھ کیسٹس کے ساتھ ہوں تم سے کل بات کروں گا۔“
 مومنہ کو کچھ محسوس نہیں ہوا۔ نہ کوئی ہنگ نہ کوئی ذلت۔ جس کرب میں وہ تھی، وہ اُس کے باقی

احساس کھا گیا تھا۔
 ”ہو جائیں گے اسٹے مومنہ! ہو جائیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ہم کر رہے ہیں کوشش۔ فوری طور
 بن نہیں پار ہا ورنہ داؤد اپنی گاڑی بیچنے کی بات کر چکا ہے کتنے لوگوں سے کل سے۔ تم دعا کرو کوئی فور
 منٹ پر تیار ہو تو گاڑی ہی بیچ دوں۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“ اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہوئی
 اپنے فون سے کالز کرتے ہوئے مسلسل اُسے تسلیاں دے رہی تھی۔
 ”اسلم بھائی سے بھی بات کرتی ہوں اگر اُن سے کچھ مل جائیں۔“

مومنہ نے جواباً فون پر ایک اور نام ڈائل کرنا شروع کر دیا یوں جیسے وہ تسلی اُس نے سنی ہی نہ ہو۔
 کال کرتے کرتے اُس کا چہرہ دیکھا۔ مومنہ کے چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی۔ وہ صرف کال ملا کر فون
 سے لگائے اب اسلم بھائی سے بات کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اسلم بھائی کچھ قرض چاہیے۔“ دوسری طرف اسلم بھائی کی آواز سننے ہی اُس نے چھوٹے ہی کہا تھا
 ”ایک تو میرے ہر آرڈر کو میرے ہی سوپ میں قرض کی ضرورت پڑتی ہے۔ بینک سمجھ لیا ہے تم لوگ
 نیچے۔ اب تم بتاؤ، کون سا پلاٹ خریدا ہے جس کی قسط دینی ہے۔“ انہوں نے دوسری طرف سے جھلا کر کہا تھا۔
 ”جہانگیر مر گیا اسلم بھائی۔ اُس کی لاش لینی ہے ہاسپٹل سے۔“ بلز کیسٹر کرنے ہیں۔“

مومنہ نے چند گھنٹوں میں درجنوں بار دہرایا ہوا جملہ اُسی میکا کی انداز میں ایک بار پھر دہرایا تھا۔
 دوسری طرف اسلم بھائی کچھ دیر بول ہی نہیں سکے تھے پھر انہوں نے کچھ گڑبڑائے ہوئے انداز میں
 ”اوہ! یہ تو بڑے دکھ کی خبر ہے۔ کتنے پیسے چاہئیں؟“
 ”آپ جتنے بھی دے سکیں۔“ مومنہ نے اُسی انداز میں کہا۔

”میں اس وقت شوٹ پر ہوں۔ نکل نہیں سکتا ابھی یہاں سے۔ مگر تم آ جاؤ۔ کرتا ہوں۔“
 شوٹنگ لوکیشن کا تو یہاں ہے نا؟“

”جی اسلم بھائی۔ میں آ جاتی ہوں وہاں۔“ اُس نے جواباً کہتے ہوئے فون بند کیا اور کالمیکس
 سے اگلا نمبر ڈیوٹڈتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

”اب کس کو کال کروں۔ کس کو کروں۔“ اُنھیں کاڈل کتنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اُس
 کہے۔ وہ اب داؤد کو اُس لوکیشن کا پتا بتا رہی تھی جہاں اسلم بھائی شوٹ پر تھے۔
 ”تم قاسب مومن سے بات کرو، وہ اگر کچھ کر دے۔“ اُنھیں کو ایک دم دوبارہ خیال آیا۔
 ”کل بھی سارا دن اُن سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن وہ مصروف تھے آج بھی کئی دفعہ
 کر چکا ہوں فون نہیں اٹھا رہے۔“ داؤد نے گاڑی کو اُس سڑک پر ڈالتے ہوئے کہا جس کا پتا مومنہ نے بتایا تھا۔

”ان کی کوئی پارٹی چل رہی ہوگی۔ وہ ایسے ہی ہیں مرضی سے بات کرتے ہیں۔“ داؤد بڑبڑایا تھا۔ ”اور میں نے پہلے ہی کچھ قرضہ لیا ہوا ہے۔ اُن سے اب پانچویں اس بار وہ کچھ دیتے بھی نہیں۔“ اقصیٰ خاموش رہی۔ اُس ایڈریس پر پہنچنے ہی مومنہ میکا کی انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر کر چلی گئی تھی۔ ”یہ روکیوں نہیں رہی۔“ داؤد نے دور جاتی مومنہ کو دیکھ کر مضطرب انداز میں اقصیٰ سے کہا تھا۔ ”حوصلہ دکھا رہی ہے۔“ اقصیٰ نے ناک نشو سے رگڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اتنے حوصلے کا کیا کرنا ہے اس نے..... اس سے کہو کہ روئے۔“ داؤد نے جواباً اُس سے کہا تھا۔ وہ دس منٹ بعد دوبارہ نمودار ہوئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُس نے ہاتھ میں پکڑا لٹافہ اقصیٰ کو دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ دس ہزار ہیں..... سیات ہزار جبار بھائی بھی دیں گے۔ اُن کا گھر اسی لین میں ہے۔“ اُس نے ہاتھ سے داؤد کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اقصیٰ نے یک دم اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مومنہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ”تم رولو مومنہ۔“ وہ اقصیٰ کو چند لمحے دیکھتی رہی پھر اُس نے کہا۔ ”میسے پورے ہو جائیں پھر رولوں گی۔“ اقصیٰ سے اُس نے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔

”اللہ تاس مارے ان ہسپتال والوں کا..... دیکھنا کیسے کیڑے پڑیں گے انہیں۔“ جھومر نے اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے سلطان سے کہا۔ سلطان رات کے اس پہاڑی اپنی گلی سے میسے اکٹھے کرنے آیا تھا۔ ”لاکھ کیڑے پڑ جائیں جھومر..... میرا جہانگیر تو نہیں آئے گا۔“ سلطان نے روتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ جھومر نے دوپٹے کے پتے سے بندھے میسے کھول کر نکالتے ہوئے سلطان کو تسلی دی۔

”بس کر سلطان بھائی! یہ پندرہ سو رکھ لے۔ میں نکلتی ہوں ابھی پھر رات کو..... جو کمائی ہوتی ہے وہ بھی لا کر دیتی ہوں تجھے..... ہسپتال میں ہی آ کے دے جاتی ہوں..... تو اب وہیں رہ۔“ جھومر نے سوسو کے خستہ حال نوٹ اُس کی منٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔ ”تیرا شکریہ کیسے ادا کروں جھومر!“ سلطان نے سسکیاں لیتے ہوئے اُس سے کہا تھا اتنے سالوں میں جھومر اور اُس کے درمیان کبھی شکریہ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ تو تزاخ اور گالم گلوچ میں ہی بات ختم ہوتی تھی۔ وہ اکثر اُس سے میک اپ کرانا اور بغیر میسے دیے نقص نکالتا چلا جاتا یا سلطان اُس کا مذاق اڑاتا تو وہ گلی میں کھڑا ہو کر اُس کے پورے خاندان کو کوستا، مومنہ باجی کے علاوہ جس کا وہ قین تھا..... اور آج جہانگیر چلا گیا تھا تو جیسے سب کی طرح وہ بھی مر رہا مرنے چلا آیا تھا۔

”چھوڑ سلطان بھائی..... میرا تو جنازہ بھی جائز نہیں..... پر جن کا جائز ہے، اُن کا تو جنازہ ہو..... میں آتی ہوں پھر۔“

وہ کہتے ہوئے اسی طرح منکتا ہوا چلا گیا تھا۔ سلطان کو اُس لمحے جھومر کے سامنے وہ پورا معاشرہ بھڑا لگا جس کا وہ حصہ تھا۔

مومنہ نے ثریا کو چونک کر دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے یک دم کچھ گنگنا رہی تھی۔ مومنہ اور اقصیٰ ابھی کچھ دیر پہلے ہی واپس ہسپتال آئی تھیں اور داؤد پونے تین لاکھ میں سے باقی رہ جانے والے پچاس ہزار کسی سے مانگنے گیا تھا۔ سلطان وہاں نہیں تھا اور وہ اور اقصیٰ برآمدے کی زمین پر بیٹھے اکٹھے ہونے والے سارے لفافوں اور ٹوکوں کو ایک آخری بار دوبارہ کن رہی تھیں، یوں جیسے کوئی سلامی کے لفافوں سے نوٹ نکال نکال کر گنتا ہے۔

ثریا اسی طرح اُن سے بے نیاز برآمدے کی دیوار کے ساتھ سرٹکائے گئیں۔ رہی تھی۔ وہ ایک لوری تھی۔ مومنہ اور انھیں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مومنہ اپنی گود میں رکھے ہوئے سارے نوٹ انھیں کی گود میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اماں! کیا گارہی ہیں آپ۔“ ثریا کے پاس بیٹھ کر اُس نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا۔
ثریا کے بال لٹوں کی شکل میں اُس کی چٹیا سے نکل کر بکھرے ہوئے تھے اور اُس کی آنکھیں سرخ اور سوئی ہوئی تھیں۔ اُس نے مومنہ کو دیکھا۔

”جب چھوٹا تھا تو دوسرے بچے لوری سن کر سوتے تھے، یہ اٹھ جاتا تھا..... شاید اب بھی.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر لوری گانے لگی تھی۔

”ملّا لّا لوری..... دودھ کی کٹوری۔“

مومنہ، ثریا کا چہرہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ اُس کے ماں باپ ہمیشہ جہانگیر کے عشق میں جھلا رہے تھے جہانگیر کے سامنے اُن کے لیے مومنہ کچھ بھی نہیں تھی اور مومنہ نے ساری زندگی اس تفریق کو برامانے بغیر سہا۔ جہانگیر چاہے جانے کے قابل تھا وہ شاید نہیں تھی یا وہ یاد رہ جانے والوں میں سے تھا، وہ نہیں تھی۔ وہ دلوں کو مٹھی میں کر لیتا جاتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی..... اگر زندگی جہانگیر سلطان کو موقع دیتی تو وہ لاکھوں کروڑوں دلوں پر ہیر دین کر حکمرانی کرتا۔ صرف سلطان اور ثریا کا یقین نہیں تھا۔ مومنہ سلطان بھی یہ ماننے والوں میں سے تھی اور اگر سب کچھ ویسا ہوتا تو وہ بڑی خوشی سے جہانگیر کے سائے میں زندگی گزار لیتی..... اُس کے لیے تالیاں بجاتے ہوئے۔ اُس کی کامیابیوں اور فتوحات کو اپنانے ہوئے، اس کی ناموری پر راضی..... مگر یہ سب کچھ زندگی نے ہونے نہیں دیا تھا یا شاید موت نے۔ ثریا کا چہرہ دیکھتے ہوئے، وہ وہ الفاظ ڈھونڈتی رہی جن سے وہ ثریا کو یہ سمجھا سکتی کہ وہ، یہ لوری نہ گائے۔ جہانگیر اب کبھی نہیں اُٹھے گا۔

PakiBooks.Sit

”جھولا جھلاؤں گی“

”جھولا جھلاؤں گی“

”جھولا جھلاؤں گی۔“

”مومنہ۔“ ایک ہی مصرعے کو بار بار گاتی ثریا کو دیکھتے ہوئے مومنہ کو انھیں نے پکارا تھا۔ داؤد آ گیا تھا۔ اور اُس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ مومنہ کو دکھاتے ہوئے اُس نے کہا۔
”پورے ہو گئے میسے..... مجھے لگتا ہے۔“

وہ مینوں زمین پر آگئی پالتی مارے ایک بار پھر اُن پیسوں کو گن رہے تھے جب فجر کی اذان ہونے لگی۔
”دولا کھستاسی ہزار۔“ داؤد نے بالآخر آخری نوٹ گنتے ہوئے کہا۔ مومنہ کو لگا وہ جیسے وہ شہزادی تھی جس کے جسم میں گاڑی ہوئی سوئیاں وہ سارے نوٹ نکال رہے تھے اور آخری سوئی اُس آخری رقم سے لٹکی تھی۔ وہ اب جہانگیر کو کھلے جاسکتی تھی تاکہ ثریا وہ لوری نہ گائے۔

داؤد پیسے لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مومنہ برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر چت لیٹ گئی تھی۔ یوں جیسے بہت لمبی ریس میں دوڑنے والا انتہائی لائن کو پار کرنے کے بعد زمین پر گرنا ہے۔ وہ بھی جیسے ریس کوئی اور جیت چکا ہو۔

”مومنہ! تم رولو۔“ انھیں نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا۔

وہ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد بڑبڑائی۔

”اب کس بات پر روتا ہے۔“ انھیں بول نہیں سکی۔

قلب مومن نے یہاں کو اپنے کسی کلائٹ کے ساتھ اپنے بوتیک اسٹوڈیو میں بیٹھ دیکھا۔ وہ اُس کے ساتھ اُس کا پرائیڈل ڈسکس کر رہی تھی۔ قلب مومن ہلٹے ہوئے ڈپلے پر لگے برائڈ لڑکھنے لگا۔ یہاں اُسے دیکھ لیا تھا، لیکن وہ مکمل طور پر اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہی۔ اُس کے بوتیک اسٹوڈیو کا وہ حصہ جو اُس کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ گلاس پارٹیشن سے بوتیک کے باقی حصہ سے الگ کیا گیا تھا۔ مومن وہاں ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تھا لیکن اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کو کلائٹ کو فارغ کر دینے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ تقریباً دس منٹ وہاں ٹھہرتا رہا اور بالآخر جب وہ کلائٹ باہر نکلی تو وہ اُس میں داخل ہوا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے یہاں کو دیکھا، اُس نے جواباً بے تاثر چہرے کے ساتھ اُس سے کہا۔ ”میں کلائٹ کے ساتھ میٹنگ میں تھی۔“

”میں نے تمہیں انٹرویو نہیں کیا۔“ مومن نے جواباً کہا۔ وہ اب ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ چکا تھا۔ ”ویٹ کرنا چاہیے تھا تمہیں، میں بلالی تب اندر آنا چاہیے تھا۔“ یہاں کا لہجہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ مومن بے اختیار ہنسا اور میز پر دونوں بازو پھیلا کر، کچھ آگے جھکتے ہوئے بولا۔

”ناراضی ختم کر دو اب۔“

”نہیں، میں کیوں ناراض ہوں گی تم سے اور ہوں گی بھی تو تمہیں کیا پروا؟“ یہاں جواباً اُسی نرولٹھے انداز میں کہا۔ ”پروا ہے تو یہاں بیٹھا ہوں یہاں! تم نے ضوئی کا میری قلم میں کام کرنا ضد کیوں بنالی ہے اپنی۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ضد؟ خواہش ہے میری۔ تم ضد سمجھ رہے ہو تو ایسا ہی سہی۔“ یہاں اُسی تیکھے لہجے میں کہا۔

”تمہارے اور میرے تعلق میں ضوئی نہیں آنا چاہیے۔“ مومن کی حلقی بڑھی۔

”تمہارے اور میرے تعلق میں ضوئی نہیں ہے مومن..... تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم اپنے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے..... تمہاری ”میں“ بہت بڑی ہے..... تمہاری ناک اس سے بھی زیادہ۔“ اُس نے بڑی نجی سے مومن کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ بچھنے آیا تھا۔ وہ رگیدنے لگی تھی۔

”میں ایسا ہی ہوں یہاں..... میں ہمیشہ سے ایسا ہی تھا..... آج ایسا نہیں ہوا۔“ مومن نے شہد کی طرح اُس کے زہریلے جملوں کا گھونٹ بھرا تھا۔

”میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔“ اُس کے جملے نے مومن کو تکلیف پہنچائی۔

”تم مجھے ہرٹ کر رہی ہو۔“ اُس نے یہاں سے کہا۔ وہ جواباً استہزاء سے انداز میں ہنسی۔

”نہیں یہ کام تو تمہارا ہے..... کوئی دوسرا کیسے کر سکتا ہے؟“

”میں تمہیں منانے آیا تھا آریو کرنے نہیں۔“ مومن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی ہمت جیسے جواب دے گئی تھی۔

”ضوئی تمہاری قلم میں لیڈ رول کرے گا تو تمہارے اور میرے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا

ورنہ..... اس آل اوور (سب ختم)۔“

مومن نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

”تمہارے نزدیک ضوئی ہمارے رشتے سے زیادہ اہم ہے؟“

”نہیں، مجھے یہ دیکھنا ہے کہ تمہارا ہے لیے تمہاری ضد اہم ہے یا میں۔“

وہ اُس کے بعد وہاں رکا نہیں تھا۔ وہ لہجہ، وہ انداز، جملے اُس نے پہلی بار یہاں کے منہ سے سنے تھے اور اگر قلب مومن کو شک لگا تھا تو یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ کسی دوسرے مرد کے لیے اُس سے لڑ رہی تھی۔ اُسے چھوڑ دینے پر تیار تھی۔ قلب مومن کے لیے یہ ہنگ آمیز تھا اور ہنگ کو برداشت کرنا مومن کی کھٹی میں نہیں تھا۔

☆☆☆

”دادا جی! مومن بھائی کی شادی کر دیں اب۔“
 حکمران اعلیٰ کے کمرے میں بیٹھ کر پکڑا بھائے ان کے کپڑے استری کر رہا تھا جب کپڑے استری
 کرتے کرتے اُس نے ایک دم مومن اعلیٰ سے کہا۔ وہ چونک کر مسکرائے۔
 ”پٹھے بٹھائے جھپس اُس کی شادی کا خیال کیسے آ گیا؟“

”بس دادا جی! جب چوبیس کھنٹے پارٹیاں ہوں اور لڑکیاں آئیں تو پھر شادی کا شورہ ہی دے گا نا کوئی بھی
 شریف آدمی۔“ حکمران اعلیٰ کی کریم ہناتے ہوئے بولا اور پھر اچانک اُسے احساس ہوا، عبدالعلی چپ ہو گئے تھے۔
 اُسے اچانک احساس ہوا، وہ کچھ غلط بات کر گیا تھا۔
 ”ویسے مومن بھائی ہیں بڑے شریف آدمی..... لیکن لڑکیاں نہیں ناں! اٹھی آج کل کی۔“ اُس نے فوراً ہی
 کچھ مڑا دیا ہونے انداز میں سچ کی۔

”شرینوں کو بھی خراب کر دیتی ہیں..... اب مومن بھائی کو نہ بتائیے گا یہ ساری باتیں..... ان کو پہلے ہی خبر
 رہتا ہے کہ میں اُن کی باتیں لوگوں کو بتاتا ہوں حالانکہ آپ خود دیکھ لیں، آپ کتنے دنوں سے یہاں ہیں، میں
 نے کوئی ایک بھی بات بتائی ہے آپ کو مومن بھائی کی۔“
 حکمران نے بڑے فخریہ انداز میں جیسے اُن سے تصدیق چاہی تھی۔ عبدالعلی منگ تھے۔
 ”نہیں، تم نے تو کچھ بھی نہیں بتایا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑائے جیسے بہت پریشان ہوئے تھے۔ حکمران
 اُن کے تصدیقی جملے پر بے اختیار خوش ہوا۔

”یہی باتیں تو اچھی لگتی ہیں مجھے آپ کی دادا جی..... آپ بڑے سچے آدمی ہیں..... ویسے آپ کو ایک بات
 بتاؤں۔ مومن بھائی آپ سے ڈرتے بڑا ہیں۔“ اُس نے جیسے کوئی انکشاف کیا۔
 ”مجھ سے ڈرتا ہے؟“ عبدالعلی حیران ہوئے۔

”وہ تو کبھی بچپن میں بھی مجھ سے نہیں ڈرا۔“ انہیں بتانے لگا۔
 ”نہیں نہیں سچ میں..... آپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اسی لیے تو ساری ایسی ویسی تصویریں اور مجھے اسٹور
 میں رکھوا دیے ہیں انہوں نے..... بلکہ فرنیچر میں سے اُس چیز کی بوتلیں بھی ہٹا دی ہیں انہوں نے..... اور کین
 بھی..... وہ ”اُس چیز“ کے دادا جی..... آپ سمجھ تو گئے ہوں گے نا دادا جی۔“

حکمران نے شراب کا نام لیے بغیر اپنے گفتگوں پر معنی خیز انداز میں زور دیتے ہوئے عبدالعلی کے جسم میں سے
 جیسے جان نکالی تھی۔ قلب مومن بھٹک رہا تھا اور وہ بے بس تھے، کس کو پکارتے۔ کس سے کہتے..... قلب مومن
 کے سامنے بیٹھ کر سوال جواب کے تو عرصہ ہو گیا تھا انہیں۔
 ”تم مومن کے لیے دعا کیا کرو حکمران۔“ عبدالعلی کے لہجہ میں رنجیدگی تھی۔

”کیا دعا؟ سارا کچھ تو ہے ان کے پاس دادا جی۔“ حکمران نے حیرانی سے کہا۔ عبدالعلی چاہتے ہوئے بھی
 زبان پر وہ دعا نہیں لاسکے جو وہ مومن کے لیے چاہتے تھے۔ قلب مومن کا پردہ کہاں کھولنے والے تھے وہ.....
 کھولتے بھی تو بس ایک ہی شخص کے سامنے کھول سکتے تھے۔

☆☆☆
 ماسٹر ابراہیم کے ہاتھ جو تے مرمت کرنے والے لوہے کے اُس اسٹینڈ پر دھرے ایک اپنے پرہیزگار
 اور بے حد شرمیلے والے جو تے پر اپنے اوزار کے ساتھ مشین انداز میں چل رہے تھے۔ وہ فرش پر بیٹھے تھے اور
 اُن سے کچھ فاصلے پر ان کی جوتوں کی مرمت کی اُس دکان میں دھرے ایک شیخ پر جینز میں ملبوس ایک نوجوان لڑکا
 اپنے مہندی رپے ہاتھوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور بے حد بے چین انداز میں بولتی جا رہی تھی۔ ماسٹر ابراہیم

اُس کی باتیں خاموشی سے سنتے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھے۔

”ہو جائے گا نا ٹھیک.....؟“ جوتے کو کچھ ہو گیا نا تو میری ویڈیو خراب ہو جاتی ہے۔ اب دو دن میں ایسا جوتا کہاں سے ڈھونڈوں گی میں..... کہا بھی تھا کیتی کو کہ میرے سائز کا مسئلہ نہ ہو جائے مگر وہ کہہ رہی تھی نہیں، پرفیکٹ ہے۔ ایسا جوتا لاؤں گی کہ لوگ سنڈریلا کے سینڈلز کو بھول جائیں گے اور اب دیکھیں.....“ وہ شاید اسی رفتار سے بولتی جاتی مگر ماسٹر ابراہیم نے اُس کے جوتے کو اُس کے پیروں کے پاس رکھ کر اپنے اوزار سمیٹتے ہوئے کہا۔

”ہو گیا..... آپ دیکھ لیں۔“

لڑکی نے جیسے کچھ بے یقینی سے اُنہیں دیکھا اور پھر جوتے پہن کر وہ کھڑی ہو کر دو قدم چلی اور اُس نے بے اختیار دونوں ہاتھ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اپنے منہ پر رکھے۔

”مائی گڈنیس، یہ تو بالکل فٹ ہو گیا..... آپ نے کیسے کر دیا..... یہ تو امی سے آیا ہے..... کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا رہا تھا..... کہ بہت مہنگا ہے۔ ہم ذمہ داری لے کر نہیں کر سکتے۔“ وہ لڑکی اب جوتا اتارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں اس کمپنی میں کام کرتا تھا۔“ ماسٹر ابراہیم نے سر جھکائے مدھم آواز میں کہا۔ وہ اب اُس لڑکی کے پیروں سے اتارے ہوئے جوتے کو اُس بیگ میں ڈال رہا تھا۔ جن میں ڈال کر وہ اُسے لائی تھی۔

”کس کمپنی میں؟“ لڑکی جیسے سمجھ نہیں پائی۔

”جس کمپنی کے یہ سینڈلز ہیں۔ Sergio Rossi۔“ ماسٹر ابراہیم نے بے حد عام سے لہجے میں کہا تھا۔

”امی میں؟“ لڑکی کو جیسے کرنٹ لگا تھا سن کر۔

”میلان میں۔“ ماسٹر ابراہیم نے جیسے مزید صبح کی۔

”آئی ڈونٹ بلیواٹ۔“ لڑکی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اٹھارہ سو روپے۔“ ماسٹر ابراہیم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”کس چیز کے؟“ لڑکی نے بے ساختہ کہا۔

”اس کی مرمت کے..... سائز ٹھیک کرنے کے۔“

”پانچ سو دوں گی۔“ اُس لڑکی نے پانچ سو کا نوٹ بیگ سے نکال کر ماسٹر ابراہیم کو تھمایا تھا اور وہ اُس نے بڑے تھے۔ کچھ کہے بغیر انہوں نے خاموشی سے پانچ سو کا نوٹ پکڑ لیا اور تب ہی اُس لڑکی کے عقب میں کھڑے عبد اعلیٰ کو انہوں نے دیکھا تھا۔

وہ بے اختیار پانچ سو کا نوٹ چھوڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔

”عبد اعلیٰ صاحب۔“ اُن کے منہ سے نکلا تھا۔ اُس لڑکی نے فرش پر گرے پانچ سو کے نوٹ اور اُس ترکش بوڑھے سے ملنے اُس جوتے مرمت کرنے والے ماسٹر ابراہیم کو دیکھا جو چند لمحوں پہلے میلان میں Sergio Rossi کی کمپنی میں کام کرنے کا دعوا کر رہا تھا اور جس نے اُس کے لاکھوں مالیت کے اُس جوتے کو واقعی کمال مہارت سے ٹھیک کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ Sergio Rossi میں کام کر چکا ہوگا..... دکان سے نکلتے ہوئے اُس نے سوچا تھا، پوچھوں گی اُس سے جس نے یہاں بھیجا تھا۔ اُسے اپنی اُس مائل دوست کا خیال آیا جس کے توسط سے وہ یہاں آئی تھی۔

☆☆☆

”آپ نے تو اس ہارجر ان لی کر دیا مجھے..... آئے سے پہلے بتا دیتی تھیں۔“

اپنی حویلی کا دروازہ کھول کر عبد اعلیٰ کو اندر لاتے ہوئے ماسٹر ابراہیم نے اُن سے کہا تھا۔ وہ اب اُن کے

ساتھ حویلی کے صحن میں دانہ چگتے ہوئے کبوتروں کے درمیان سے گزر رہے تھے اور وہ کبوتر ڈر کر اڑنے کے بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے ادھر ادھر سرک رہے تھے۔

”میں نے سوچا، اس بار تمہیں اپنے پاس بلانے کے بجائے تمہارے گھر جا کر ملوں تم سے۔“ عبد العلی نے مسکراتے ہوئے حویلی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اب برآمدے میں داخل ہو چکے تھے۔

”تو یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔“ ماسٹر ابراہیم نے ایک کرسی انہیں بیٹھنے کے لیے دیتے ہوئے کہا۔

”میری کٹیا، بیٹھیں آپ۔“

”بڑی مشکل سے ملی تمہاری دکان..... کوئی تمہیں جانتا ہی نہیں۔“ عبد العلی بیٹھتے ہوئے بولے تھے۔

”آپ نے سوچی نہیں کہا ہو گا ورنہ فوراً مل جاتا۔“

ماسٹر ابراہیم نے ہنس کر کہا تھا۔

”ہاں یہ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں ماسٹر ابراہیم کہہ کر اٹلی کا حوالہ دیتا رہا۔“ انہوں نے پانی کا وہ گلاس پکڑا جو ماسٹر ابراہیم انہیں دے رہے تھے۔ ماسٹر ابراہیم اُن کی بات پر مسکرائے تھے۔

”میں آپ کو اس لیے بار بار اس حویلی میں لانا چاہتا تھا تا کہ اسے بھی آپ کے قدموں کی سعادت نصیب ہو۔“ ماسٹر ابراہیم نے اُن سے کہا۔ وہ اب برآمدے کی الماری کی ایک دروازہ کھول رہے تھے۔

”میرے آئے بغیر بھی یہ حویلی بے حد برکت اور سعادت والی ہے۔ یہاں مجھ سے بہتر لوگ رہتے ہیں..... میرے کام سے بڑا کام ہو رہا ہے۔“ عبد العلی نے پانی کا ایک گھونٹ پیا پھر کہا۔

”گناہ گار نہ کریں عبد العلی صاحب! آپ سے بہتر کیا ہوں گے ہم..... ہاں کام شاید اللہ ہماری اوقات سے بڑھ کر ہم سے کروا رہا ہے مگر یہ بھی میری بیوی کا کمال تھا۔ میرا نہیں..... اُسی پر عنایت تھی اللہ کی..... میں تو صرف وسیلہ بنا۔“ ماسٹر ابراہیم عجیب سی کیفیت میں کہہ رہے تھے اور عبد العلی کی آنکھوں میں نمی جھلکی تھی۔

”یہ دیکھیں آپ کا تحفہ۔“ عبد العلی کے سامنے یک دم وہ کیس لے کر آئے جو انہوں نے اُس الماری سے نکالا تھا۔ عبد العلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ وہ اُس کیس کو کھول کر اُس میں اپنے ہاتھ سے خطاطی کیا ہوا وہ قرآن پاک دیکھ رہے تھے جو انہوں نے کئی دہائیوں پہلے ماسٹر ابراہیم کو دیا تھا۔

”ماشاء اللہ۔ تم نے خوب سنبھال رکھا ہے۔“ انہوں نے اُس کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔

”سنبھالتی تو اس کو میری بیوی تھی، وہ تلاوت کیا کرتی تھی روز اس سے۔ اب اُس کے جانے کے بعد یہ ذمہ داری میں نے سنبھال لی اور ایک بچی آتی ہے میرے پاس مومنہ۔ وہ تلاوت کرتی ہے اس سے..... جو چھوٹی مونی مرمت ہے اُسی نے کی ہے اس کی جلد پر.....“

وہ عبد العلی کو چمڑے کی جلد پر کیے ہوئے وہ خطاطی کے نقش و نگار دکھا رہے تھے جو مومنہ سلطان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے۔ عبد العلی کو پتا نہیں کیا یا د آیا تھا۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو خشک کیے تھے۔

”آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اس نسخے نے زندگی بدل دی تھی میری..... کیسے سنبھال کر نہ رکھتا اسے۔“ ماسٹر ابراہیم اب اُس قرآن پاک کو اُن کے ہاتھوں سے واپس لیتے ہوئے اُسے دیکھ کر جیسے خود ماضی میں جا رہے تھے۔

”پنجا بار جب کسی نے یہ نسخہ مجھے دے کر کہا تھا کہ ہاتھ سے لکھا ہوا ہے تو میں نے سوچا تھا۔ ماسٹر ابراہیم تو نے ریمپ پر چلتی عورتوں کے جوتے بنانا کرساری عمر گنوا دی..... ملا کٹیا..... پیسہ..... بس..... اور ایک یہ شخص ہے جس نے زندگی کے سال لگا کر جنت کمالی..... بس دماغ ہی الٹ گیا میرا..... آپ کو یاد ہے کیسے ڈھونڈتا ہوا پنپتا تھا میں آپ کو ترکی میں۔“ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ اپنی بھرا آئی ہوئی آواز کو ٹھیک کرنے کے لیے۔

”ہاں اور میرے لیے لائے تھے..... اٹلی کے جوتے۔ پیرس کے پرفیومز اور میلان کے سوٹ۔“ عبد العلی

جیسے کچھ یاد کر کے نصے تھی، میں تو وہی لاسکتا تھا۔ حیران ہو گیا تھا اُس وقت آپ کو اردو پو لٹے دیکھ کر۔
 ”جو میری اوقات تھی، میں تو وہی لاسکتا تھا۔“ وہ دونوں جیسے ماضی میں پہنچے ہوئے تھے۔
 ”اپنے پوتے کے لیے سیکھ رہا تھا۔“ وہ دونوں جیسے ماضی میں پہنچے ہوئے تھے۔
 ”قلب مومن کیسا ہے؟“ ماسٹر ابراہیم نے ایک نھر ماسٹر ابراہیم کو دیکھا پھر
 جیسے کوئی دُخداں کی آنکھوں میں آئی تھی۔
 ”جیسے کبھی تم تھے۔“ اُن کی آواز میں عجیب ندامت تھی۔ ماسٹر ابراہیم بے اختیار نصے۔
 ”یعنی منہ حار میں ہے..... نکل آئے گا باہر۔“

”عبدالعلیٰ بڑا گناہ گار انسان ہے ماسٹر ابراہیم..... یہ آزمائشیں اسی لیے آتی ہیں مجھ پر..... اللہ کا نام لکھتے ہوئے
 کوئی کوتاہی، کوئی بے ادبی ہوگئی ہوگی مجھ سے۔“ اُن کے گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ ماسٹر ابراہیم نے بے قرار ہو کر کہا۔
 ”آپ ایسا نہ کہیں عبدالعلیٰ صاحب..... سارے راستے ہیں..... ہر راستے سے گزرنا ہوتا ہے انسان
 نے..... صرف سیدھے راستے سے چل کر کیسے پہنچے گا رب تک؟“ وہ اُنہیں تسلی دے رہے تھے۔
 ”میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اب..... کام کرتے ہوئے ہاتھ کاٹتے ہیں میرے..... یہ کام میرے ساتھ
 ختم ہو جائے گا..... وہ خاندان جو اتنی تسلیوں سے مسجد قرطبہ اور الحرام میں خطاطی کرتے کرتے ترکی کی مسجدوں اور
 محلوں میں خطاطی کرتا آیا ہے، وہ میرے بعد محقق خطاطوں کا خاندان نہیں کہلائے گا..... میرے خاندان میں کوئی
 اللہ کا نام لکھنے والا نہیں رہے گا۔ یہ غم بہت بڑا ہے میرے لیے..... طے کی موت سے بھی بڑا.....“
 ماسٹر ابراہیم نے اُن کا کندھا تھپکتے ہوئے اُنہیں تسلی دی۔
 ”چائے بنانا ہوں آپ کے لیے لیکن آپ روئیں نہیں..... استاد کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں
 ہوتے.....“

عبدالعلیٰ نے رومال سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔
 ”بس دل بھر آیا۔“

”وہ کہیں نہیں جاتا..... ادھر ہی آئے گا..... میرے ماں باپ بھی بڑے پریشان ہوئے تھے۔ سیدوں کا بیٹا
 جوتے بنانے لگ گیا، وہ بھی عورتوں کے فیشن شو..... ریمب..... وہ کیا سرکل تھا جس میں اُلٹا بیٹھتا تھا۔ نہ خاندان کی
 پروا تھی، نہ دین کی..... بس دُنیا کا ہی ہو کر رہ گیا تھا اور دیکھ لیں۔ اللہ نے کہاں سے بھیج کر کہاں لا بٹھایا ہے مجھے.....
 میلان، پیرس، نیویارک..... کس کی ٹائٹ لائف روک سکی ہے مجھے۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔
 ”بس ایک وقت ہوتا ہے..... اور وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا..... آپ دُعا کریں۔ اللہ قلب مومن کا وہ
 وقت پہلے لے آئے۔ آنا تو ادھر ہی ہے اُس نے۔“ وہ اُنہیں تسلی دیتے ہوئے گئے تھے اور عبدالعلیٰ اُن کا چہرہ
 دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

سفید چادر پر اپنے ہاتھ سے گرنے والی مٹھلیوں کو وہ کسی میکا نیکی انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اپنے ایک گھٹنے کو
 سیدھے اور دوسرے ہاتھ اپنی ٹھوڑی دکائے وہ ایک بازو اسی گھٹنے کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ اُس کے گھر کے چھوٹے
 سے حن میں کچھ سفید چادر کے گرد عورتیں بیٹھی ہوئیں کب شپ میں معروف مٹھلیاں پہنتی جا رہی تھیں۔ وہ
 آیت کریمہ کا آخری بعد تھا اور اُس کے بعد ختم دلوایا جاتا اور پھر کھانا بننا شروع ہوتا۔ آج چائیکر کا سوئم تھا۔
 سفید چادر کے درمیان مٹھلیوں کا ڈھیر غائب ہوتے ہی ایک دم چہل پہل شروع ہوئی تھی۔ محلے سے اب
 انہی عورتوں کے بچے بھی وہیں آنا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کے برابر بیٹھی اُسی نے چادر پر پڑے فون کی طرف

اُس کی توجہ مبذول کروائی جو بار بار تھر تھرا رہا تھا اُس پر کاسٹنگ ایجنٹ کا نام چمک رہا تھا۔ مومنہ نے فون کو نہیں چھوا۔ آنکھیں بند کر لیں۔
 ”اندر عورتوں کو بھی بھیج دو کھانا..... ارے شرفو! پانی کے دو جگ تو پکڑ..... اب وہ بھی کیا جھومر ہی لائے گا۔“ باہر گلی میں جھومر بلند آواز میں ختم کے بعد بول رہی تھی۔

جھومر باہر گلی سے رات میں چاول ڈالے پھرتی سے بار بار اندر باہر آ جا رہا تھا۔ سفید چادر اب چاولوں کی پلیٹوں سے باہر گرنے والے دانوں سے بھر رہی تھی..... اُس میں بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ کچھ چھوٹے بچوں کے مٹی سے بھرے پیروں کے نشان بھی نظر آرہے تھے اور جگہ جگہ گلاسوں سے جھلکنے والا پانی بھی۔ مومنہ سلطان کا گھر اس وقت شور سے گونج رہا تھا۔ رات میں بریانی کے اندر پڑی بوٹیوں کو چھیننے کے لیے ایک کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ صرف مومنہ سلطان اور اقصیٰ تھیں جو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی تھیں..... اور ثریا جو چادر کے دوسرے کنارے پر کچھ عورتوں کے بیچ بیٹھی تھی۔

”تو بھی کھانا کھالے جھومر۔“ کسی نے گزرتے ہوئے جھومر سے کہا تھا۔
 ”جھومر شادی والے گھر سے کھاتی ہے، ماتم والے گھر سے نہیں..... بے شرم ہے جھومر، بے حس نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر اُسی طرح گزر گئی تھی۔
 ”لو نخر ادیکھو بیڑے کا۔“ کسی اور نے تیسرے کہا تھا اور عورتوں نے چاول کے نوالے منہ میں ڈالتے ہوئے

تنبہ لگایا۔
 آدھ گھنٹے بعد وہاں کوئی نہیں رہ گیا۔ بس وہی تین لوگ اُس چادر پر بیٹھے ہوئے تھے اُسی طرح گم صم اور سفید چادر جواب پوری طرح داغ دار اور برتنوں، ہڈیوں اور چاولوں سے اتنی ہوئی تھی۔
 مومنہ نے اقصیٰ کے ساتھ مل کر وہ چادر اٹھائی پھر حن کی صفائی کی۔ سلطان اب بھی کہیں باہر تھا۔ ثریا اندر کمرے میں۔
 ”کل سے شوٹ ہے میری..... دو تین دن نہیں آ پاؤں گی پھر چکر لگاؤں گی۔“ اقصیٰ نے داؤد کے آنے پر مومنہ سے کہا۔

”تم نے پہلے بھی بہت وقت دیا اب بھی.....“
 اقصیٰ نے اُس کی بات کاٹی۔ ”اب شکریہ ادا مت کرنا..... یہ وقت نہیں ہے شکریہ کا۔“
 ”نہیں، شکریہ ادا نہیں کروں گی..... کروں بھی تو کس کس چیز کے لیے کروں۔“ مومنہ بڑبڑاتی تھی۔ اقصیٰ نے بات بدل دی۔

”میں نکلتی ہوں پھر۔“
 وہ اُس سے گلے ملی اور پھر باہر نکل گئی۔ جھومر کھلے دروازے سے اُسی وقت اندر آیا تھا اور اُس نے مومنہ کو کرسی اٹھانے سے روکا۔
 ”چھوڑ دیں باجی! جھومر اٹھاتی ہے..... آپ کا کام نہیں ہے۔“ اُس نے بھرتی سے اُس کے ہاتھ سے کرسی پکڑی۔

”بڑی مشکل میں کام آئے ہمارے..... کھانا لانا تمہاری ذمہ داری نہیں تھی جھومر۔“ مومنہ نے اُس سے کہا۔
 ”مجھے شرمندہ نہ کریں باجی..... مجھے بس ایک فکر تھی کھانا لاتے ہوئے۔“
 ”کیا؟“ مومنہ نے پوچھا۔ جھومر نے کچھ نادم انداز میں سر جھکا کر نظر ملائے بغیر کہا۔
 ”حرام کے پیسوں سے لائی تھی۔ قبول ہو جائے گی نا۔“ مومنہ اُس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی پھر اُس نے مدھم

آواز میں کہا۔

”جھومر کرسی اٹھا کر مزید کچھ کپے بغیر گھر سے نکل گیا۔

مومن گھر میں رُکے بغیر جھانگیر کے کمرے میں آئی۔ ثریا وہاں نہیں تھی۔ جھانگیر کا کمرہ ویسا ہی تھا، اُس کا بستر ویسے ہی سلوٹ زد تھا۔ بستر کے سرہانے پڑی ہوئی دو ایسوں کا ڈھیر بھی وہیں کا وہیں تھا۔ اُس کے سارے دیوار ڈز، فریڈ، قہار اور اخبار کی تراشے۔ سب کچھ وہیں کا وہیں تھا۔ صرف وہ نہیں تھا۔

وہ سیدھا اُس کے بستر پر گئی اور چت لیٹ گئی۔ اُس کی چادر اُس نے سر پر تان لی تھی۔ کسی نے اُس کی چادر کھینچ کر کہا۔

”آیا۔ آیا۔“

وہ جھنجھٹا کر بولی۔

”کیا ہے تمہیں، سونے بھی نہیں دیتے۔“

”میرے بستر پر کیوں سو رہی ہو؟“ وہ غصا ہوا تھا۔

”سو رہی ہوں، بس اور اب میرا دماغ مت کھانا۔ گھٹنے بعد آنا۔۔۔۔۔ بازار چلیں گے۔“

”جو چیز تمہارے پاس ہے، میں نے وہ کیسے کھاؤں گا میں، البتہ میرے پاس ہے دماغ۔۔۔۔۔ جواب اماں، ابا اور تم نے چاٹ لیا ہے۔“ جھانگیر نے جواب دیا کہا تھا۔

”جھانگیر! اب اگر میں اُنھی تا تو سیدھا چٹل بروں گی تمہیں۔“

مومن نے چادر اُسی طرح تانے اُس سے کہا تھا۔

”چٹل تو میں پہلے ہی پھینک آیا ہوں۔۔۔۔۔ اتنا بے وقوف تو نہیں کہ چٹل تمہارے پاس ہو تو میں پاس آؤں اور

ایسا باتیں کر دوں۔“ مومن تب تک غنودگی میں جا چکی تھی۔ کسی نے اُس کی چادر کو زور سے کھینچا۔ وہ ہڑبڑا کر اُنھی۔ وہ ثریا تھی جو اُس کی چادر کھینچ رہی تھی۔

”کیا ہوا اماں؟“ مومن نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ایسے مت لیٹ چادر لے کر۔“ ثریا نے اتنے دنوں میں پہلی بار جھانگیر سے ہٹ کر کوئی جملہ کہا تھا اُس

سے اور پھر رُک کے بغیر چلی گئی تھی۔ مومن اُس خواب سے باہر آگئی تھی جس میں جھانگیر بھی اُس کے ساتھ تھا۔ فون پھر قہر خرانے لگا تھا اور مومن سلطان اُس دنیا سے بھاگنا چاہتی تھی جو اُس فون کے ذریعے اُس تک آنا چاہتی تھی۔

کسی آکٹوپس کی طرح اُس کو اپنے شکبے میں لپٹا چاہتی تھی۔

ہم ہم ہم

قلب مومن کو نیند میں کسی آواز نے جگا دیا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں کھولے وہ نیم تاریکی میں آواز کے ماخذ کو

بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا اور اُس کے کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور اُس خاموشی میں ہلکے ہلکے دھن سے جیسے کوئی سسکی اُبھرتی پھر خاموشی چھا جاتی۔ غنودگی کے عالم میں وہ اُن سسکیوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا

اور پھر یک دم وہ پہچان گیا اور پہچاننے کے ساتھ ہی وہ جیسے کرنت کھا کر اٹھا تھا۔ وہ دادا کی آواز تھی۔

مکمل پھینکتے ہوئے بستر سے نکل کر ننگے پاؤں وہ اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ تقریباً بھاگتے ہوئے اُس نے

دنگ دیے بغیر دادا کے کمرے کا دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں صرف ایک بیڈ سائیز ٹیبل لیٹ آں تھا اور اس زرد روشنی میں عبدالعلی کمرے کے فرش پر بچے مصلے پر سر بسجود ہنگیوں سے رو رہے تھے۔

قلب مومن کا خیال تھا۔ اُن کی طبیعت خراب تھی۔ مگر وہ ٹھیک تھے۔ صرف رو رہے تھے۔۔۔۔۔ ہا آواز، ہنگیوں سے۔۔۔۔۔ دیوار پر لٹکے کلاک پر قلب مومن نے پہلی بار وقت دیکھا۔ وہاں پر تین بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ وہ

یقیناً تہجد پڑھنے کے لیے جاگے تھے اور اب تہجد پڑھنے کے دوران کسی بات پر روئے تھے۔ لہجے بھر کے لیے مومن کو خیال آیا وہ اسی خاموشی سے وہاں سے چلا جائے۔ وہ عبدالعلی اور اُن کے رب کا معاملہ تھا۔ وہ اس رازداری میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتا۔ اُس نے دادا کی زبان پر اپنا نام سنا تھا۔ قلب مومن کو لگا اُس نے غلط سنا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ اُنہیں دیکھتا رہا۔ وہ دوبارہ اُسی کا نام لے رہے تھے کچھ کہہ رہے تھے اور جو کچھ کہہ رہے تھے۔ قلب مومن نے سن لیا تھا۔

”اے اللہ! میرے مومن کو سیدھا راستہ دکھا۔ اُسے ہدایت دے۔“ وہ روتے ہوئے بار بار یہ جملہ پنا کر رہے تھے۔ قلب مومن دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے پہلے پانی ہوا تھا پھر آگ..... دادا پر ایسا فحشہ اسے سالوں بعد آیا تھا۔ وہ اللہ سے اُس کی شکایت کر رہے تھے، دُعا نہیں..... اُن کو کیا حق تھا یہ کرنے کا..... وہ ہیں کھڑا بے حد غفلت سے اُنہیں دیکھتا رہا..... بے حد غفلت سے..... پھر وہ پلٹ کر دیوار کے ساتھ پڑے اُس صوف پر بیٹھ گیا تھا جو دادا کی پشت پر تھا۔

”میرے مومن کو صراطِ مستقیم پر چلا..... اُن لوگوں کے راستے پر جن سے تو راضی ہو انہ کہ اُن لوگوں کے راستے پر جن پر تیرا عذاب نازل ہوا۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

زمین پر سجدے میں اُن کا وجود لرز رہا تھا اور قلب مومن کا سینہ جیسے اُن کے الفاظ نے چیر دیا تھا۔ اُس کی ادا پر کاری ضرب لگی تھی۔ دادا کو یہ حق نہیں تھا۔ وہ اُسے رات کے اس پہر اللہ کی عدالت میں کھڑا کر دیتے۔ اُن کے سجدے میں گڑگڑاتے وجود کو دیکھ کر صوف پر ٹائیں پھیلائے بیٹھے قلب مومن کو سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی..... شراب کی..... یا کسی ڈرنک کی جو چند لمحوں کے اندر اُسے اس احساس سے مبرا کر دیتی جس کا شکار وہ اس وقت ہو رہا تھا۔

عبدالعلی بڑی دیر گڑگڑاتے رہے تھے اور پھر اُنھہ کر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے اُس وقت کمرے میں قلب مومن کی موجودگی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دعا کر رہے تھے اور جب انہوں نے دعا ختم کی تو وہ قلب مومن کی بھاری آواز سے جیسے ہڑبڑا کر چوٹے تھے۔

”دادا! آپ کے نزدیک سیدھا راستہ ہے کیا، جس پر میں نہیں ہوں؟“

اس کا لہجہ ٹھنڈا، آواز سنجیدہ تھی۔ عبدالعلی کچھ دیر وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے پھر وہ اُنھہ کر کھڑے ہو گئے اور تب انہوں نے قلب مومن کو پہلی بار دیکھا۔ وہ اب صوف پر ٹائنگ پر ٹائنگ رکھے بیٹھا تھا اور اُس نے اُن کے کھڑا ہونے پر صوف کے ساتھ سائیڈ ٹیبل لیپ کو اُن کر دیا تھا۔ کمرے کی روشنی میں ایک دم اضافہ ہوا۔ عبدالعلی نے اُس روشنی میں قلب مومن کا چہرہ دیکھا۔ وہ مومن نہیں ملے تھا اور اُن سے کہہ رہا تھا۔

”بابا..... آپ کے نزدیک سیدھا راستہ ہے کیا؟“ عبدالعلی بے اختیار آگے بڑھے تھے اور انہوں نے کسی معمولی حیرتہ انداز میں اُس کا چہرہ چھوتے ہوئے کہا۔

”ٹہ۔“ مومن نے حیرانی سے اپنے چہرے کو چھوا۔ اُن کا ہاتھ اور اُس کی انگلیاں دیکھیں اور پھر اُس نے عبدالعلی سے کہا۔

”دادا! میں قلب مومن ہوں۔“ عبدالعلی ایک دم ہڑبڑائے یوں جیسے کسی طلسم سے باہر آئے تھے۔

”کیا ہوتا ہے سیدھا راستہ؟“ مومن نے دوبارہ اُن سے پوچھا تھا۔ وہ اُسے دیکھتے رہے پھر دم آواز میں بولے۔

”فلاح کا راستہ۔“

قلب مومن ایک دم اُنھہ کر کھڑا ہوا۔ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

”کیا ہوتی ہے فلاح؟ کامیابی نا؟ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ کیا ہوتی ہے فلاح..... کیا ہوتی ہے کامیابی۔“
 اُس نے ایک دم اُن کا ہاتھ پکڑا اور انہیں ساتھ لیے لاؤنج میں آگیا۔
 دیوار پر لگی اپنی ٹرافیوں اور ایوارڈز سے بھرے ریکس کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے دادا سے کہا۔ ”یہ ہے فلاح۔“ پھر وہ سینئر ٹیبل پر بڑے اُن میگزینز اور نیوز سپرز کو باری باری انہیں دکھاتے ہوئے پھینکنے لگا۔ ”یہ ہے فلاح دادا۔“ آخری میگزین ٹیبل پر واپس پھینکتے ہوئے اُس نے دادا سے کہا۔

”یہ گھر دیکھ رہے ہیں..... گلاس پینٹ ہاؤس..... شہر کا مہنگا ترین علاقہ ہے یہ..... چند سالوں میں بنایا ہے میں نے..... چند سالوں میں..... یہ پورا ملک مجھے جانتا اور پہچانتا ہے..... ایکٹرز، ایکٹریز میرے ساتھ کام کرنے کے لیے منتیں کرتی ہیں..... براڈ ز میرے ایک اشارے پر آنکھیں بند کر کے میرے پرائیکٹس پر پیسہ پھینک دیتے ہیں..... یہ فلاح ہے..... یہ سیدھا راستہ ہے۔“

وہ دیوار پر لگے سپر اسٹارز کے ساتھ فریم تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ یوں جیسے اُس پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اور دادا وہاں کھڑے یوں اُسے دیکھ رہے تھے جیسے سرکس میں مداری اُس سدھائے ہوئے جانور کو دیکھ رہا ہو جو یک دم اُٹھنے سے اُکھڑ گیا ہو۔

”جو تم کر رہے ہو..... وہ بے حیائی ہے..... بے حیائی میں سب ملتا ہے..... سب..... ایسے ہی گھر..... وہی گاڑیاں جو تم چلاتے ہو۔“ وہ مدھم آواز میں کوڑے برسا رہے تھے۔ ٹھنڈی، میٹھی آواز قلبِ مومن کے نظریہ کامیابی کے پرچے اُڑا رہی تھی۔

”وہ براڈ ز جو تم پر پیسہ لگا رہے ہیں۔ وہ تم پر پیسہ نہیں لگا رہے۔ اُس بے حیائی پر لگا رہے ہیں جسے تم پر دموٹ کرتے ہو..... تم جسم دکھاتے ہو اور جسم کی پرستش کرواتے ہو..... دُنیا تمہارا طواف کیوں نہ کرے مومن..... کیوں نہ سر پر بٹھائے تمہیں۔“

قلبِ مومن کا چہرہ کس رنگ کا ہوا تھا وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا..... سرخ..... زرد..... سفید..... وہ جو بھی رنگت تھی۔ نارمل رنگت نہیں رہی تھی۔

”آپ بہت زیادتی کر رہے ہیں دادا..... میرے کام کو حقیر اور چھوٹا کہہ کر..... آپ دراصل مجھ سے حسد کرتے ہیں..... آپ نے آخر کیا کمایا کیلی گرائی کو اپنی زندگی کے ستر سال دے کر..... میں آپ سے آدھی عمر کا بھی نہیں ہوں مگر میری کامیابی کا اسکیل دیکھیں۔ دُنیا کی ہر آسائش ہے میرے پاس..... ناموری ہے..... لاکھوں کروڑوں لوگ فین ہیں میرے۔ جان قربان کرنے والے دوست ہیں..... آپ کے پاس کیا ہے؟“

وہ بدتمیزی کی حد تک صاف گوئی پر اُتر ا ہوا تھا۔ وہ اپنا رخ اور رنگ دکھا رہا تھا عبدالعلی کو جو اس سے پہلے صرف دنیا نے دیکھا تھا۔

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم یہی سننا چاہتے ہو نا مجھ سے؟ میرے پاس تمہاری طرح کریڈٹ کارڈز سے بھرا ہوا والٹ نہیں ہے۔ یہ اسمارٹ فون بھی نہیں ہے جو تمہارے پاس ہے۔ دُنیاوی اٹاٹھے صفر ہیں..... کروڑوں لوگوں کی چاہت بھی نہیں ہے میرے پاس..... نہ مجھے تمہاری دُنیا کے نامور لوگ جانتے ہیں مگر قلبِ مومن! مجھے اللہ جانتا اور پہچانتا ہے..... کیا کہیں جانتا ہے اللہ۔“ قلبِ مومن کو بت بنا دیا تھا انہوں نے آگ کے گولے سے..... وہ سارے گت کھڑا اُن کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

”یہ آپ کا غرور ہے۔“
 ”یہ میرا ایمان ہے۔“ انہوں نے جوابا کہا۔
 ”سولہ سولہ کہنے اللہ کا نام لکھوں اور یہ خوش گمانی بھی نہ رکھوں کہ وہ مجھے پہچانتا ہے..... تم کو غرور لگتا ہے،

غرور ہی تھی۔ ”ابہوں نے پیسے اے بچے کو ملے اور لے چکے کہا تھا۔

”میرا آپ سے بات نہیں کر سکتا۔ آپ واپس چلے جائیں۔ میں اپنی زندگی، اپنی امانت آپ کے ہاتھ میں رکھتی ہوں۔ آپ کی امانت میں نہیں آؤں گا۔“ وہ بڑی ٹھٹھکی سے کہتے ہوئے کمرے سے اٹھ گیا تھا۔

عہد اٹھلے کھڑے ہو رہے تھے۔ انہیں ملے پاؤں آیا تھا۔ اس نے بھی ایک ہمارا پیسے ہی ضد کی تھی ان سے۔ اس نے ایک ہی ہمارا اور ایسے ہی پاٹ کر کیا تھا پھر وہ ہمارے پاس آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

برآمدے میں بڑا سلطان کا دہشتی ہا کس زندگی میں پہلی بار گرد آلود دیکھا تھا مومنہ نے۔ اس نے وہ بچے کے پاس سے اس مٹی کو پونچھنے کی کوشش کی پھر اسے اٹھا کر اندر کرے میں لے آئی۔ سلطان اپنے بستر میں منہ سر پٹے پر رکھا تھا۔

”ابا..... ابا.....“ اس کے پاس کھڑے ہو کر دہشتی ہا کس ہاتھ میں لیے مومنہ نے اسے پکارا تھا۔ سلطان نے چادر ہٹا کر اسے دیکھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال بے تکلم۔ آنکھیں سرخ۔ وہ مٹی جو اس دہشتی ہا کس ہا پڑی ہوئی تھی، مومنہ کو اپنے ہا کے چہرے پر بھی دکھی..... وہ دونوں میں بوڑھا ہوا تھا۔

”آپ کا دہشتی ہا کس لائی ہوں۔“ اس نے لہجہ جتنی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب کمرے کے باقی دونوں وجودوں کو جیسے فرسٹ اینڈ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلطان نے اس کے ہاتھ سے دہشتی ہا کس چپ چاپ لے لیا۔

”مٹی پڑی ہوئی تھی ابا۔“ مومنہ نے جیسے اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی۔

”مٹی تو پتا نہیں کس کس چیز پر پڑی ہے۔“ وہ بڑبڑایا تھا اور اس کی بڑبڑاہٹ نے مومنہ کو جب کرادیا۔

”اتنے دین ہو گئے، آپ نے حسن جہاں کی بات نہیں کی۔“ اس کو یک دم وہ موضوع یاد آیا جس پر وہ ہا ب سے بات کر سکتی تھی۔

”حسن جہاں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”حسن جہاں بھی تو مر گئی تھی۔“ وہ یک دم کہہ کر رونے لگا، مومنہ کی ساری کوششوں پر پانی پھیرنے ہوئے۔ وہ وہاں رُک نہیں پانی۔ ہا کو اس طرح روتے دیکھنا بڑا مشکل کام تھا۔

باہر برآمدے میں ثریا اپنے کندھے کو ہاتھ سے دباتی، تھکی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

”کندھے کو کیا ہوا اماں؟“ مومنہ کو تشویش ہوئی۔

”دُکھ رہا ہے۔“ ثریا نے کہا۔

”میں دبا دوں، ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں؟“ مومنہ نے اس کے کندھے کو ہلکا سا دباتے ہوئے کہا۔

”نہیں، خود ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا تو کچھ اور دُکھنا شروع ہو جائے گا۔ کس کس چیز کو دبواتی پھر دوں۔“ اس نے عجیب سی بے زاری سے کہا پھر اسی سانس میں اس سے پھر مخاطب ہوئی۔

”میں سوچ رہی تھی تم امریکہ نہ جاؤ۔“ اس کا اشارہ فلم کی طرف تھا۔

”کیوں اماں؟“ اس نے پوچھا۔

”بس دل گھبراتا ہے۔“

”ایک مہینے کی تو بات ہے۔“ مومنہ نے تسلی دی۔ ”فلم رہنے دیتیں..... اب تو ضرورت بھی نہیں۔“

”والہ برونی تو نی دی سے بھی چل جاتی۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”قرض ہے سر پر اماں۔“ مومنہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ پتا نہیں..... کوئی کام ڈھونڈنی ہوں میں..... جہاں تکیر کے ابا سے کہتی ہوں میں۔“ اس

نے کڑ بڑائے ہوئے انداز میں کہا اور پھر یک دم جیسے اندر سے سلطان کے رونے کی آواز سنی۔
 ”ان کو کیا ہوا؟“ وہ بے چین ہوئی۔

”ایک ہی تو صبر ہے اماں۔“ مومنہ نے مدہم آواز میں کہا۔
 شہزاد نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر پانی اُس کی آنکھوں میں اُلٹا۔ دوپٹے سے چہرہ اٹھا پٹتے ہوئے اُس نے کہا۔
 ”میں دیکھوں ذرا۔“ وہ کہہ کر اندر چلی گئی تھی۔ مومنہ وہیں کھڑی رہی۔
 ”پتا نہیں میں اتنی بے حس کیسے ہو گئی ہوں۔ میرے جیسے کے آنسو بھی اماں اور اماں ہی بہائیں گے۔“ ہمار صحن
 میں پڑے اُس کے فون نے جیسے اُس کو چوکایا۔

”یار! فون تو اٹینڈ کر لو اُس ایجنٹ کا..... داؤد کو پریشان کرنا شروع کر دیا ہے اُس نے کالز کر کے۔“ فون
 پراقتی تھی اور اُس نے اُس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔
 ”ہاں بس لے رہی ہوں کال۔“ اُس نے اقصیٰ کو ٹالا۔

”پاسپورٹ چاہیے انہیں تمہارا فوراً..... ویزہ اپلائی کرنا ہے۔“ اقصیٰ نے اُس سے کہا۔
 ”وہ بنانا ہے ابھی۔“ مومنہ نے جوابا کہا۔

”کل چلو میرے ساتھ یہ کام تو پٹناتے ہیں۔“ اقصیٰ نے حل پیش کیا پھر یک دم کہا۔ ”تم فلم چھوڑنے کا تو
 نہیں سوچ رہی تھیں؟“
 ”یہ آپشن نہیں ہے میرے پاس، چاہوں بھی تو..... ایڈوانس کی رقم استعمال ہو گئی ہے۔“ مومنہ نے تھکے
 ہوئے لہجے میں کہا۔

”ایسے مت کہو بار..... لائف ٹائم ایر چونیٹی (موقع) ہے..... تمہیں یاد ہے کتنی خواہش تھی تمہاری کہ یہ فلم
 تمہیں مل جائے۔“ اقصیٰ نے جیسے اُسے جوش دلانے کی کوشش کی۔
 ”جہاں تکیر وجہ تھی“ تب۔“ اُس نے مدہم آواز میں کہا۔
 ”تمہیں کیا ہو گیا ہے مومنہ؟“ اقصیٰ نے تشویش سے کہا تھا۔

”میں سو نہیں پا رہی..... دل چاہتا ہے کئی دن کے لیے سو جاؤں مگر جب سونے کے لیے لیٹی ہوں تو اُن
 سب کے چہرے آنکھوں کے سامنے آنے شروع ہو جاتے ہیں جن سے قرض لیا ہے۔“ اُس نے بالآخر جیسے اُس
 سے دل کی بات شیر کر لی۔

”اس مگنی کے ہر گھر سے قرض لے رکھا ہے ہم نے..... کچھ پہلے لیا تھا..... کچھ اب..... اور پھر جہاں تکیر کو
 ہسپتال سے لانے کے لیے..... وہ جو کہتے ہیں نا بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ مجھے آج پتا چلا ہے وہ کیسے ہوتا
 ہے۔“ دور نجدگی سے کہہ رہی تھی۔
 ”دماغ پر مت سوار کرو یہ سب کچھ..... اُتر جائے گا سارا قرض..... کون سا ابھی کوئی مانگ رہا ہے۔“ اقصیٰ
 نے تسلی دی۔

”مانگ رہے ہیں..... یہ غریبوں کا محلہ ہے اقصیٰ! ان سب کو ضرورت ہے اپنے پیسوں کی..... ابھی
 ہمدردی میں نرمی سے تقاضا کر رہے ہیں اور پھر سختی سے کریں گے۔“ مومنہ نے کہا۔
 ”تم اتنی حساس مت ہو مومنہ! ردو لو..... غبار نکالو اپنے اندر سے۔“ وہ اس کے علاوہ اور کوئی حل پیش
 نہیں کر سکتی تھی۔ جانتی تھی مومنہ ٹھیک کہہ رہی۔

”مجھے رونا نہیں آتا اقصیٰ..... میرے گھر میں دو لوگ پہلے ہی دن رات روتے ہیں..... میں کیسے
 روؤں..... میرے سامنے ضرورتوں کا پہاڑ کھڑا ہے اور میرے ہاتھ ہیر کام نہیں کر رہے..... اس کو سر کروں تو

کیسے کروں۔“ وہ اُس سے کہہ رہی تھی۔ صرف اُس سے یہ سب کہہ سکتی تھی۔
 ”یہ فلم کرلو مومنہ! بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“ اُنہی نے اُسے جواباً کہا۔ وہ چپ چاپ اُس کی باتیں سنتی رہی۔

☆☆☆

دورات دیر سے گھر آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ دادا سو چکے ہوں گے۔ شکور نے دروازہ کھولا۔
 ”کھانا دے دو مجھے۔“ وہ اتفاقاً اُس رات کھانا نہیں کھا۔ کاتھا درنہ اتنی رات کو ہمیشہ کھانا کھا کر گھر آتا تھا۔
 ”ہا۔۔۔۔۔ آپ کھانا کھائیں گے۔۔۔۔۔ وہ تو میں نے بتایا ہی نہیں۔“ شکور نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 ”کیوں دادا کو نہیں دیا؟“ مومن نے پوچھا تھا۔
 ”دادا تو چلے گئے۔“ شکور نے اُسی سانس میں کہا۔ مومن اندر جاتے جاتے ٹھٹھک گیا۔
 ”کیا مطلب کہاں چلے گئے؟“

”واپس ترکی۔۔۔۔۔ اُن کی فلائٹ تھی آج۔۔۔۔۔ آپ کو یہ بھی نہیں پتا؟“ شکور نے اُس کے چہرے سے جیسے اندازہ لگایا۔
 ”تم نے مجھے نہیں بتایا۔“ مومن کو اس کے سوا کوئی جواب نہیں سوچ سکا تھا۔ ایک عجیب سی پشیمانی نے اُسے آن گھیرا تھا۔

”مجھے لگا، آپ کو خود پتا ہوگا۔ مجھے کہا ٹیکسی منگوا دو۔۔۔۔۔ میں نے فٹ سے کریم منگوائی ایپ ڈاؤن لوڈ کر رکھی تھی۔ کرولا پر بھیجا ہے دادا جی کو۔“ شکور نے فخریہ مومن کو بتایا۔ مومن کھڑا اُسے دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔
 ”اب بھی کھانا کھائیں گے؟“ شکور نے پیچھے سے آواز دی۔
 ”نہیں۔“ مومن نے کہا۔
 ”شکر ہے کھانے کے چکر میں شورہ جانا تھا میرا۔“ شکور کے سر سے جیسے بلا ٹلی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر دادا کے کمرے میں آ گیا۔ دروازہ بند کر کے اُس نے لائٹ آن کی۔ کمرہ یک دم روشن ہوا۔ وہاں ایک عجیب سا سکون تھا۔ فرش پر وہ مصیبتی ویسے ہی بچھا ہوا تھا بس اُس کا ایک کونہ مڑا ہوا تھا۔ اُس کی سالگرہ پر دی جانے والی یہی گرائی دیوار پر لگی ہوئی تھی۔
 اَنَّ اللہ مَعَ الْعَٰمِلِیْنَ۔

وہ پچھلے چھ سالوں سے ہر سالگرہ پر اُسے کوئی نہ کوئی آیت خطاطی کر کے دے رہے تھے۔ وہ انہیں ایک نظر دیکھ کر رکھ دیتا تھا۔ سوائے اُس پہلی گرائی کے جو اُس نے لاؤنج میں لگا رکھی تھی۔ بہت دیر وہاں کھڑا وہ اُس آیت کو دیکھتا رہا پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے وہی سین چلنے لگا تھا۔ رات کے اُس پچھلے پہر دادا کا اُس مصیبتی پر جدے میں روتا۔

”اے اللہ! میرے مومن کو سیدھا راستہ دکھا۔۔۔۔۔ اسے صراطِ مستقیم پر چلا۔“
 قلب مومن دیوار پر لگے اُس فریم کے سامنے سے ہٹاؤں جیسے یہ سب وہ مرنے سے جھٹکتا جا رہا تھا۔ کان بند کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کمرے میں آتے ہی دادا کی ساری باتیں گونج بن کر اُس کے گرد پھرنے لگی تھیں۔
 ”تم خوش ہو؟“
 ”بہت بہت زیادہ۔۔۔۔۔ بے تماشاً۔“

”کیتے کیوں نہیں۔“

قلب مومن نے لائٹ آف کر دی۔ وہ اس آواز کی بازگشت سے فرار چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ اُس رات ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اُس سے ناراض ہو کر گئے تھے یا شاید پہلی بار اُس نے اُن سے اتنے سخت لفظ بولے تھے۔

ناشتہ کی میز پر بھی اُس کا دھیان بار بار اُن کی طرف جاتا رہا۔ وہ اخبار دیکھ رہا تھا اور شکور اسٹور روم سے وہ سارے مجسمے نکال نکال کر دوبارہ لاؤنج میں اُنہیں ان کی جگہوں پر رکھتے ہوئے جھاڑ پونچھ کر رہا تھا۔

”دادا جی تھے تو صفائی کا کام کتنا کم ہو گیا تھا۔ ساری چیزیں اسٹور میں پڑی رہتی تھیں۔ اب پھر جھاڑ پونچھ ہوگی۔“ شکور ایک مجسمہ کنسول پر رکھتے ہوئے کچھ بے زاری سے بڑبڑایا اور پھر اسی بڑبڑاہٹ میں مومن نے اُسے کہتے سنا۔

”پتا نہیں کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہتے تھے۔“

مومن متوجہ ہوا۔ ”کون؟“

”دادا جی..... کونوں دیواروں میں..... اور آپ پر بھی تو پھونکتے تھے۔“ شکور نے فوراً بتایا۔

”مجھ پر؟“ مومن چونکا۔

”ہاں..... دوبار تو میں نے خود اُنہیں دیکھا..... آپ کو جگانے جاتے تھے اور جگائے بغیر آ جاتے تھے۔ دادا جی بڑا پیار کرتے تھے آپ سے..... مومن ہیں بالکل..... مطلب اصلی والے..... آپ کا تو صرف نام ہے۔“ شکور نے روانی میں جو کہا تھا۔ اُسے شاید خود بھی اپنے جملے کی گہرائی اور اثر کا اندازہ نہیں تھا مگر مومن کو اُس کے آخری جملے نے جیسے کچھ چھو یا تھا مگر شکور سے وہ کیا بحث کرتا۔

”تم سے میرے بارے میں کچھ پوچھتے تھے؟“

”کیا؟“ مومن کے سوال پر شکور چونکا۔

”کچھ بھی؟“ مومن خود بھی نہیں جان پایا وہ کس چیز کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں، پوچھتے تھے کہ آپ کب آئیں گے جب آپ رات کو لیٹ ہوتے تھے تو۔“ شکور نے روانی سے کہا۔ مومن کو جیسے تسلی نہیں ہوئی۔

”کسی اور چیز کی بات کر رہا ہوں میں..... میرے بارے میں کچھ اور پوچھتے تھے؟ لڑکیوں سے دوستی وغیرہ کے بارے میں؟ یا میرے دوستوں کے بارے میں؟“ مومن نے بالآخر کھل کر کہا۔

”نہیں جی۔ دادا جی کو تو سوال کرنے کی عادت ہی نہیں تھی..... یہ سب سے اچھی عادت ہے اُن کی..... بس میری ہی باتیں سنتے رہتے تھے ہر وقت اور آپ کو تو پتا ہے میں آپ کے بارے میں کتنی باتیں ہی نہیں کرتا۔“ شکور نے بے حد احتیاط انداز میں اُس سے کہا تھا، وہ اُس کے سوالوں سے کچھ ڈرا تھا۔

مومن نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ چپ چاپ چائے کے اُس کپ کو دیکھتا رہا جس میں وہ چائے پی رہا تھا اور جو ابھی آدھا بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ اُسی طرح اُٹھ کر چلا گیا۔ اُسے جاتے دیکھ کر شکور نے معنی خیز انداز میں تبصرہ کیا۔

”لگتا ہے، کچھ تیار ہے ہیں۔“

☆☆☆

”ہیلو ٹینا!“ ٹینا اُس وقت ضوئی کے ساتھ اُس کی گاڑی میں تھی جب ضوئی کے فون پر ٹینا کا نام چکا تھا۔
”ہائے ضوئی..... آپ کا انوٹیشن کارڈ تھا میرے پاس..... قلب مومن کی اگلی قلم کی اناؤٹسمنٹ کی

”ضوئی نے دھڑکتے دل کے ساتھ ٹیٹا کو اسٹیکر پر لیا تاکہ نیہا بھی اُس کی بات سن سکے۔
 ”تقریب ہے۔“ ضوئی نے لہجہ بے حد نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”اچھا تو کاسٹ فاسٹ ہوئی؟ کیا کاسٹ ہے؟“ ضوئی نے لہجہ بے حد نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”آپ کے لیے سر پرانز ہے۔ مومن خود ہی آپ سے بات کریں گے لیکن آپ کا آنا لازمی ہے۔“ ٹیٹا نے
 ہنستے ہوئے کہا۔ ضوئی نے بے یقینی سے نیہا کو دیکھا۔ اُس نے مکا ہوا میں جوش میں لہرایا تھا۔
 ”شیور..... شیور..... آپ والٹس ایپ بھی کر دیں آئی دل بی دیئر۔“ ٹیٹا نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔
 ”میں ابھی کر رہی ہوں۔ منفرم کر کے ادا کر دیں۔“ ٹیٹا نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔
 ”وہو ہائی گاڈ۔ اس نے مجھے شامل کیا ہے۔“

اُس نے بے اختیار نیہا سے کہا تھا۔
 ”میں نے کیا کہا تھا تم سے۔“ نیہا نے فخریہ انداز میں اُس سے کہا۔ ”وہ مجھے انکار نہیں کر سکتا۔“ وہ ہنس رہی
 تھی۔ ”میں بہت ایکسائینڈ ہو رہی ہوں۔ تم اشار بننے جا رہے ہو۔ تمہاری وارڈ روم میں کروں گی۔“ نیہا نے
 اُسے گلے سے لگے لگتے ہوئے کہا۔
 ”بالکل ہائی لو۔ یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ہے۔ اپنا پہلا ایوارڈ تمہارے نام کروں گا میں۔“ ضوئی نے بھی
 جواباً اُس کے گلے پر بوسہ ثبت کیا تھا۔

”اور دوسرا؟“ نیہا نے بڑے باز سے پوچھا۔ ”دوسرا تیسرا..... سارے۔“ ضوئی نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔
 ”اب ٹیٹا مجھے کال کر رہی ہے انوائٹ کرنے کے لیے..... اور مجھے اتنے دنوں سے ٹینشن تھی کہ پتا نہیں کیا
 ہوگا کہیں بغیر مجھے انوائٹ کے ہی اناؤنسمنٹ نہ ہو جائے۔“
 اُس نے ضوئی سے بات کرتے ہوئے ٹیٹا کی کال لی تھی اور بڑے میٹھے لہجے میں اُس سے کہا تھا۔ ”ہائے ٹیٹا۔“

قلب مومن کہیں جانے کے لیے اپنے بیڈ روم میں تیار ہو رہا تھا۔ جب اُس کا سیل فون بجا۔ نیہا کا نام دیکھ
 کر اُس نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“
 اُس کی ’ہیلو‘ کا جواب نیہا نے بے حد رومانٹک انداز میں دیا۔
 ”آئی لو یو جانو!“ وہ جواباً مسکرایا۔
 ”آئی لو یو۔“

”یو آر اے بیٹ۔“ نیہا نے اپنی آواز کو مزید میٹھا کرتے ہوئے کہا۔
 ”لیس آئی نو۔“ مومن نے جواباً اُسی انداز میں کہا تھا۔ نیہا ہنسی۔
 ”مجھے پتا تھا تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔“
 ”تمہاری ایکسپیکشن پر پورا اترنا میرے لیے اعزاز ہے۔“ مومن نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”اوہ مومن! آئی لو یو۔“ نیہا نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔
 ”تم آر ہی ہو کل؟“ مومن نے اس بار موضوع بدلا۔
 ”خاہر ہے اپنی جان کا ایونٹ کیسے مَس کر سکتی ہوں۔“
 ”کون جان؟“ مومن نے عجیب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 ”تم۔ اور کون؟“ نیہا نے اُس کے انداز کو مذاق سمجھا۔
 ”تمہارے بغیر تو یہ ایونٹ ہونی نہیں سکتا نیہا تمہارے بغیر نہ ضوئی کے بغیر۔“ مومن کچھ سنجیدہ ہوا تھا۔
 ”مجھے پتا ہے سر پرانز دینا چاہتے ہو مگر..... آئی لو سر پرانز۔ ضوئی تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔“

”اور میں تم دونوں کو مایوس نہیں کروں گا۔“ مومن نے جواباً کہا۔

”مٹتے ہیں؟“ یہاں اس بار بڑے رومانٹک انداز میں اُس سے کہا۔ ”اتنے دن ہو گئے، تم کو مس کر رہی ہوں۔“

یہاں چوٹی۔ ”کہاں؟“

”ایک نئی گرل فرینڈ کے ساتھ۔“

یہاں نے قہقہہ لگایا۔ ”ہو ہی نہیں سکتا۔“

”مومن پر اتنا اعتماد اچھا نہیں۔“ مومن نے عجیب سے لہجہ میں کہا تھا۔

”اعتماد نہیں پیار ہے۔“ اُس نے بہت لاڈ سے کہا۔

”وہ بھی ناقابل اعتبار ہے۔“

”اچھا آج جو جا ہے کہہ لو۔ سب معاف ہے تمہیں۔ تم نے اتنی بڑی خوش خبری دی ہے مجھے۔“

یہاں نے اُس سے کہا تھا۔

”کل اس سے بھی بڑی دواں گا۔ بائے۔“

یہ پہلی بار تھا کہ فون مومن نے رکھا تھا اس طرح بات کرتے ہوئے۔ یہاں کو کچھ کھٹکا تھا۔ ناراض ہے۔ میں منالوں گی۔ اب اتنا خنر تو بنتا ہے اُس کا۔ اُس نے مطمئن انداز میں سوچا تھا۔ وہ مومن کو اچھی طرح جانتی تھی اور یہی اُس کی سب سے بڑی غلط فہمی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکی میں ترکی کے اُس علاقے میں اُس پاس کے گھنے بزرے کے درمیان وہ چھوٹا سا بے حد پرانا لکڑی کا دو منزلہ گھر کسی جگہ کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ اُس علاقے کے سب سے پرانے گھروں میں سے ایک تھا۔

عبدالعلی اُس رات کیونوں پر ایک نئی آیت پینٹ کرنے والے تھے اور اس وقت وہ وضو کر رہے تھے بے حد ٹھہر ٹھہر کر۔ یہ بھی اُن کی ایک روٹین تھی۔ وہ خطاطی ہمیشہ با وضو حالت میں کرتے تھے۔ فون کی پہلی گھنٹی پر اُنہیں جیسے پتا چل گیا تھا۔ فون کرنے والا کون تھا۔

”السلام علیکم۔“ قلب مومن کے لہجہ میں عجیب سی ندامت تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ عبدالعلی نے بے حد محبت سے کہا۔

”میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔“

”بالکل بھی نہیں۔ کیسے ہو تم؟“ انہوں نے مومن سے پوچھا۔

”ویسے کاویا ہوں یعنی بُرا۔۔۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟“ اُس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

”الحمد للہ۔“ عبدالعلی نے اُس کے جملے پر تبصرہ نہیں کیا۔

”آپ ناراض تو نہیں؟“ مومن نے فوراً ہی پوچھ لیا تھا۔

”نہیں۔“ عبدالعلی مسکرائے۔

”جانے سے پہلے مل کر نہیں گئے۔“ مومن نے گلہ کیا۔

”تم مصروف تھے۔“

”آپ کے لیے تو نہیں تھا۔ مجھے لگا، آپ ناراض ہو کر گئے ہیں۔“ وہ مدہم آواز میں کمرے میں ٹپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ناراض ہو کر کیوں جاتا۔“ عبدالعلی کا لہجہ ویسا ہی ملائم تھا۔

”میرا اور آپ کا آرگورٹ ہوا تھا..... شاید میں نے کچھ ایسا بھی کہہ دیا تھا جو میرا مطلب نہیں تھا..... اس لیے بس..... بدو میں سوچا تو..... بڑے.....“ قلب مومن اٹلاتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔ ساری زندگی اُس نے کبھی کسی سے معذرت تو درکنار اپنے رویے کی وضاحت بھی نہیں کی تھی تو انکنا نہ تو کیا کرتا۔

”مجھے غلطی ہے، آپ ناراض نہیں ہیں۔“ اُس نے جیسے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

”تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ مجھے غصہ آتا۔ غصہ دلانے والی ساری باتیں تو میں نے کی تھیں۔“

عبدالعلی اپنے کمرے میں ایزل اور کیوس رکھتے ہوئے ساتھ اُس سے بات بھی کر رہے تھے۔

”یہ تو آپ کھڑک کہہ رہے ہیں..... باتیں تو ساری غصہ دلانے والی ہی ہیں آپ کی..... اور زندگی میں پہلی بار کی ہیں آپ نے ایسی باتیں۔“ مومن نے فوراً ہی اتفاق کیا۔

”پھر تم نے سوچا اُن باتوں کے بارے میں؟“ انہوں نے پوچھا تھا۔

”بالکل بھی نہیں..... سوچنے والی کوئی بات بھی ہی نہیں اُن میں..... دادا! میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا۔“ میں اپنی لائف پر، اپنے کام پر، اپنی اخراجات پر بہت پر اؤ ڈھیل کرتا ہوں۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔

”کام غلط نہیں ہے۔ ست غلط ہے۔“ اُس نے عبدالعلی کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”دادا! میں آپ سے کہوں، آپ اپنا کام چھوڑ دیں..... آپ چھوڑیں گے؟ میں آپ سے کہوں آپ کا کام بُرا ہے۔ آپ مانیں گے؟ میرا اور آپ کا نظریاتی اختلاف ہے دادا۔ آپ زندگی کے بارے میں میرا نظریہ نہیں بدل سکتے۔“ وہ کہہ رہا تھا دو ٹوک انداز میں۔

”میں نہیں بدل سکتا مومن..... اللہ تو بدل سکتا ہے۔“ انہوں نے مدہم آواز میں کہہ کر جیسے اُس کی طنائیں کھینچی تھیں۔

”آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں دادا.....“ وہ زچ ہوا، اکھڑا، خفگی کے عالم میں اُس نے فون بند کر دیا تھا۔ عبدالعلی ایسے نہیں تھے جیسے اب ہو رہے تھے۔

”دادا کو کیا ہو گیا ہے.....“ اُس نے پریشانی سے سوچا تھا۔ مگر وہ اُن کی کسی بات پر غور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”انسان عمر کے اس حصے میں آ کر ایسا ہی ہو جاتا ہے..... مذہب، مذہب، نصیحتیں، نصیحتیں۔“ اپنی آستینوں کے بن کھولتے ہوئے اُس نے اُس بے قراری سے چمکارا حاصل کرنے کے لیے جیسے خود سے کہا۔ جو دادا کے کچھ جملوں نے اُسے دی تھی۔

☆☆☆☆

”ماسٹر صاحب! میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔“ اُس نو جوان لڑکے نے وہ ڈبہ کھولتے ہوئے ماسٹر ابراہیم سے کہا۔ وہ اُن کے پاس آنے والے بہت سے لڑکے لڑکیوں میں سے تھا۔

”کیا؟“ برآمدے میں بیٹھے اپنے کام میں مصروف ماسٹر ابراہیم نے کہا۔

”اگر یہ کام ہم نہ کر رہے ہوتے تو کیا ہوتا؟“

”تو پھر کوئی اور ہماری جگہ بیٹھا ہوتا یہ کام کرنے کے لیے..... اللہ کا کام ہے اور اللہ کے پاس اپنے کام کروانے کے لیے بندے بہت.....“ انہوں نے سکراتے ہوئے اُسے دیکھے بغیر کہا۔

”یہ تو ٹھیک کہا آپ نے.....“ اُس لڑکے نے بے اختیار تائید کی۔ ”لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو پتا کیسے چلتا ہے اس جگہ کا اور آپ کا؟ کہاں کہاں سے پرانے اور بوسیدہ قرآن پاک کے نسخے آرہے ہیں۔ آج جو ڈبہ آیا ہے، وہ چار سو روپے آیا ہے۔“ وہ اُس کا رٹن پر گے ایڈریس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا جسے اُس نے ابھی کھولا تھا۔

”اللہ خبر دیتا ہے..... اب لا کر بیٹایا ہے اس کام کے لیے تو کام بھی تو بیچے گا نا۔“ ماسٹر ابراہیم نے ہنسنے سے۔

”میں چلا ہوں اب..... آج ویزا کے لیے اپلائی کرنا تھا۔ دُعا کریں ویزا لگ جائے۔“ وہ لڑکا اپنا کام پٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ماسٹر ابراہیم نے اُسے دیکھے بغیر کہا۔
 ”اس سال نہیں لگے گا..... اس لیے پیسے ضائع نہ کرو..... اگلے سال جانا..... تب تک کوئی آجائے گا
 میرے پاس تمہاری جگہ۔“

لڑکا اُن کی بات پر گڑبڑا کر ہنسا۔ ”چلیں آپ نے تو بات ہی ختم کر دی۔ خدا حافظ۔“
 ”خدا حافظ۔“ ماسٹر ابراہیم نے اُسے جاتے ہوئے اور مومنہ کو آتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ بولے۔
 ”تم کہاں غائب ہو جاتی ہو مومنہ؟“ مومنہ نے جواباً مسکراتے ہوئے اُنہیں سلام کیا۔
 ”میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔“
 ”لاہور سے کب آئیں واپس؟“
 وہ اب برآمدے میں بیٹھ رہی تھی۔

”بڑے دن ہو گئے۔“ اُس نے کہا پھر اٹھ کر شریف سے اپنا قرآن اور کام نکال لائی۔
 ”سب ٹھیک رہا؟“ ماسٹر ابراہیم کو وہ بہت کمزور لگی۔
 ”ہاں۔ تجھے قلم مل گئی۔“ اُس نے دوبارہ فرش پر بیٹھتے ہوئے قرآن پاک کے وہ صفحے نکال لیے جن کی وہ
 درستی کے لیے خطاطی کر رہی تھی۔
 ”بہت مبارک ہو۔ بڑی خوشی کی خبر ہے یہ تو۔“ مومنہ نے جھک کر خالی کاغذ پر ایک لکیر کھینچی جیسے قلم کی
 نوک چیک کر رہی ہو۔

”پتا نہیں۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے رُکی۔
 ”جباتگیر کیسا ہے؟“ ماسٹر ابراہیم نے چند لمحوں بعد پوچھا۔
 ”وہ مر گیا۔“ اُس نے سر جھکائے جھکائے اُن کا چہرہ دیکھے بغیر کہا۔
 ”تم نے بتایا ہی نہیں، میں اُس کا جنازہ پڑھنے آتا۔“ مجھے بڑا افسوس ہوا ہے مومنہ بیٹی۔“ ماسٹر ابراہیم کو
 واقعی صدمہ ہوا تھا۔ وہ اُسی طرح بے تاثر چہرے کے ساتھ سر جھکائے کام کر رہی تھی۔
 ”چپ کیوں ہو؟“ انہوں نے اُس سے پوچھا۔ اُس کی خاموشی اُنہیں تکلیف دہ محسوس رہی تھی۔ وہ
 سر جھکائے بہت دیر کچھ حتیٰ رہی پھر اُس نے سر اٹھایا۔

شائع ہوئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق
 خوبصورت پمپائی
 مضبوط جلد
 آفٹ ہینچر

☆ فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل قیمت: 300/- روپے
 ☆ زرد موسم راحت جبیں قیمت: 1000/- روپے
 ☆ حساب دل رہنے دو غنیلہ عزیز قیمت: 400/- روپے

”آپ سے آزمائش ٹم ہونے کی دعا کی تھی۔ جہانگیر کے ٹم ہونے کی خواہش تو نہیں کی تھی۔“ اور اور بھرائی۔ ”آسو اُس کے گالوں پر بہنے لگے۔ اُس نے رگڑنے کی کوشش کی یوں جیسے اُنہیں پھپھانا پانا ہوتا ہو۔“

”جہانگیر ٹم ہو گیا۔۔۔۔۔ آزمائش ٹم نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ ہال ہال قرض میں جکڑا ہے میرا۔۔۔۔۔ میں نے کیا روٹا۔۔۔۔۔“

ماسٹر صاحب۔۔۔۔۔ مردود پھرے سارے آنسو پی کیا ہے۔

اُس نے گھر اسانس لیا یوں جیسے رُکے ہوئے سانس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”میں صبح اُٹھتی ہوں تو لگتا ہے، مجھے اُس کو ہسپتال لے کر جانا ہے۔ پھر یاد آتا ہے، وہ تو ہے ہی نہیں اور اماں کی کمر ٹوٹ گئی ہے، وہ ہر وقت روتے رہتے ہیں۔ اور میں۔۔۔۔۔ میں ڈھیٹ ہو گئی ہوں۔ کھانا کھاتے ہوں۔۔۔۔۔ پانی پیتی ہوں۔۔۔۔۔ سوئی ہوں۔ سارے کام کرتی ہوں بس روتی نہیں۔ میں کتنی ڈھیٹ ہوں۔“

”اللہ نے تمہیں مبرا دیا ہے۔“ ماسٹر ابراہیم نے کہا۔

”بہت زیادہ دے دیا ہے۔“ مومنہ نے کہا۔ ”مومنین پر آزمائشیں آتی ہیں۔ اجر بھی بڑا ہے۔“

”میں گناہ گار ہوں۔۔۔۔۔ کہاں کی مومن۔۔۔۔۔ کہاں کا اجر؟“

”مومنہ نام ہے تمہارا۔۔۔۔۔ گناہ گار کیسے ہو سکتی ہو تم؟ اور اجر کا تو اللہ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے۔ اپنے وعدے کے خلاف نہیں جاتا۔ زبان کا بڑا پکا ہے میرا رب۔“ انہوں نے اُسے دلا سادے کی کوشش کی تھی

”میں نے آج تک کبھی کوئی کام اجر کے لیے کیا ہی نہیں۔ نیکی بھی کی ہے تو اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتا ہے۔“ وہ جیسے ماسٹر ابراہیم سے متفق نہیں ہوئی تھی۔

”اجر پھر بھی ملتا ہے مومنہ۔“ ماسٹر ابراہیم نے اپنا جملہ دہرایا۔

”اجر کیا ہو گا اب میرے لیے ماسٹر صاحب۔۔۔۔۔ جہانگیر کے بعد۔۔۔۔۔ دُنیا کی کوئی شے نہیں جو میرا دل کر دے۔ میرے ماں باپ کا غم ختم کر دے۔۔۔۔۔ کوئی اجر تھا بھی تا میرے لیے تو میرے گناہ کھائے اُسے۔“

”تم بہت اچھی روح والی لڑکی ہو مومنہ سلطان۔“

”اچھی روح؟“ وہ غم آنکھوں کے ساتھ ہنسی۔ ”آپ مجھے نہیں جانتے ماسٹر صاحب۔۔۔۔۔ آپ شر کر رہے ہیں مجھے۔“

”ہم میں سے کوئی کسی کو نہیں جانتا مگر رب خوب جانتا ہے۔۔۔۔۔ آؤ جہانگیر کے لیے دعا کریں۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے تھے۔ مومنہ اُنہیں دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ماسٹر ابراہیم کے گھر سے واپسی کے پورے راستے وہ اُن کے جملوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

”اجر تو اللہ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں جاتا۔ زبان کا بڑا پکا ہے میرا رب۔“

اُن کے جملے اُس کے کالوں میں گونجتے رہے اور ستر کرتے ہوئے اُس نے سوچا، وہ کون سی چیز تھی جو اُسے ملتی تو وہ اُسے اپنا اجر سمجھتی۔۔۔۔۔ اُس کے ذہن کی اسکرین پر ایک ہی نام اور چہرہ آیا تھا اور اُس نے اُسے اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ ناممکنات پر یقین نہیں رکھتی تھی۔

اپنے گھر کے کھن میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے اندر سے آتی ایک آواز سنی تھی اور اُسے ناممکنات پر یقین آ گیا تھا وہ جسے اپنا اجر سمجھتی، وہ اُس کے گھر پر موجود تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بشری احمد

جس کے کان میں



”لگتا ہے کوئی الوکھا بچہ پیدا کر رہی ہیں بہو تھیں۔ واصف نے جو بہت گمن ہو کر بیوی پر ایک
”نیکم۔“ رئیسہ چنچلا کی ہوئی آواز میں شوہر سے مخاطب سیاسی مباحثہ دیکھ رہے تھے، بیوی پر ایک سرسری سی

”خیر تو ہے، اب بے چاری بہو سے کون سا قصور سرزد ہو گیا۔“ فی وی کی آواز ذرا سی کم کرتے ہوئے بیوی سے دریافت کیا۔

”بس آپ کو تو وہ فی بے چاری لگتی ہے اور میں جو دو گھنٹے سے کچن میں کھپ رہی تھی۔ مجھ بے چاری سے آپ کو کوئی ہمدردی نہیں۔“ رئیسہ تنک کر بولی تھیں۔

”ارے بھئی بے چارے ہوں آپ کے دشمن اور کیوں کھپ رہی تھیں آپ دو گھنٹوں سے کچن میں۔ سادہ سے دال، چاول ہی تو بنانے تھے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”پہلے برتن دھوئے پھر کچن کی صفائی کی، اس کے بعد کھانا بنایا۔ بہو بیگم تو صبح کا ناشتا کر کے جو کمرے میں تھیں تو اب تک باہر نہیں نکلی ہیں۔“

”تو بہو کی طبیعت بھی تو ویسے۔ اللہ لیاں کر کر کے بے حال ہوئی رہتی ہے۔ دھان پان سی تو ہے۔ ڈاکٹر نے بھی مکمل بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی کام میں لگی ہی رہتی ہے۔ آج طبیعت زیادہ جھل ہوگی تو بے چاری آرام کر رہی ہوگی۔“ داصف صاحب نے ٹائپ کی طرف داری کی تھی۔

”پھر وہی ہے بے چاری، میں پوچھتی ہوں داصف صاحب، اپنی بہو تو آپ کو دنیا جہان کی مظلوم ترین ہستی لگتی ہے۔ کبھی یہ وقت ہم پر بھی آیا تھا۔ پانچ بچے پیدا کیے میں نے۔ اس وقت میں بھی ایسی ہی دھان پان سی ہوئی تھی۔ آپ کی ماں مجھے کوئی رعایت دینے کو تیار نہ ہوئی تھیں۔

اللہ بخشے آپ کی اماں ایسے ایسے کام میرے ذمے لگا دیتی تھیں جو کوئی عورت نارمل حالت میں بھی کرتے ہوئے ہچکچائے اور میں بلا چوں چرا کیے آپ کی ماں کا ہر حکم بجالاتی تھی۔ ہمیں تو کسی حالت میں کوئی استثناء ملا۔“

”واہ بیگم واہ دل خوش کر دیا آپ نے۔“ گفتگو میں بھی کیسی کیسی تراکیب استعمال کرتے کرتے جیس۔ یہ فائدہ ہوا ہے میرے ساتھ بیٹہ کیسی ہنس رہی شوزو دیکھنے کا۔“ وہ لطف کہتے ہوئے بولے۔

”بات کو کھمانے پھرانے میں آپ تو سیاست دانوں کو بھی مات دینے لگے ہیں۔ میرے سوال کا جواب جو نہیں ہے آپ کے پاس۔ ہم تو ساری زندگی کولہو کے تیل کی طرح جتے رہے۔ پہلے ماں کی چاکری کی۔ پھر شوہر اور بچوں کی سیتا میں لگے رہے۔ سوچا تھا بہو آنے کی تو سکھ کا سانس ملے لیکن نہ جی، اب بہو بیگم کی نازیرداریاں کرنی پڑتی ہیں۔“ رئیسہ کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ ایسے ہی ٹائپ کی حمایت میں کوئی ایک آدھا خرقہ مزید بولنے سے نقص امن کا خدشہ تھا۔ یو و اصف صاحب نے پھر کی بڑبڑاہٹوں پر کوئی رد عمل دینے کے بجائے ہم سے فی وی کی طرف توجہ مرکوز کر لی۔ آخر وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔ ان کے جانے بعد داصف صاحب نے بھی فی وی بند کر دیا۔ ٹھکر کی پرچھائیاں ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

ان کی شریک حیات نے زندگی بھر خود سے وابستہ ہر رشتہ مثالی انداز میں نبھایا تھا۔ داصف صاحب کا خیال تھا کہ جس لڑکی کو رئیسہ بہت چاہتے بہو بنا کر لائی ہیں، وہ اس کے ساتھ بھی مثالی رہے اپنائیں گی۔ لیکن یہاں ان کا اندازہ غلط ثابت ہونے لگا تھا۔

ان کی بہو ٹائپ سلجھی ہوئی عادات کی مالک، ہنس مکھ سی لڑکی تھی۔ شادی کے بعد اس نے مگر کی ذمہ داریاں بھی بطریق احسن نبھانا شروع کر دیں۔ ٹائپ اور اسد کی شادی کے بعد شروع شروع میں تو رئیسہ اپنے انتخاب پر خاصی مسرور اور نازاں رہیں۔

”ٹائپ نے تو مجھے سویرا کی کی محسوس ہی نہیں ہونے دی داصف صاحب! بہو مجھے کسی کام کو نہ

”اچھی بات ہے لیکن نعمان کو فون کر کے کہہ دو کہ رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائے۔ یہ نہ ہو کہ وہ اپنے دوست کے ہاں کھانا کھا کر آئے۔“ رئیس نے فوراً تاکید کی تھی۔ سویرا نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اور ثانیہ بھابھی آپ سنائیں کیسی طبیعت ہے۔ بہت کمزور لگ رہی ہیں۔“ وہ اب بھادج کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کچھ کھایا پیا ہی نہیں جاتا بس اسی لیے کمزوری محسوس ہوتی ہے۔“ ثانیہ نے سادگی سے بتایا تھا۔

”بس آپ اور میں تو ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔“ سویرا مسکرائی تھی۔ دونوں نند، بھادج کی شادیاں اکٹھی ہوئی تھیں اور دونوں کو خوش خبری بھی تقریباً اکٹھے ہی ملی تھی۔

”مجھ سے تو خود کچھ نہیں کھایا جا رہا لیکن آنٹی اور نعمان میرے پیچھے پڑ کر مجھے کچھ نہ کچھ کھلاتے پلاٹے رہتے ہیں۔ آنٹی تو کبھی فروٹ کاٹ کر دیتی ہیں تو کبھی کسی فروٹ کا ٹکڑا بنا دیتی ہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے زبردستی پلا کر ہی دم لیتی ہیں۔“ سویرا نے فراخ دلی سے اپنی ساس کی تعریف کی تھی۔

”خیریت سے تو ہیں کلثوم آپا۔ بہت دن ہو گئے ان سے بھی ملاقات ہوئے۔“ رئیس نے سعدھن کی خیریت دریافت کی۔

”آنٹی کے گھٹنوں اور کمر میں بہت درد ہے ای۔ معدے کی تکلیف کی وجہ سے پین کلرز کا زیادہ استعمال بھی نہیں کر سکتیں۔“ سویرا نے بتایا تھا۔

”ہاں بیٹا یہ عمر ہی ایسی ہے۔ درد ہی جان نہیں چھوڑتے۔ رئیس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”آنٹی ریٹ بھی تو نہیں کرتیں ای۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی ہیں اور آج کل تو کچن کی ذمہ داری بھی آنٹی نے ہی اٹھا رکھی ہے۔

نہیں لگانے دیتی۔“ چلیں اسی بات پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ ایک بٹی گھر سے رخصت ہوئی تو اللہ نے بہو کی صورت ہمیں ایک اور بٹی سے نواز دیا۔“ واصف مسکرا کر کہتے۔ رئیسہ جی طمانیت بھرے انداز میں مسکرا دیتیں۔ لیکن آہستہ آہستہ رئیسہ کا اطمینان رخصت ہونے لگا تھا۔

اب انہیں ثانیہ سے بہت سی شکایتیں ہونے لگی تھیں اور جب سے ثانیہ امید سے ہوئی تھی شکایتوں کا تناسب بھی بڑھ گیا تھا۔ طبیعت نڈھال رہنے کی وجہ سے وہ اب پہلے کی سی مستعدی سے گھر کے کام نہ نہنایا کرتی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر نے بھی بیڈ ریٹ کی تلقین کی تھی۔ اس کا یہ آرام رئیسہ کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔

انہیں اپنا وقت یاد آتا جب ان کی ساس انہیں کسی بھی حالت میں کوئی رعایت دینے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ واصف صاحب کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی بھلی مانس بیوی کو اس موازنے کی عادت سے کیسے باز رہیں۔ اب بھی بیگم کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک مسئلے کا حل سوچتے رہے تھے۔

☆☆☆

اگلی شام کو سویرا چلی آئی۔ لاڈلی بیٹی کی اچانک آمد پر رئیسہ بیگم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ عموماً دیک اینڈ پر اپنے شوہر کے ساتھ آتی تھی۔ آج بنا اطلاع دیے ماں باپ سے ملنے چلی آئی تو ان کی خوشی فطری تھی۔

”صبح سے ہی آپ اور ابو بہت یاد آرہے تھے ای۔ آنٹی نے بھی میری اداسی محسوس کر لی۔ نعمان آج آفس سے جلدی آگئے تو آنٹی نے ہی ان سے کہا کہ مجھے آپ لوگوں سے ملوانے لے جائیں۔ نعمان کو اپنے دوست سے ملنے جانا تھا۔ مجھے یہاں ڈراپ کر کے وہ چلے گئے۔“ سویرا نے مسکرا کر ماں کو بتایا تھا۔

مجھے پتہ نہ تھا کہ اس کڑا حق نہیں دے دیتا۔
 کوئی اور پہلے اس کڑا حق کی طرف متوجہ نہ تھا۔
 مگر میں نے اس کو خراب ہو جانے کی۔ میں دیکھ
 اس کے کڑا حق کی کوئی اور نہ تھا۔ اب تو ہائی کی عمر
 تھوڑے ہاتھ کا بچہ تھا۔ وہ بڑا سا عمر والا کڑا
 کی عمر کے مطابق استقامت سے گزارا۔

آئی کوئی اور کہ ان کی ساس کے لئے انہوں
 جو ان میں بہت کچھ نہ تھا۔ کسی بھی حالت میں
 انہیں کوئی رعایت نہ دینی تھی۔ آئی نے یہ سوچ کر کہا
 تھا کہ وہ اپنی ساس کی ساس کا بہت نہیں ہوں کی
 بلکہ اپنی بہو کو بھی اپنی بہا کر رکھیں گی۔ سویرا نے محبت
 بھرے انداز میں ساس کا تذکرہ کیا تھا۔ دیکھو۔ کچھ
 سب سے ہو گئیں۔ ذرا دیر بعد کھٹنگو کا سلسلہ کسی اور
 طرف مڑ گیا تھا۔

”پھر رات کے کھانے میں کیا ہوا؟ ای۔
 دوپہر والا آلو قیرہ تو رکھا ہے۔ پکن کڑا حق اور پکا
 بنا لیتی ہوں۔ کیوں سویرا؟“ ثانیہ نے گھڑی پر نگاہ
 ڈالی تو تیزی سے گزرتے وقت کا احساس ہو ساس کو
 مخاطب کرنے کے ساتھ ہی سویرا سے بھی رائے
 چاہی۔

”پکن کڑا ہی رہنے دے بھابھی۔ صرف پکن
 پکاؤ بھالیں۔“ سویرا نے تجویز دی۔

”ثانیہ بیٹا تم صرف پکن کا پیکٹ فریجر سے
 نکال دو۔ کھانا میں خود بناؤں گی۔ صبح سے تو تم اللیاں
 کر کر کے بے حال ہوئی پڑی ہو، اب کہاں چو لے
 کے آگے کھڑی ہوگی۔“ دیکھو نے نرمی سے بہو
 کو مخاطب کیا۔ ثانیہ نے ممنون نگاہ ساس پر ڈالتے
 ہوئے جی امی کہا تھا۔ سویرا کے ہونٹوں پر مدھم سی
 مسکراہٹ بھرنی۔ سسرال واپس جانے سے پہلے وہ
 موقع پا کر باپ کے قریب آئی تھی۔

دوبارہ جب بھی ضرورت محسوس ہوا تو مجھے
 کال کر لے گا۔ آج کا مشن تو کامیابی سے ہم کنار
 ہو گیا ہے۔“ اس نے باپ کے کان میں سرگوشی کی۔
 داصل صاحب نے محبت بھرے انداز میں بیٹی کو

اس کے لئے اس کی سب سے بڑی بات تھی۔
 اس کے لئے اس کی سب سے بڑی بات تھی۔
 اس کے لئے اس کی سب سے بڑی بات تھی۔
 اس کے لئے اس کی سب سے بڑی بات تھی۔

کچھ دیر بیٹا اپنے نیلے کے کونے میں
 غلط فہمی رہا۔ اس کی سب سے بڑی بات تھی۔
 ساس کی لڑکی تھی۔ اس کے سانس لیتی تھی۔
 تقریبوں کے چو لے لے رہے تھے اس نے
 مہالہ بھی تھا۔ آئی اپنی بیٹی کی سب سے بڑی بات تھی۔
 سویرا نے انہیں ہٹا کر باقی کیا۔ اس کی سب سے بڑی بات تھی۔
 کہ اس کی ماں بہت اچھی ساس ہے۔ یہاں چاہے
 قدرت کے اعتبار سے اچھی لڑکی تھی۔

سویرا کو یقین تھا کہ وہ ساس کے اچھے
 اپنا حق سمجھ کر وصول کرنے والی لڑکی نہیں ہے۔
 اس اچھے پر تازہ کو نہ صرف یاد رکھے گی بلکہ
 ان کی عزت کے ساتھ ساتھ خدمت بھی کرے گی
 اپنی ماں سے بے تحاشا محبت کرنے والی سویرا
 کب کوار تھا کہ کسی اور کے دل میں اس کی ماں
 متعلق منفی خیال جنم لیں۔

سویرا اپنی آئیڈیل میں کو آئیڈیل ساس
 روپ میں دیکھنے کی منتہی تھی۔ چاہے اس کے
 اسے اپنی ماں کے سامنے اپنی ساس کی جھوٹی تعریف
 ہی کیوں نہ کرنی پڑتیں۔ اس سارے قصے میں
 ذاتی نقصان صرف یہ ہوا تھا کہ اب وہ ماں
 سامنے سسرال کی دل دکھانے والی بائیں ہاتھ
 دل کا بوجھ ہٹا نہ کر سکتی تھی۔ ہاں دل کا بوجھ
 کرنے کے لیے اس کے پیارے ابا جو موجود
 جن کا ایمان تھا کہ دوسروں کی زندگیوں
 آسانیاں پیدا کرنے سے آپ کی اپنی زندگی
 سے گزرتی ہے۔ جینے کا یہ ڈھنگ ثانیہ نے لیا۔
 ہی سیکھا اور وہ اسی پر عمل پیرا بھی تھی۔

رشتے کے چھلکے

وہ جانتی تھی کہ وہ بے پناہ خوب صورت ہے، اس کے پاس دولت بھی ہے اور اب تو وہ ہاشم صاحب کے اکلوتے بیٹے کی بیوی بن گئی تھی۔ یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ وہ پورے خاندان کی سب سے خوش قسمت لڑکی تھی۔

پھولوں سے سجی سبز اور چاروں طرف پھیلی ان کی بھینی بھینی خوشبو اس کی چاہت اور رنگ کو مزید بڑھا رہی تھی۔ گہرے سرخ رنگ کے اس خوب صورت لہنگے نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔

تعریفوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہر طرف گونج رہا تھا جو حنا کے غرور کو ایسی تقویت بخش رہا تھا جیسے ہوا آگ کو مزید بڑھا دیا کرتی ہے۔



حاکم محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آج اس نے اپنی منزل پالی ہے۔ امی ٹھیک کہتی تھیں۔ "میری بیٹی تو ہے ہی نصیبوں والی۔"

بجی وہ اپنے مہندی سے لال ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی تو کبھی ڈریسنگ پر لگے شیشے میں دیکھتے ہوئے اپنے خوبصورت عکس کو نہانے لگتی پھر اگلے ہی بل اس ڈر سے کہ کہیں اسے اپنی ہی نظر نہ لگ جائے مسکرا کر نظریں جھکا جاتی۔

جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور اپنے لمبے کویٹ کرنے لگی۔

حاشیہ کرنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک پیار بھری نظر اپنی دلہن پر ڈالی جس سے وہ شرمائی۔

حاشیہ اس کے رو برو بیٹھتے ہوئے اسے سلام کیا۔ اس کے خوب صورت ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں

میں تھا ما اور ایک خوبصورت انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ جس سے اس کے ہاتھوں کے حسن میں مزید اضافہ ہو گیا۔ حاشیہ نے چند رنگی باتوں کے بعد گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ ہر ممکن خوشی دوں گا پر اس کے بدلے میں تمہیں میرا مان رکھنا ہوگا۔

میں نہیں چاہتا کہ کوئی شک و شبہ رہ جائے اس لیے کچھ باتیں ہیں جو میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتا چاہتا ہوں جن کے حوالے سے کوئی بھی مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔

حنا! اب تم میری زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکی ہو لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجھے اپنے والدین سے بڑھ کر اور کوئی اہم نہیں ہے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں مگر تم یہ سمجھو نہ سوچنا کہ تم مجھے ان سے الگ کر لو گی۔"

حاشیہ نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

"میری جان رشتے بھانا اہم نہیں ہے، انہیں مضبوطی سے تھامے رکھنا اصل کامیابی ہے اور اگر

میں تمہاری ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ ہر ممکن خوشی دوں گا پر اس کے بدلے میں تمہیں میرا مان رکھنا ہوگا۔

میں نہیں چاہتا کہ کوئی شک و شبہ رہ جائے اس لیے کچھ باتیں ہیں جو میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتا چاہتا ہوں جن کے حوالے سے کوئی بھی مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔

حنا! اب تم میری زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکی ہو لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجھے اپنے والدین سے بڑھ کر اور کوئی اہم نہیں ہے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں مگر تم یہ سمجھو نہ سوچنا کہ تم مجھے ان سے الگ کر لو گی۔"

حاشیہ نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

مضبوطی قائم رکھنے کے لیے آپ کو قریب لایا گیا تھا۔ پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تمہارے لیے کچھ چھوڑا گیا ہے۔ دن سے ہی اسے اپنا گھر اور اس گھر کے مسائل سمجھو مجھے وہ گھر میں رہتی ہیں جن کا دل بہتر ہے۔

ذرا کوئی بات ہوئی اور فوراً اس کے فون کا کرکٹ ڈاسٹان سنا ڈالی پھر وہاں سے ملے والے سفید خط کو بنا سوچے کچھ سسرال میں اچلائے گئے۔

معروف ہو جاتی ہیں تم سمجھ رہی ہو۔ حاشیہ نے پوچھا۔

حنا کو خیر تو بہت آ رہا تھا پر اس وقت وہ کسی طرح اپنے جذبات کو ضبط کر رہی تھی اور اس نے ہاتھ کھینچے۔

عافیت جانی۔ اور دل ہی دل میں بڑبڑاتے گی۔ (بڑے آئے مجھے مشورے دینے والے)

تمہارے لیے تمہاری فیملی عزیز ہے تو میں بھی اپنے گھر والوں کو جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔

حنا جو کہتا چاہتی تھی وہ بس سوچ کر ہی رو گئی۔

اگلے دن دلیر تھا۔ ہر بار کی طرح حساب سے الگ لگ رہی تھی۔

"ماں صدقے جائے، دیکھو میری بیٹی ہمیشہ کی طرح کتنی پیاری لگ رہی ہے، حاشیہ تو مر رہا ہوگا۔"

کی ماں نے آتے ہی اس کی بلائیں لیں شروع کر دیں۔ "ادھو..... کیا خاک مر رہا ہوگا، وہ تو نہایت ہی

خیر کل نکلا امی۔" حنا نے منہ پٹاتے ہوئے کہا۔ "کیوں کیا ہوا بیٹا جی.....؟" ماں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"بس وہی تھکی بی بی باتیں، میرے گھر والوں کا خیال رکھنا، مجھے یہ پسند نہیں مجھے وہ پسند نہیں۔"

بھلا کوئی اپنی بی بی کو اس سے ایسے بات کرتا ہے؟ حنا نے اپنی شکایات کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی۔

حنا نے اپنی شکایات کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی۔

”اچھا اس نے یہ سب ہاتھ کیا کیوں تم سے، آنے والے ذرا دیکھنا کیسے کان چنتی ہوں اس کے میری بیٹی اس گھر کی مالکین ہے، نوکرانی نہیں جو اس سے اس طرح کا فرائض کی جارہی ہیں۔“ اس کی ماں بھارتکان بولنے لگیں۔

حاشر جیسے ہی مہمانوں سے فارغ ہوا سیدھا اپنے سسرالی رشتے داروں سے ملنے چلا آیا۔
”کیسی ہیں آپ آنٹی؟“ اس نے نہایت مودبانہ انداز میں پوچھا۔

”ہم تو ٹھیک ہیں میاں مگر مجھے تمہارے مزاج کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ حاشر نے حیرانی کا اظہار کیا۔
”خود سوچو بھلا کوئی نئی نویلی دہن سے ایسی باتیں کیا کرتا ہے؟“

”کیسی باتیں؟“ حاشر مزید الجھا۔
”یہی کہ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھنا، اپنے گھر والوں سے رابطہ کم رکھنا یہ سب۔“

حاشر کو یک دم حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے حنا کو دیکھا وہ تو۔ ایسے۔ نارمل تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حاشر کو بہت غصہ آیا اور ڈکھ بھی ہوا پر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے بات آئی گئی کر دی۔

☆☆☆

رات کو جب حاشر کمرے میں آیا تو اس کا موڈ آف تھا، حنا کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے خود بات چیت شروع کر دی پر وہ ساری باتوں کا جواب ہاں ہوں میں ہی دے رہا تھا۔

”آپ امی کی باتوں کی وجہ سے ناراض ہیں، چھوڑیں وہ تو بس ایسی ہی ہیں۔“

”مجھے ان کی نہیں، تمہاری باتوں کا دکھ ہے، تم ایک دن بھی میری باتوں کا بھرم نہ رکھ سکیں۔“ حاشر نے گہرے ڈکھ کا اظہار کیا۔

”سواری، وہ سب تو ایسے ہی باتوں باتوں میں مہرے منہ سے نکل گیا۔ نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہوگا۔

اب تو اپنا موڈ ٹھیک کر لیں، سواری۔“ حنا نے ترے کرنے شروع کر دیے۔

”دیکھو حنا! میاں بیوی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی نازک بھی ہوتا ہے۔ غلط فہمی کی ایک چنگاری اُسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے مجھے بس یہی کہنا تھا آگے تمہاری مرضی۔“ حاشر نے اتنا کہہ کر اپنی بات مکمل کر دی اور فیصلے کا اختیار حنا پر چھوڑ دیا مگر حنا کہاں باز آنے والی تھی۔ اس نے ہارنا اور جھٹکنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

ہر گزرتے دن ایک نئے مسئلے پر بحث ہونا معمول بن گیا۔ حنا گھر میں ہونے والی معمولی باتوں کو بھی بہت محسوس کرتی اور آسمان سر پر اٹھا لیتی۔

ہر وقت اپنے گھر والوں سے بات اور شکوے کرنے کے لیے فون اس کے کان سے لگائی رہتا۔

حاشر جو اپنے گھر والوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ سب برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ آج بھی جب حاشر کمرے میں آیا تو حنا حسب معمول شروع ہو گئی۔ نہ سلام، نہ دعا بس وہی شکایات۔

”اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا، آپ کی اماں اور آپ تو جیسے میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہیں۔ پتا نہیں میں نے اُن کا کیا بگاڑا ہے۔ ہر وقت وہ میری جاسوسی میں لگی رہتی ہیں۔ کب جاگتی ہوں، کیا کرتی ہیں ان کو سب پتا ہوتا ہے۔“

”پلیز اسٹاپ اٹ۔“ پہلے ہی میں آفس کے کام کی وجہ سے پریشان ہوں۔ کم سے کم تم تو میرا دماغ خراب نہ کرو۔“

”اچھا تو آپ کو صرف اپنا سکون عزیز ہے اور میں جو یہاں مل پل تڑپتی رہتی ہوں اس کا کیا۔ آپ کی ماں کیا کم بھی میرے لیے جواب آپ کی بہن بھی

مصیبت بن کر روز نازل ہو جاتی ہے۔“

”بس کرو حنا میں تمہیں لاسٹ وارننگ دے رہا ہوں۔“

”ورنہ کیا کر لیں گے آپ؟ آپ کو میری ذرا فکر نہیں ہے؟“

"اگر تمہیں مجھ سے اور میرے گھر والوں سے اتنی ہی پرہیز ہیں تو بے شک اپنے گھر چلی جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر حاشر کمرے سے باہر چلا گیا، حنا نے فوراً بیک ٹکالا اور فون پر ہی روتے دھوتے ساری داستان اپنی ماں کو سنادی۔

ادھر سے اُسے فوراً گھر چھوڑ دینے کا مشورہ مل گیا۔ حاشر کو خبر تھی ہوئی جب باہر ڈرائیور اُسے لینے آ گیا۔ وہ بڑا سوٹ کیس ہینٹی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔

"یہ کیا کر رہی ہو حنا! یہ پاگل پن کرنے کی ضرورت نہیں ہے میری بات سنو۔"

"اب آپ کو جو بات کرنی ہے وہ مجھ سے نہیں میرے گھر والوں سے کرنا۔" حاشر نے اُسے روکنے کی کوشش کی پر وہ اتنا کہہ کر چلی گئی۔ حنا کے گھر پہنچتے ہی جیسے کبرام مچ گیا۔

سارے خاندان میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ محض دو ماہ پہلے ہونے والی شادی اچانک یہ موڑ اختیار کرے گی۔ حنا اور اس کے گھر والوں نے تو اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا تو یقین تھا کہ حاشر اس سے پناہ محبت کرتا ہے اس لیے وہ زیادہ دن اس کی دوری برداشت نہیں کر پائے گا اور بھاگا بھاگا اُسے لینے آ جائے گا۔ یہی وہ طریقہ تھا جس سے بدلے میں وہ اپنے سارے ناجائز مطالبات منوا سکتی تھی اور ادھر حاشر پہلے ہی حنا کے روئے اور بچنے سے تنگ تھا اور اپنے گھر والوں کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو راضی نہیں تھا۔

اپنے گھر والوں کے اصرار پر اُس نے حنا کے گھر والوں سے بات کرنے کی ہانی بھری مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ حنا تک گھر نہیں جائے گی جب تک اُسے الگ گھر لے کر نہیں دیا جائے گا۔

اس ساری ضد کو مہینہ ہونے کو آیا تھا پر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل رہا تھا۔ حاشر کے والدین نے

اُسے حنا کے گھر والوں کا مطالبہ ماننے پر مجبور کیا مگر ایسا کرنے کے لیے راضی نہیں تھا۔ ادھر جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے۔

حنا کو تشویش اور دوسو سے گھیر رہے تھے ایک بار تو اس نے سوچا کہ وہ خود ہی چلی جاتی ہے یہاں کی ماں نے اُسے روک دیا کہ اب حنا کا اس گھر جانا اس کی انا پر نہیں لگنے کے مترادف ہوگا، میسے کے آخر میں حنا کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ سارا دن سستی اور بے زاری میں گزر جاتا۔ جب طبیعت زیادہ بگڑی تو اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جہاں اُسے ایک خوشی کی خبر ملی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ حنا کے گھر والے بہت خوش ہوئے۔ حنا کا دل بھی اب مضبوط ہو گیا کیونکہ اب اس کا پلڑا بھاری تھا۔ اسے ایک طاقت ملی تھی ایک یہی بات تھی جو حاشر کو جھٹکنے پر مجبور کر سکتی تھی جیسے تیسے اس خبر کو حاشر تک پہنچایا گیا۔

اس کے گھر والے جھومنے لگے آخر ان کے گھر اتنی بڑی خوشی جو آنے والی تھی۔ کسی طرح حاشر کو سمجھایا کہ اب تو ان کی بہو کو لے آئے اور بالا آخر حاشر کو ان کی بات ماننی پڑی اُس نے حنا کو کال کی کہ کو تو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اُس نے تو امید ہی چھوڑ دی تھی کہ حاشر اُسے لینے آئے گا۔

"کیسی ہو حنا؟"

"جی میں ٹھیک آپ سنائیں۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم اپنا سامان پیک کر لو۔"

"میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔"

"مگر وہ....."

"اگر مگر کچھ نہیں باقی کے معاملات ہم بعد میں طے کر لیں گے۔"

حنا نے پیکنگ شروع کر دی۔ اپنی ماں کے روکنے کے باوجود اُس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ آخر وہ بھی تو حاشر سے محبت کرتی تھی۔

"حنا بے وقوف نہ ہو۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاؤ میری جان ادیکھو ابھی صرف خوش خبری ملی ہے تو حاشر کتنا بے شک

ہو گیا ہے۔ اس کی کو وہ تھارے قدموں میں پڑا ہوگا، اگر تم ابھی
 ڈھکیا پڑھیں تو پھر ہر بار جہیں ہی جھٹکنا ہوگا اور کچھ بھی ہاتھ
 نہیں آئے گا۔ اس کی ماں نے اس کی برین واشنگ کرنے
 کی کوشش کی پر حنا کہاں کسی کی سننے والی تھی۔

ہم ہم ہم

حنا کو وہاں گھر آئے چھ ماہ ہونے والے تھے
 سب اس کا شہزادیوں کی طرح خیال رکھتے مگر وہ بھی
 کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ ہر وقت بدگمان
 رہتی۔ الگ گھر لینے کا جنون اس کے سر پر سوار
 رہتا۔ ہر قدم اپنی ماں کے مشورے سے اٹھاتی جس
 کی وجہ سے وہ حنا کی نظروں سے گرتی جا رہی تھی۔
 پھر وہ دن بھی آ گیا جب ان کے گھر ایک چاند سا
 بیٹا محمد حارث پیدا ہوا۔ حنا بھی خوش تھا کہ شاید اب حنا
 کو محض آجائے اب وہ خود ماں بن گئی ہے تو شاید اسے
 احساس ہو کہ ایک ماں کے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے
 جذبات کیا ہوتے ہیں۔ ادھر حنا اور اس کی ماں کی
 سوچوں اور آرزوؤں کو تو جیسے پر لگ گئے۔

محمد حارث چھ ماہ کا ہونے والا تھا۔ حنا اسے ہر
 وقت سینے سے لگا کر رکھتی۔

اپنی ساس اور اکلوتی نند کو تو پاس بٹکنے بھی نہیں
 دیتی تھی۔ مگر انہوں نے صبر کا مظاہرہ جاری رکھا۔ اپنی
 بہو کی ہر بات برداشت کی اور حنا کو کونوں کان خبر تک
 نہ ہونے دی کہ ان کے بیچ کوئی بدسلوکی پیدا نہ ہو۔

ایک دن حنا کے گھر والے اس کے گھر دعوت
 پر آئے ہوئے تھے۔

خوب گہما گہمی کا ماحول تھا۔ حنا کی ماں نے
 اپنے پوتے کو اٹھایا اور خوب سارا پیار کیا۔ حنا کی نظر ان
 پر پڑ گئی اس نے تونہ آؤ دیکھنا تونہ آؤ اور شروع ہو گئی۔

"کتنی بار کہا ہے آپ کو میرے بیٹے سے دور رہا
 کریں۔ میں اس پر آپ کی نحوست کا سایہ پڑنے نہیں
 دینا چاہتی۔ اپنے بیٹے کے کان بھر بھر کر تو اسے میرے

غلاف کر رہی تھی ہیں اب میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئی
 ہیں۔" ابھی حنا یہ سب بولتے ہوئے حارث کو ان سے

پھینک رہی تھی کہ حنا جو یہ قیاس دیکھ رہا تھا۔ قریب آیا
 اور حنا کے منہ پر ایک زوردار پتھر سید کر دیا جس پر اس
 کے گھر والے آگ بگولا ہو گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک کمرہ بن گیا۔

"میں ابھی اپنی بیٹی کو لے کر چلی جاؤں گی۔ تم
 لوگ اس کے قابل ہی نہیں ہو یا تو تم ابھی۔ اسی وقت
 حنا کو الگ رکھنے کا وعدہ کر دیا پھر اسے طلاق دے دو۔"

حنا غصے اور جذبات میں تھا اس نے کہہ دیا۔

"جائیں سنبھالیں اپنی بیٹی کو میں اسے طلاق دیتا

ہوں۔ ابھی حنا کا اتنا کہنا تھا کہ اس کی ماں نے اس کے

منہ پر ہاتھ رکھ کر اگلے الفاظ نکلنے سے روک دیا۔ پورے

کمرے میں سناٹا چھا گیا حنا تو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

اس کے گھر والے حنا کو لے کر گھر آ گئے۔ ان

کی بلا وجہ کی ضد نے سب پر باد کر دیا سالوں گزر گئے

پر نہ حنا گھر گئی اور نہ وہ دو طلاقیں آئی۔

یوں ایک ہنسا بستا گھرانا ضد کی نظر ہو گیا۔ یہ

ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ ماں میں

اپنی بیٹیوں کی شادی تو کر دیتی ہیں مگر انہیں ان کے

گھر میں بسنے نہیں دیتیں ہر وقت ان کے دل میں

نفرت کے بیج بوٹی رہتی ہیں اور حنا جیسی بے وقوف

لڑکیاں جانے انجانے اپنی زندگی برباد کر لیتی ہیں۔

آج حارث چھ سال کا مگر انتہائی بھوک اور احساس

کستری کا شکار ہے حنا بھی نفسیاتی مرید بن گئی تھی، بنتی بھی

کیوں نہ، ہر وقت سب کے طعنے سنا کرتی تھی اب تو اس

کے گھر والے بھی اس سے تنگ آ گئے تھے۔ اس کی خوب

صورتی، ڈگریاں سب اس کے لیے بے کار تھیں۔

حنا نے بھی دل پر پتھر رکھ کر دوسری شادی کر

لی اور اب اس نے ایک مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی

سے شادی کی تھی۔ وہ باقاعدگی سے حارث کے لیے

خرچا بھیجتا پر حنا کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ

نہیں تھی اور نہ ہی کسی قسم کی منجائش۔

ہم ہم ہم

حالاتِ دل

جلدی کرو۔“

وہ دروازہ بند کر کے گئیں تو ہاتھ میں پکڑے چار پائی پر ڈال کر وہ پھر وہیں بیٹھ گئی۔ سروسوں رنگ جوڑے پر ہاتھ پھیرتی وہ تیراں تھی کہ اس نے بہن کے بجائے سبیلی کو کیل بلایا۔ دل میں کہیں چور دروازہ کھلنے لگا تھا۔

☆☆☆

شہزاد اس کی سبیلی کا تانا زاد تھا۔ ایک دن میرا کے دروازے پر رخصت لیتے اس سے سامنا ہوا تھا۔ یہ اتنی عام سی بات تھی کہ اس نے دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ قریباً کوئی ڈیڑھ ماہ بعد اسے اس حوالے کے ساتھ کال موصول ہوئی۔ سادہ لہجے میں ہوتا وہ لڑکا کبھی کبھار بات کرنے کی خواہش لے لے ہوتا تھا۔ اسے سیر پر حیرت تھی کہ اس نے اس کا نمبر اسے دے کیوں دیا۔ اس کے بعد اس کا بھی فون تو نہیں آیا البتہ پیغام آتے تھے۔ معنوی گہرائی لیے اشعار جو ایک بار تو دل سمندر میں طوفان اٹھا دیں۔ سامنے اگر کبھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی تو اسے منع نہیں کیا تھا ان پیغامات سے۔ دل میں عجیب عجیب خواہشیں سر اٹھاتی تھیں پر اس کا دل چھپے تعلقات سے ڈرتا بھی تھا۔ خود وہ اصرار نہیں کرتا تھا بات پر لیکن اس کے اشعار کا چٹاؤ اکساتا تھا۔ وہی آج پر اس کے جذبات گر ماتا کبھی وہ سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ جس ملاقات کا اس نے حوالہ دیا تھا صبا کے ذہن میں اس کا سیاق و سباق تو تھا پر خود وہ نہیں۔ اب اگر وہ صبا کے پاس سے بھی گزر جاتا تو وہ اسے پہچان نہ پاتی اس لیے خیالی بے رخی سی شبیہ ابھرا بھر کر معدوم ہو جاتی۔

کچھ بہت سی لڑکیوں کی طرح وہ بھی بچپن میں اپنے پھوپھی زاد سے منسوب ہو گئی تھی۔ اس لیے بھی اس معاملے میں ڈری ہوئی تھی۔ اب پھوپھی بڑا تھیں تو آنا فانا اس کی شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ محض اکیس دن..... جس میں سے انہیں تکرار

ہاتھ میں پکڑے موبائل پر رومن میں لکھا پیغام اس نے اتنی بار پڑھا تھا کہ حروف کے ساتھ ساتھ بھیجے گئے وقت کے منٹ اور سیکنڈ تک اسے ازبر ہو گئے تھے۔

”رات بارہ بجے تک جب چاہو صرف پندرہ منٹ کے لیے چھوٹی گلی کے کونے پر آ جانا۔ گزرے سات ماہ میرے کردار کی گواہی کے لیے کافی ہوں گے۔“

اس کی نظر ایک بار پھر اس پیغام پر تھی۔ دفعتاً دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ فون والا ہاتھ اس نے دوپٹے کے پتے تلے کر لیا تھا۔

”صبا..... ابھی تک تم کپڑے نہیں بدل سکیں۔ تھوڑی دیر میں سب تمہارا پوچھنے لگیں گے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔“ یہ گئی تھی اس کی بڑی بہن۔

آج صبا کی مہندی کی تقریب تھی۔ عین مایوں والے دن اسی بہن کے سر کی وفات کی وجہ سے مایوں کی رسم نہیں ہو سکی تھی اس لیے آج اسے پیلا جوڑا پہننا تھا۔

”باجی بس جارہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کپڑے اٹھا لیے۔

”جلدی کرو۔ پھر میں ارم کو بھیجتی ہوں تمہیں ذرا پھولوں کے گہنے پہنا دے گی۔“ مصروف انداز میں کہتی۔ وہ دروازہ کی طرف بڑھیں تو جھجک کر اس نے آواز دی۔ ”باجی اسام کو بیچ دینا۔ وہی تیار کر دے گی مجھے۔“

”اچھا اچھا..... اسے ہی بھیج دوں گی بس تم

”اس فون سے سم نکال کر توڑ کر پھینک دو میں کپڑے بدل کر آئی۔“ ایک لمبے میں فیملہ کر کے فون اسماء کو پکڑا کر وہ دواش روم میں مہس لگی۔

باپ کی عزت، ماں کی تربیت، بہنوں کی محبت اور بھائی کا مان..... ایک پندرہ منٹ کی خاطر وہ ان سب کی قربانی نہیں دے سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ گھر کے آئین میں سگی ساتھیوں کے بیچ پوری عزت کے ساتھ بیٹھی ہاتھوں پر حتاکی نقش و نگار بنوار ہی تھی اور چھوٹی گلی کے کونے پر بیٹھا شہزاد مسلسل اس کے بند نمبر پر فون کرنے کے بعد ایک اور نمبر ملا کر کہہ رہا تھا ”گاڑی واپس لے جاؤ لگتا ہے از گئی چڑیا۔ دیکھنے میں تو بڑی سیدھی لگتی تھی۔“

ایک گندی گالی دے کر ادھ جلا سگریٹ پھینک کر کپڑے جھاڑتا اٹھ کر وہ اندر صبرے میں گم ہو گیا۔ چند قدم دور صبا کے انتظار میں کھڑی گاڑی بھی اسے لیے بغیر واپسی کا سفر شروع کر چکی تھی۔

☆

آج صبا دن تھا۔ شہزاد کو میرا سے ہی اس کی شادی کا پتا چلا تھا۔ تب سے وہ اس سے مسلسل بات کرنے کی کوشش میں تھا۔ وقت نکالنا تو پہلے بھی آسان نہیں تھا اور اب تو گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ جب اسماء کو راز دار بنا کر اس نے ایک کال کا وقت چرایا تھا۔

”میں نے کبھی بلند و بانگ دعوے نہیں کیے کیونکہ میں اپنی حیثیت جانتا ہوں۔ اس کے باوجود

دل کج فہم کے کہنے پر ایک خواہش آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ سرخ پھول تو قسمت والوں کو ملتے ہیں میں بس ایک بار اپنی قسمت میں نہ لکھے جانے زرد پھول کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں شگفتگی اور اہتجاج تھا۔ اس کے لفظوں کا محتاط چٹاؤ..... وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ سات ماہ میں اس نے کبھی کوئی نازیبا بات نہیں کی تھی۔ کبھی وقت بے وقت فون کر کے بات کرنے کے لیے تنگ نہیں کیا تھا۔ کبھی براہ راست مخاطب کر کے کوئی پیغام نہیں لکھا تھا۔ وہ عزت کہتا نہیں کرتا تھا۔ سلجھے ہوئے کردار کے اس لڑکے کی ایک آخری خواہش پوری کرنے میں جانا ہی کیا ہے۔ وہ جانتی تھی اتنی دیر کے لیے پارلر کے بہانے یا چھپ کر بھی جایا جاسکتا تھا لیکن مسئلہ جانے کا نہیں تھا۔ مسئلہ تو اس کا اپنا تھا۔ پندرہ منٹ کے لیے انیس سال کی تربیت کو اٹھا رکھنے کے لیے اسے کوئی طاق نہیں مل رہا تھا۔

جب اسماء اندر آئی وہ اپنے دھیان میں گم تھی۔ ”توبہ ہے عکسی لڑکی ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔“ پھولوں کے گہنے رکھ کر وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

”اسماء.....“ گہری نیند سے جاگنے جیسا خمار لہجے میں سموائے اس نے اسماء کو پکارا۔ اس کی سنجیدگی اور بھاری آواز سے لگ رہا تھا وہ روتی رہی ہے۔ اسماء نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جن میں کسی برسات کا ذکر نہیں تھا۔



آوازِ دل

بات چھوڑ کر ایک جملہ پکڑا اور بے سرو پا بولنا شروع کر دیا۔

فری باجی عمر میں اس سے محض دو سال بڑی تھیں۔ سارا بچپن تو ”فری کو لگاؤ تری“، ”فری کچرے میں گر پڑی“ کا مکا کر چراتے اور لڑتے جھگڑتے گزارا تھا۔ وہ تو انٹر کے فوراً بعد جب ای نے فری کی شادی کر دی تو اسے سختی سے باجی بولنے کی تلقین کی۔ باجی بولنا تو اس نے شروع کر دیا لیکن آپ جناب والی عزت نہ دے سکا۔

”فضول ہی بولنا ہمیشہ، میری ناک موٹی ہے اور خود تو جیسے وحید مراد ہو۔“ باجی نے آگ بگولا ہو کر ہاتھ میں پکڑے پکڑے بٹنے۔

”وحید مراد تو انعام بھائی کے زمانے کی باتیں ہیں۔ ہمارا مقابلہ تو فواد خان، دانش تیمور اور حمزہ عباسی سے کرو۔“ اس نے پھر بات اڑائی۔ اس نازک وقت میں اس کی غیر سنجیدگی فری کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ غصے میں انھیں تو ہاتھ تہ کیے ہوئے کپڑوں کو لگا اور سارا ڈھیر مسہری سے لڑھک کر زمین پر آ رہا۔ وہ اپنی آنکھوں میں آتی نمی چھپائے چلی گئی تھیں۔

انہیں منانے یا چپ کرانے کے لیے وہ کیا

آواز دیتا، حسرت بھری نظریں تو نیچے بکھرے کپڑوں پر پڑتی تھیں۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ اب یہ سب یقیناً اسے ہی سیننا تھا۔

وہ اسی لیے ادھر ادھر کی بات کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کی حساس بہن کا دل بھرا ہوا ہو گا لیکن وہی ہوا

”بات ہو گئی ہے میری، اب بس شفٹنگ ہو تو میں بھی سکون سے جاؤں۔ تم تمیز سے رہنا دہاں، میری ناک مت کٹوا دینا نانی کے سامنے۔“ کپڑے تہ لگاتے فری باجی بول رہی تھیں۔ جملے کے آخر تک آتے آتے ہاتھ رک گئے۔ لیکن زبان بدستور چلتی رہی۔

ای سچ ہی کہتی تھیں کہ ”فری کی زبان کی رفتار سے ہاتھ بھی چلنے لگ جائیں تو سب کام وقت پر بلکہ وقت سے بہت پہلے ہو جائیں۔“ شہبیر نے کینہ تو ز نظروں سے فری کے رکتے ہاتھوں کو دیکھا۔

”تمہاری ناک کچھ کٹ ہی جائے تو اچھا ہے۔ اتنی موٹی ناک ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں پانی پیئے وقت گلاس بھی نظر نہیں آتا ہو گا۔“ اس نے اصل



جس کا ڈر تھا۔ اب ملکہ جذبات کے مارل ہونے تک سب کچھ اسے ہی سہیٹا تھا۔
”ہائے امی جی، آپ ہوتیں تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

تیزی سے ہاتھ چلاتے اس کے دل سے دہائی نکلی تھی۔ وہ شروع سے اپنا غم، ہنسی میں چھپانے کا عادی تھا۔

☆☆☆

”شانی میرا بچہ، جاؤ اوپر سے اپنا سارا سامان لے آؤ۔ آج فری ماسی کے ساتھ گھر صاف کرواری تھی تو کتنی چیزیں دے کر گئی ہے۔“
نانی نے پڑھنے میں محو شانزے کو دلار سے مخاطب کیا۔ وہ جب بھی پڑھ رہی ہوتی، انہیں اس پر بے تحاشا پیار آتا۔ یہ اور بات کہ ایسا موقع کم ہی آتا۔

”اوپر کیا سامان ہے میرا، صاف ستھرا گھر ہے۔ دو، چار چٹکنیں بچوں کی ہوں گی۔ وہ دے گئیں تو کیا احسان کیا۔“ شانی نے لا پرواہی کا مظاہرہ کیا۔
”دو، چار چٹکنیں، پانچ، سات گیندیں، بلے، نوکر لگے ہیں یہاں سب جو اوپر سے نیچے لا کر دیتے رہیں گے سامان۔ تمہیں ضرورت کیا تھی محلے بھر کے بچوں کو گھر میں گھسانے کی۔“

نانی کا دلار ختم ہوا، وہ اپنے اصلی موڈ میں آگئیں۔ بات ان کی بھی درست تھی۔ اوپر والا حصہ کرائے پر ہی رہتا تھا۔ اب اگر کچھ عرصے سے خالی بھی تھا تو بچوں کو چٹنگ اڑانے یا کھیلنے کے لیے چھت پر جانے کی اجازت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر سست ایسی جا کر دیکھا جھی نہیں کہ کیا، کیا اوپر چھوڑ آئی ہے۔

فری کا سسرال مدتوں سے ان کا پڑوسی تھا سو اچھی میل ملاقات تھی۔ کل ماسی کے ساتھ دو موڑے، چائے کا کپ، گلاس تین چیزیں فری لائی اور کہہ گئی کہ ہم اب شفٹ ہو جائیں گے، آپ باقی

سامان اٹھوالیں۔ وہ تو شرمندہ ہی ہو گئیں جب کمر دے دیا ہے تو وہ خالی ہی ہونا چاہیے تھا۔
”اچھا جانا، ابھی مجھے پڑھنے دیں۔ رات کو لے آؤں گی۔“

شانی نے نانی کی کمزوری پکڑی اور انہماک سے کتابوں پر جھک گئی۔ گویا آج ہی سب گھول کر لپی جائے گی۔ اسے اندازہ تھا کہ ابھی اوپر گئی تو سامان میں رسالوں اور ناولوں کی تعداد ان کو ٹکٹس دلا دے گی۔ اس کا ڈائجسٹ پڑھنا انہیں پسند نہیں تھا۔ اس کے رونے، دھونے پر اجازت تو دے دی لیکن اب بھی ڈائجسٹ دیکھ کر ان کا مزاج برہم ہو جاتا تھا۔
نانی نے غصے سے اسے گھورا اور کچھ کہنے سے گریز ہی کیا۔ شاید اسی بہانے وہ کچھ پڑھ لے۔ چیزوں کا کیا تھا، آئی جاتیں۔

☆☆☆

فری نے میٹرک کیا تھا جب ابو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ابو کے انتقال سے ان کے چھوٹے سے گھرانے میں کبھی نہ پر ہونے والا خلا آ گیا تھا۔ ابو بہت محبت کرنے والے اور خیال رکھنے والے باپ اور شوہر تھے۔ ان کی جدائی سے جہاں فری بہت زور درخ ہو گئی تو امی وہمی ہو گئی تھیں۔ شہر خود لا پرواہ اور اپنی پڑھائی سے دور ہو گیا تھا۔ ابو اسے خود پڑھاتے تھے، ان کے جانے کے بعد اس کا کتابیں کھولنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

دھیال میں کوئی تھا نہیں۔ نہ خیال والے معاشی طور پر ان سے کم تھے لیکن حتی المقدور خیال رکھتے۔ ایک بڑا سا گھر تھا۔ ماموں نے بھاگ دوڑ کر کے ابو کی پنشن جاری کروادی تھی۔ مالی مسائل نہیں تھے لیکن احساس تحفظ کہیں کھو گیا تھا۔ امی کو گھر میں مرد کی کمی شدت سے محسوس ہوتی سو اپنے بیٹے سے بیٹی بیاہ کر انہیں ساتھ ہی رکھ لیا۔

بیٹی بیٹے کے بجائے انہیں پلا پلایا جوان بیٹا مل گیا جو ہاتھوں سے نکلے شہیر پر بھی نظر رکھ سکا اور گھر

چھوٹا تھا لیکن اس پر وہ سمجھ دار ہو چکا تھا۔ چھوٹے کے اکیلے ہونے کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ باہر سیٹل ہونا چاہتے تھے۔

انسان سوچتا ہے اور ہوتا ہے۔ انعام بھائی ابھی گئے بھی نہ تھے کہ انی کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے نے کتنے ہی دن انہیں گھمبیر سوچنے کا موقع نہ دیا۔ پھر انعام بھائی کو ایک بہت اچھی آفر آگئی تو وہ سعودیہ چلے گئے۔ اب تو فری باجی اور بچوں کے کاغذات بھی بن کر آ گئے تھے۔

شہیر کا آخری سمسٹر ابھی باقی تھا۔ انی کے انتقال کے بعد پنشن کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ سوچے یہ پایا کہ اس گھر کو کرائے پر چڑھا کر شہیر چھوٹے سے گھر میں چلا جائے۔ بڑے گھر کو سنبھالنے کا مسئلہ بھی نہیں ہوگا اور آمدنی کا ذریعہ بھی ہو جائے گا۔ فری باجی نے ماموں کی مٹی میں ہی اس کے لیے ایک گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ انعام بھائی کے پاس جانے کی خوشی اپنی جگہ لیکن امی کی یاد، اپنے گھر، بھائی اور ملک سے دوری کا خیال فری باجی کو جذباتی کیے دے رہا تھا۔

آج فری باجی زیور اور قرآن پاک ماموں کے گھر لے گئی تھیں۔ گھر چھوڑنے کا خیال انہیں روہانسا کر رہا تھا سو واپس آ کر آنسو چھپانے کے لیے کچن کے کام میں لگ گئیں۔

”کیا ہے باجی، بچوں کو کیوں چھوڑ آئیں دادی کے پاس۔ کتنا سنا ہورہا ہے گھر میں۔“ شہیر بولتا ہوا کچن میں داخل ہوا، وہ فری باجی کا موڈ ٹھیک کرنا چاہ رہا تھا۔ انہوں نے سلا دکان سے مڑ کر اسے دیکھا۔

”ماموں بہت اداس ہو رہے تھے کہ پھر جانے کب ملاقات ہو، انہوں نے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیا۔“ ان کا لہجہ اداس تھا۔ شہیر نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا۔ اس نے غلط موضوع کا انتخاب کر لیا تھا، پھر رو پڑتیں تو الگ کہانی شروع ہو جاتی۔

”کیا ہمارے ہی ہو، بڑی خوشبو آ رہی ہے۔“

کے دیگر کام بھی کرتا۔ ماموں، مامی کو کیا اعتراض ہوتا تھا۔ ماشاء اللہ پانچ بیٹے اور چھوٹا سا گھر، شادی کے بعد مسئلہ تو ہوتا ہی تھا۔ چلو بہن کے کام آئے۔ اعتراض اگر کسی کو تھا تو وہ تھا شہیر احمد، دلہن کا اکلوتا بھائی۔ ایسی نازک مزاج، بات بات پر لڑنے اور رونے والی باتونی بہن کی رخصتی کے بجائے ایک عدد درعب دار، سنجیدہ اور ذمہ دار بھائی گھر آ گئے۔

وہ اس کی پیچرز سے ملتے، بیک چیک کرتے اور دوستوں پر نظر رکھتے۔ گاہے لگا ہے اسے ماں، بہن سے قریب کرنے اور عملی زندگی میں آنے کے لیے نصیحتیں بھی کرتے رہتے۔ درحقیقت انعام بھائی ان کے لیے تحفہ خداوندی ہی ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں چھوٹو کو بیٹا اور شہیر کو بڑا بھائی بن کر دکھایا تھا۔

انعام بھائی کا سلجھا ہوا رویہ ہی تھا کہ امی کو یکا یک اپنی نازک مزاج بیٹی کے خمرے زیادہ محسوس ہونے لگے۔ وہ فری کو بات بات پر ٹوکتیں، شوہر کا خیال رکھنے کی نصیحت کرتیں، اس کی ماں کے بجائے ماس ہی لگتیں۔

قائد یہاں بھی فری باجی کا ہوا، انعام بھائی چھوٹو کو ماں کی جگہ سمجھتے اور اپنی محبوب شریک حیات کو ماس کے ظلم سے بچا لیتے۔

فری باجی شاید وہ واحد فرد تھیں، جن کی الٹی، سیدھی ضد بھی وہ آرام سے برداشت کرتے۔ ان کے سامنے شہیر کی بھی مجال نہ تھی کہ فری باجی کو کچھ کہتا۔ زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔ فری باجی کے دو ننھے بچے ان کی زندگی کی رونق بڑھانے آ گئے تھے۔

شہیر بھی اب یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر کے کچھ میمرے میں عملی زندگی میں آنے والا تھا۔ گھر کی طرف سے مطمئن ہو کر انعام بھائی نے مستقبل کا سوچ کر ملک سے باہر نوکری کا فیصلہ کیا تھا۔ پہلے شہیر

بات بدلنے کے لیے وہ تندی سے چمن کا مٹا ہوا کرتے آگے آیا۔

”برائی بتائی ہے، بعد میں کون بنا کر دے گا۔“ فری باجی نے خوش گوار لہجے میں کہنا چاہا لیکن جان بھرو ہیں آ کر ٹوٹی۔

”اے بازاری کھانے زندہ باد، شکر ہے اب میں بے فکری سے جودل چاہے کھاؤں گا۔ کوئی ٹوکے گا نہیں۔“ اس نے بٹاشت سے کہا۔

”بیٹا چاروں کھاؤ گے تا پھر قدر آجائے گی گھر کے بازو کھانوں کی۔“ فری باجی نے بھی اپنا مزاج بدلنے کی دانستہ کوشش کی۔

”اچھا ہے، پھر میں ڈھونڈ لوں گا کھانا بنا کر دینے والی، اب تو انعام بھائی بھی نہیں، جو مرضی کرو۔“ اس نے شرارت سے کہا۔

”اے خبردار! جو کچھ الٹا سیدھا کیا۔ دو پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ شبیر کو کہنا، دھیان سے پڑھے، فالتو مشغلوں میں وقت ضائع نہ کرے بلکہ اپنی فیلڈ میں انٹرن شپ کرے اور جاب ڈھونڈے۔“ باجی کی بات اسے تپا گئی۔

”ان کا بس چلے تو دو، چار جاسوس چھوڑ دیں میرے پیچھے۔ میں کہاں وقت ضائع کرتا ہوں۔“

انعام بھائی شروع سے نہ صرف اس کے چال چلن پر کڑی نظر رکھتے تھے بلکہ امتحانی نتائج بھی باریک بینی سے چیک کرتے تھے۔ ان کی سختی ہی تھی کہ عمران سیریز، مختلف میگزین اور ڈائجسٹ پڑھنے کے باوجود اس کا رزلٹ بہت اچھا آتا۔ پڑھتے، پڑھتے اسے لکھنے کا بھی شوق ہو گیا لیکن اس کے لکھنے کا قتل بھی انہیں وقت کا زیاں ہی لگتا۔

وہ کافی عرصے سے مختلف اخبار اور رسالوں میں لکھتا تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرکسی پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔

وہ کافی عرصے سے مختلف اخبار اور رسالوں میں لکھتا تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرکسی پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔

وہ کافی عرصے سے مختلف اخبار اور رسالوں میں لکھتا تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرکسی پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔

”تمہارے بھلے کے لیے تو کچھ تو کرنی ڈھونڈو، تو نہ دار ہو تو تمہارے مشق نہ کرو۔“ فارغ ہوں۔“ باجی نے فوراً اپنے میاں کی طرف داری کی۔

”بھئی، ہمیں کے مل بھر، سیدھا ایسے کچھ میرے سر ہے اور کتنا تو نہ دار ہوں۔“ وہ تڑپ کر بولا۔

”مل بھرنے کے لیے پیسے کمانے ہوتے۔“ ملنے اس کی ہی ممکن تھی۔ شرمندہ کرنے کی بجائے کوشش کی لیکن اس کی ڈھونڈائی ایسے موقعوں پر بہت کام آتی۔

”پیسہ تو بیوی کے نصیب سے ملتا ہے آنے والی اپنا رزق لے کر آئے گی، میں بھی اس کے ساتھ دو، چار نوالے لے لوں گا۔“ اس نے تندی سے کہا تھا لیکن لیوں پر کھینچی شرارتی مسکراہٹ دیکھ کر فری باجی بھی ہنس دیں پھر یاد آنے پر نصیحت کی۔

”صبح صبح شفیق کرنی ہے ہم نے۔ کھانا کھا کر جلدی سو جانا۔“ وہ سر ہٹا کر رو گیا۔

بڑے ٹرک میں بھر کر سارا سامان اکٹھا ہی چاہا تھا۔ وہ سامان لے کر نئے گھر آ گیا تا کہ اپنی عمرانی میں فرنیچر مزدوروں سے درست جگہ پر رکھوا لے۔

بعد میں سیٹنگ کے لیے خوار ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ فری کو ابھی ماموں کے گھر چھوڑ دیا تا کہ بچوں کو کھانا کھلا کر آجائے اور کارشن کھول کھول کر الماری میں کپڑے اور کچن میں برتن رکھ سکے۔

”گھر تو اچھا ہے، اب مالک مکان بھی اچھے نکلیں۔“ سامان سیٹ کر داتے اس نے سوچا تھا۔

ایک بار رات میں وہ فری کے ساتھ گھر دیکھ گیا تھا لیکن مالک مکان سے اس کا کوئی تعارف نہ تھا۔ ای کامیک اور فری باجی کا سسرال اسی محلے میں تھا۔ یہ لوگ ان کے پرانے جاننے والے تھے لیکن اپنی فطری لاپرواہی کے باعث شبیر کا ان سے کوئی

ایک بار رات میں وہ فری کے ساتھ گھر دیکھ گیا تھا لیکن مالک مکان سے اس کا کوئی تعارف نہ تھا۔ ای کامیک اور فری باجی کا سسرال اسی محلے میں تھا۔ یہ لوگ ان کے پرانے جاننے والے تھے لیکن اپنی فطری لاپرواہی کے باعث شبیر کا ان سے کوئی

ایک بار رات میں وہ فری کے ساتھ گھر دیکھ گیا تھا لیکن مالک مکان سے اس کا کوئی تعارف نہ تھا۔ ای کامیک اور فری باجی کا سسرال اسی محلے میں تھا۔ یہ لوگ ان کے پرانے جاننے والے تھے لیکن اپنی فطری لاپرواہی کے باعث شبیر کا ان سے کوئی

ان کے ایک دم بھڑکنے پر شبیر حیران رہ گیا۔ لیکن بزرگ جیسے سو بات پر فوراً کیے نامعاملہ رفع دفع کرنے کی نیت سے ہوا۔

”نوکر والی کیا بات ہے نانی۔ ہم بڑی ہیں، دوستی کی غرض سے کہہ دیا تھا۔ آپ کو نہیں پسند تو جانے دیں۔“

”تم تو حد سے بڑھ رہے ہو بدتمیز، ہماری لڑکیاں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی پھرتیں۔“ وہ غضب ناک ہوئیں اور ان کا جملہ سن کر شبیر حیران اور سمجھ کر شرم سار ہو گیا۔

”سوری نانی میں سمجھا شانی کوئی لڑکا ہے۔“

”بس کر دو اب، ہزار باتیں بنالیں، ایک کام نہ ہوا۔ خبردار جو مجھے آئندہ نانی کہا۔“

نانی کا بارہ ایسے ہی چڑھتا تھا۔ وہ دروازہ اس کے منہ پر بند کر کے چلی گئیں۔ شبیر حیران پریشان کھڑا سوچتا رہا۔

”نئے گھر کی تو ابتداء ہی بری ہوئی ہے، اب آگے کیا ہوگا۔“

☆☆☆

”تم تو میری اپنی بچی ہو فری، معذرت کی کیا بات ہے لیکن اسے بھی بات کرنے کی کچھ تو عقل ہونی چاہیے۔“ پیار سے برابر بیٹھی فری کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے نانی نے بولتے بولتے ترچھی نظروں سے شبیر کو گھورا۔

ایک گھر میں ساتھ رہنا تھا۔ غلط فہمی فوراً رفع کرنے کے لیے ہی فری باجی، شبیر کو لیے نانی کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں۔ نانی کے مزاج کے بھی کیا ہی کہنے۔ پیار سے بیٹی، بیٹی کرتے وہ شبیر کو دیکھتیں تو لب دلچہ و انداز ہی بدل جاتا۔

لمحے کی چوتھائی میں بدلنے والے ان کے

تاثرات شبیر کو حیران کئے دے رہے تھے۔

”بشری انصاری بھی نانی سے ہی سیکھتی ہوں گی۔“ مرعوبیت کے عالم میں اس نے سوچا۔

نانی کے دہنگ انداز کے سامنے اس کی بچی کی

تعارف نہ تھا۔ بس سامان اترواتے ہوئے گھر سے ایک بارہ، تیر سال کا لڑکا لکھنا نظر آیا تھا۔

دُک سے سامان اترتا دیکھ کر نانی اماں کو کرائے داروں کی آمد کا علم ہو گیا۔

شانزے کالج گئی ہوئی تھی۔ گھر میں ہوتی تو

اس وقت ضرور صلواتیں سنتی۔ وہ اوپر سے کچھ نہیں

لائی تھی۔ وہ بیڑھیوں کی طرف کا دروازہ کھول کر منتظر

بیٹھ گئیں۔ کالی اٹھا شیخ کے بعد ایک خوب صورت

جوان مزدوروں کے ساتھ نیچے آیا تھا۔ وہ مزدوروں کو

قارغ کر کے پلٹا تو انہوں نے پیار سے آواز دی۔

”شبیر بیٹا، بات سننا۔“

اپنے نام کی پکار پر وہ چونک کر پلٹا۔ بیڑھیوں

کی سائیڈ پر دروازہ جو پہلے بند تھا۔ اب کھلا تھا۔ ایک

عمر رسیدہ خاتون مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھیں۔

”السلام علیکم آنٹی!“ وہ ان کے سامنے آیا۔

”وعلیکم السلام بیٹا، مجھے آنٹی کہلوانا نہیں پسند

ہے۔ تم بھی سب کی طرح مجھے نانی ہی کہہ دیا کرو۔“

انہوں نے خوش اخلاقی سے فرمائش کی، پھر مقصد پر

آئیں۔

”اوپر جو ہمارا سامان رکھا ہے، وہ یہاں چھوڑ

جاؤ۔“

”کیسا سامان۔“ وہ سمجھا نہیں تو بے اختیار

پوچھا۔

”وہ شانی کے بیٹ بال، کتابیں وغیرہ ہوں

گی۔“ سامان کا درست اندازہ نانی کو بھی نہیں تھا۔

”میں فری کی بات ذہن میں تھی۔“

”جی، جی یہ سامان تو ہے پچھلی گیلری میں رکھا

ہوا ہے، میں لانا ہوں بلکہ آپ شانی کو بھیج دیں۔

میرے ساتھ، میری کتابیں بھی سیٹ کروادے۔“

اس نے ان سے بڑھ کر خوش اخلاقی کا مظاہرہ

کیا لیکن نانی کو کرنٹ لگ گیا۔

”دماغ ٹھیک ہے۔ شانی کیوں تمہاری

کتابیں سیٹ کروائے۔ تمہارے باپ کی نوکر ہے۔“

طرح چلتی زبان خاموش تھی اور وہ نظریں جھکائے
شرمندہ سا بیٹھا تھا۔ اس تمام قصے کے درمیان، وہ
جسے شرم آئی چاہیے تھی۔ ان کی نو اسی شانزے عرف
شانی وہ مزے سے بظاہر چہرہ جھکائے مصروف مگر
مسکراتے ہوئے اس کی بے عزتی انجوائے کر رہی
تھی۔

”اتنی عقل ہوتی تو وہاں اپنے گھر میں ہی رہ
لیتا۔ اسی لیے یہاں آپ کے زیر سایہ چھوڑ رہی
ہوں۔ آپ ہماری بزرگ ہیں۔ اگر کچھ غلط دیکھیں تو
منع کریں۔ اس کی کیا مجال آگے سے چوں بھی
کرے۔ تھوڑا نادان ہے لیکن بدتمیز نہیں میرا
بھائی۔“ فری باجی نانی کے مقابل۔ آج اپنی
ساری صلاحیتیں استعمال کر رہی تھیں۔ شہیر دل ہی
دل میں کراہا تھا۔

”ایک اور دست شفقت؟ اللہ کسی کو جہنم نہ
کرے۔ والدین نہ ہوں تو پورا زمانہ ہی تھا نیدار بن
جاتا ہے۔“ بظاہر توجہ سے سنتا وہ دل ہی دل میں اس
کلاس کے جلد برخاست ہونے کی دعا مانگ رہا تھا۔
ایک طرف رکھے تحت پر سلیقے سے دوپٹہ لیے
شانی بیٹھی اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھی۔ سچی
نظروں کی زد میں خوب صورت پاؤں تھے۔

”لڑکی واقعی پیاری ہے۔“ نانی اور فری کی
موجودگی کے باعث احتیاط سے اس نے پاؤں کا
فرض انجام دیا۔ اب لڑکی خود سامنے بیٹھی تھی تو کیا
دیکھتا بھی نہ؟

”اچھے گھر کا بچہ ہے، ماں کی تربیت تو بولتی ہی
ہے بیٹا۔ تم بالکل بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں خود اس کا
خیال رکھوں گی۔ کیا پڑھ رہے ہو تم؟“ آخر فری باجی
کی محنت کام آئی، نانی نے قدرے نرم لہجے میں اس
سے پوچھا۔ ایک دم مخاطب کیے جانے پر وہ چونکا۔
نانی کو سمجھنے میں مشکل نہ، وسواسان الفاظ کا چناؤ کیا۔
”سولہویں جماعت میں ہوں نانی۔“

”عقل بھی تمہاری سولہویں کے سن میں ہی رہ
گئی، جانتی ہوں ماسٹرز کر رہے ہو۔“ مضمون کیا ہے؟

نانی نے بے ڈاری سے کہہ دیا
شرمندہ کیا۔ شانی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر سہانہ ہنسی
ہنسی روکی تھی۔ حسینہ کے سامنے اس بے عزتی کا
نے منہ ہٹا کر جواب دیا تھا۔
”بائیو کیمسٹری پڑھ رہا ہوں۔“
”چلو اچھی بات ہے، شانی کی پڑھائی میں مدد

کر دینا بلکہ وقت مقرر کر لو تو روز آجانا۔“ نانی نے گویا
سکون کی سانس لی۔ اتنی حسین لڑکی کو ٹیوشن دینے
کے خیال سے جہاں شہیر کے چہرے پر رونق اترتی
وہیں شانی کے ہونٹ سہج گئے۔ اس نے ایک خفاشی
نظر نانی پر ڈالنے کے بعد، نظروں ہی نظروں میں
شہیر کو جھسم کر دینے کی کوشش کی۔ یوں گھر میں نانی
کے زیر سایہ ٹیوشن کا مطلب واقعی پڑھنا تھا۔ نہ یہ کہ
یہاں رہنے آتا، نہ نانی کو یہ نادر خیال آتا۔

☆☆☆

فری باجی، انعام بھائی کے پاس چلی گئیں اور
پچھلے وہ اکیلا رہ گیا۔ انعام بھائی کی سختی نے ایسا کوئی
بے تکلف دوست بھی نہیں بنے دیا تھا۔ جس کے گھر
جاسکتا یا وہ اس سے ملنے آتا۔

ایک دن ماموں کے اصرار پر وہ ان کے گھر
کھانا کھانے گیا لیکن پھر سہولت سے منع کر دیا۔ بہن
کا سسرال تھا آخر، پھر بھابیوں سے تکلف بھی تھا۔
اب دو دن سے وہ بازار سے کچھ لا کر کھا لیتا۔ ارادہ تھا
کہ جلد ہی خود کچن میں اپنی کوکبگ کے جوہر دکھائے
گا لیکن ابھی تک ہمت نہیں ہوئی تھی۔

شہیر لا ابالی تھا۔ تفریح کے لیے دل میں کچھ بھی
سوچ لیتا لیکن ہلکے کردار کا مالک نہ تھا۔ جب ہی اپنے
نیچے والے گھر میں رہنے والی حسینہ کی خوب صورتی
سے وقتی طور پر متاثر ہوا، پھر سب بھول گیا۔ ایسی نظر
نانی کے گھر میں جانا یوں بھی شیر کی کچھار میں گھسنے کے
برابر تھا۔

لیکن نانی جان کچھ نہیں بھولی تھیں۔ اپنے
وقت میں میٹرک کیا تھا۔ اب ان کے خیال میں نانی
نسل کو تو پی ایچ ڈی ہونا چاہیے تھا مگر یہاں نوازا

برت سکیں اور فوراً مطلب کی بات پر آگئیں۔ کھانا انہوں نے شاید اپنے طور پر ٹیوشن کا معاوضہ طے کیا تھا۔

شہیر واقعتاً بھوکا تھا۔ شدید بھوک میں گھر کے بنے کھانے کی آفر ایسی نہیں تھی کہ انکار کرتا۔ بیک میں رکھے سینڈویچ اپنی قسمت کو روٹے رہ گئے اور شہیر نے ڈٹ کر تانی کے ہاتھ کا مزے دار شملہ مرچ قبضہ کھایا۔ اس دوران اندر سے آئی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی اکلوتی اسٹوڈنٹ بھی کالج سے آکر سو رہی ہے اور نیند کے اوقات میں اس جبری ٹیوشن کے لیے شہیر کی طرح بالکل تیار نہیں۔

نانی کے سامنے کس کی چلتی، سو کچھ دیر بعد سلیقے سے دوپٹا اوڑھے، نیند سے بند ہوئی آنکھوں کو زبردستی کھولتی، اپنے حسین چہرے پر بے زاری کے تاثرات لیے کتابیں اٹھائے شانی کی آمد ہوئی تھی۔ شہیر کا تھکا ہوا جسم و ذہن بھی کھانے کے بعد اب آرام کا طالب تھا لیکن نانی تین کپ بھاپ اڑائی جائے لیے اپنا کھانا رزق حلال کروانے سامنے بیٹھی تھیں۔ پہلا دن تھا، تعارف بھی نہیں تھا سو جھجک تھی، کچھ تھے بھی دونوں غنودگی میں سو کورس دیکھ کر اور شانی کی معلومات جانچ کر شہیر اٹھ گیا۔ اس نے ٹیوشن کا وقت رات کے کھانے سے پہلے کا طے کیا تھا۔ اس وقت وہ فارغ بھی ہوتا تھا پھر یہ کہ دوپہر میں تو ادھر ادھر سے کچھ بھی کھا لیتا، اس طرح رات میں اچھے مزے دار کھانے کا آسرا بھی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے کھانے سے پہلے کا وہ وقت نانی کی مصروفیت کا ہوتا تھا۔ وہ اس وقت ہی سالن بتاتیں اور آٹا گوندھ کر روٹی ڈالتیں۔ صحن میں جہاں بیٹھ کر شہیر، شانزے کو پڑھاتا، وہیں سامنے کچن تھا۔ نانی چاہنے کے باوجود ان کے ساتھ نہیں بیٹھ پاتیں لیکن نظر پوری رکھتیں۔ اس بات کا اندازہ شہیر کو تب ہوا، جب وہ بہت محنت سے شانی کو کیمسٹری پڑھا رہا تھا اور وہ محویت سے سنتی سر ہلار ہی تھی۔

صاحب پچاس سال بعد بھی میٹرک سے آگے پڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ شانی بہت ذہین تھی، جتنا پڑھتی اچھے نمبر لے آتی مگر لاپرواہی۔ اعلیٰ تعلیم اس کی ترجیحات میں کہیں نہیں تھی۔ اسے پڑھانے کے لیے بانی کو خود دھیان دینا پڑتا تھا۔

وہ گھر سے باہر جاتی تو بھی وہ پریشان رہتیں، گھر میں اچھا باعتبار ٹیوٹر بہت مہنگا پڑتا۔ اب فری نے جس اپنائیت سے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کروائی تھی۔ اس موقع کو نانی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ تب ہی سہ پہر میں صحن میں ہی چھلتی رہیں، ادھر شہیر اپنے دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوا ادھر انہوں نے صحن سے میٹرھیوں کا دروازہ کھولا۔ شہیر نے اچانک انہیں دیکھا تو سابقہ منظر یاد کر کے سلام کرتے کچھ گڑبگڑا گیا۔

”السلام علیکم آنتی..... نانی..... آنتی۔“ اسے فوری طور پر یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے نانی پکارنے کی رعایت حاصل ہے یا منسوخ ہو چکی ہے۔

”ولیکم السلام بیٹا، آؤ اندر آ جاؤ۔“ پرتیاک انداز میں اسے جواب دیتے انہوں نے کمال مہربانی سے اس کی بوکھلاہٹ نظر انداز کی اور اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس کا جواب سنے بغیر وہ خود صحن میں رکھے تخت کی طرف بڑھ گئیں تو انکار کے الفاظ شہیر کی زبان پر ہی رہ گئے، طوعاً و کرہاً وہ ان کے پیچھے چل دیا۔

”فری کیسی ہے؟ بچے سیٹ ہو گئے؟“ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

”جی، اللہ کا شکر ہے۔“ دل ہی دل میں حیران ہوتے اس نے جواب دیا تھا۔ اس کے حساب سے یہ نانی کا مزاج نہیں تھا۔

”کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟ ایسا ہے کہ میں کھانا لاتی ہوں، کھانا کھا کر پھر تم شانی کو پڑھا دینا۔ روز پڑھانے کا نام اپنی سہولت کے حساب سے سیٹ کر لو کھانا بھی نیچے ہی کھا لیتا۔“ وہ زیادہ دیر تکلف نہ

(الیکٹرونکلیکٹو) بی اے ایڈمنسٹریشن آف انامک لو
 از ریٹ الیکٹرونز)
 نانی کو دور کمرے صرف الیکٹ کا لفظ سمجھ آیا
 تھا۔ اب اتنی انگریزی تو نی دی دیکھ کر ہی آ جاتی ہے
 کہ الیکٹیشن کشش کو کہتے ہیں لیکن یہ مونی سائنس
 کے مضمون میں کون سی کشش ہے، وہ فوراً لپکیں۔
 قتل سے تو لڑکا شریف، بلند کردار لگتا تھا پھر ان کی
 معصوم نوا سی کو کون سی پٹیاں پڑھا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ بن
 میں ابھی، پاس آ کر بولیں۔
 ”کیا کہہ رہے ہو؟“

”جی“ وہ دونوں چونکے تھے۔
 ”ذرا دوبارہ سے اردو میں بولو بیٹا، مجھے سمجھ
 میں نہیں آیا تھا۔“ انہوں نے نرمی سے مسکرا کر کہا۔
 ”کیا بولوں؟ میں نے تو آپ کو کچھ نہیں
 کہا۔“ شبیر نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔ حسب
 عادت نانی کا پارہ لمبے میں چڑھا۔
 ”جو اسے گٹ پٹ کرتے پڑھا رہے ہو، وہ
 بولو۔“ انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔
 ”الیکٹرونکلیکٹو بی اے ایڈمنسٹریشن کی الیکٹران کو کشش
 کرنے کی صلاحیت ہے، جس سے وہ الیکٹران جوڑا
 بناتا ہے۔ جتنی زیادہ الیکٹرونکلیکٹو بی اے ایڈمنسٹریشن کی
 ہوگی، اس کی الیکٹران کو کشش کرنے کی صلاحیت بھی
 اتنی زیادہ ہوگی۔“

شبیر اب کتاب سے دیکھتے ہوئے آہستہ
 آہستہ ترجمہ کرتا انہیں سن رہا تھا۔
 نانی کو کوئی قابل اعتراض مواد نہیں ملا، شانی
 کے چہرے کی حیرت بھی بتا رہی تھی کہ سب ٹھیک تھا۔
 شبیر سے زیادہ انہیں اپنی بچی پر اعتماد تھا۔ دل ہی دل
 میں وہ کشش اور جوڑے جیسے لفظوں پر غور کرتے
 سائنس کے نصاب کو کوسہ واپس باور پچی خانے کی
 طرف مٹا گئیں۔ شبیر اب بھی حیرت سے انہیں دیکھ
 رہا تھا۔

”جی، کن چیزوں پر ڈیپنڈ کرتی ہے
 الیکٹرونکلیکٹو بی اے؟“

انامک نمبر ہے۔“ شانی نے اسے متنبہ کیا۔
 ”جی راست تناسب ہے۔“ یہ تمام اصطلاحات انگریزی
 معکوس تناسب ہے۔“ یہ تمام اصطلاحات انگریزی
 میں استعمال کرنے کی اس قدر عادت تھی کہ انگریزی
 میں ہی نہیں آیا اردو میں کیا بولے۔
 ”آپ آرام سے جیسے سمجھا رہے تھے، ویسے
 سمجھائیں۔ نانی کچھ نہیں کہیں گی۔“ اس کی بول چال
 پر وہ مسکرائی تھی۔ یہ پہلی بار تھی کہ مسکراہٹ تھی جو شبیر
 نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی۔
 وہ بہت شرافت سے نظریں نیچی کر کے پڑھا رہا
 تھا۔

وہ بھی بہت سنجیدگی سے پڑھتی تھی۔ سوال
 جواب کے علاوہ ایک لفظ اضافی نہ بولتی اور بارے
 باندھے پڑھ کر اندر غائب ہو جاتی۔ آج نظر اٹھی تو
 ظہر گئی۔ مسکراہٹ نے اس کی آنکھوں کی چمک
 بڑھا دی تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر پڑتے خم نے اس کے
 حسین چہرے کی دلکشی میں اضافہ کیا تھا۔ بس لمبے
 کا کھیل تھا۔ پھر خود کو ڈانٹتے ہوئے شبیر نے زبردستی
 نظریں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں۔
 ”شیطان کا پہلا وار نظر سے ہی ہوتا ہے۔ نظریں
 حفاظت کرو۔“

اس نے خود کو سمجھایا تھا۔ پھر بھی رات گئے تک
 اسے وہ کھلتی مسکراہٹ اور چمکتی آنکھیں یاد آتی رہیں۔
 ”یہ بات تو طے ہے، شانزے جیسی حسین
 لڑکیاں بے شمار ہوں گی لیکن اس جیسی مسکراہٹ کی
 کے پاس نہیں ہوگی۔“ کروٹ بدلتے سونے سے
 پہلے اس نے فیصلہ صادر کیا تھا۔

☆☆☆

آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن نانی کو اب اس پر
 خاصا اعتبار ہو گیا تھا۔ گو وہ اب بھی ان کے آس پاس
 ہی اپنا کام کرتی رہتیں لیکن درمیان میں ٹوکنے سے
 گریز ہی کرتیں۔ شبیر نہ صرف بہت اچھی طرح
 سمجھتا تھا بلکہ وہ شانزے سے ٹیٹ بھی لیتا اور اس
 کی کارکردگی پر نظر رکھتا۔ یہ اس کی شروع سے عادت

نئی کام آسانی سے نہ کرتا لیکن اگر کرتا تو اسے
دوسری سے انجام دیتا۔

نیمٹ، اس کی غلطیاں، اصلاح سب کچھ تانی
کے سامنے ہوتا تھا سواشانزے کو بھی پڑھائی پر دھیان
دینا پڑتا۔ پھر شہیر کا دوستانہ اور نرم انداز بھی اسے
پڑھائی کی طرف راغب کر گیا تھا۔ وہ بار بار سوال
کرنے پر برا کہیں مناتا تھا، ایک موضوع کو بار بار
سمجھاتا، مثالیں دینے کے لیے بھی روزمرہ کی اشیاء
استعمال کرتا۔ یکسٹری پڑھتے، پڑھاتے وہ تینوں
ایک دوسرے کی یکسٹری جان گئے تھے۔

شہیر آج کل ڈگری پٹنے کے بعد نوکری کی
جاس میں تھا۔ انٹرن شپ ہو گئی تھی۔ فرصت کے ان
دن، رات میں وہ خوب لکھنے پڑھنے پر دھیان دے
رہا تھا۔ اس مہینے کے ڈائجسٹ میں اس کی کہانی
شائع ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ مارکیٹ سے
ڈائجسٹ لیتے وہ پہلے نیچے پڑھانے آ گیا تھا۔
شانزے نے ایک طرف رکھے ڈائجسٹ دلچسپی سے
دیکھے۔

”آپ ڈائجسٹ پڑھتے ہیں؟“

اس نے ڈائجسٹ ہاتھ میں لے کر صفحات
پلٹے پوچھا تھا۔

”جی، پڑھتا بھی ہوں اور لکھتا بھی ہوں۔“
شہیر نے فخر سے بتایا، خوب صورت مسکراہٹ
والی اس حسیہ کو متاثر کرنے کا اس سے نادر موقع نہیں
ملتا تھا۔ وہ واقعی متاثر ہو گئی۔ فوراً سر اٹھا کر تحسین آمیز
انداز میں اسے دیکھا، لہجے سے اشتیاق جھلک رہا
تھا۔

”سچ، آپ واقعی مصنف ہیں۔ پہلے تو کبھی نہیں
بتایا۔“

اس کے انداز پر شہیر کا دل ہواؤں میں اڑنے
لگا تھا۔ وہ اپنے طور پر لمبے قد کا خوب رو، پڑھا لکھا لڑکا
تھا۔ اسے اکثر محسوس ہوتا کہ تانی بھی اسے اپنا داماد
ٹانے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ اکثر اس کی تعلیم، گھر،
باب اور مکتبی وغیرہ کے بارے میں پوچھتی تھیں۔ وہ

خود دل وہاں سے ان کی لڑائی میں آئے کو ہاتھ
دینا آج تک شانزے اس کی کسی بات سے جھڑ
پھٹا نہیں ہوا تھا۔ اب اس کا انداز اسے خوش کر گیا۔
”پہلے آپ نے بھی پوچھا ہی نہیں۔“

اس نے کن اکھیوں سے دیکھتے — اپنے
طور پر ہیرو بننے بہت دلربا انداز میں جواب دیا تھا۔
شانزے اس کی طرف متوجہ نہیں تھی، وہ فہرست میں
اس کا نام دیکھ رہی تھی۔

”میرے بابا بھی شاعر تھے۔“

اس نے دھیمی آواز میں بتایا تھا۔
شہیر کو لمبے کے چوتھائی حصے میں اس کے اس
قدر جذبہ بانی ہونے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ اس کے شوق
میں اسے اپنے باپ کا عکس نظر آیا تھا، اسے ان کی یاد
آئی تھی تب ہی ایک دم اتنی اپنائیت اس کے انداز
میں آ گئی تھی۔

چند لمحوں کے لیے وہ خاموش ہو گیا، اس کی سمجھ
میں نہیں آیا کہ کیا کہے، شانزے کے والدین کا انتقال
ہو چکا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا
تھا۔ شانزے کے جھکے سر پر نظریں جمائے اس نے
الفاظ جوڑے۔

”کیا ہوا تھا نہیں۔“

”روڈ ایکسیڈنٹ۔ امی ہارٹ پشمنٹ تھیں،
ان کے انتقال کے ایک ماہ بعد ہی بابا کا ایکسیڈنٹ ہو
گیا تھا۔ میں سات سال کی تھی۔“ شانزے نے مختصر
جملوں میں پوری زندگی کی کہانی سنا دی تھی۔

شہیر کا دل غم سے بھر گیا۔ اس نے خود تیمی کا
دکھ سہا تھا لیکن اس کے پاس امی تھیں، فری تھی، انعام
بھائی کے روپ میں باپ کی طرح محبت کرنے والا
اور خیال رکھنے والا رشتہ تھا۔ جب کہ شانزے بالکل
اکیلی تھی۔ اس نے آج تک محلے کے چند بچوں کے
علاوہ کسی کو ان کے ہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔

چمکتی آنکھوں میں نمی تھی اور کھٹی مسکراہٹ والا
چہرہ اس وقت شام ڈھلے اداسی کا منظر پیش کر رہا تھا۔
شہیر کا اپنا دل کسی نے مٹھی میں سمجھ لیا تھا۔ اس وقت

کرے۔ محتاط انداز میں انہیں تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

”بیٹا صلاحیت ضائع ہو جاتی ہے لیکن محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ حلال رزق کے لیے کوشش کرنا بھی عبادت ہے۔ بس محنت سے گھر بھر اس پاک پروردگار سے دعا مانگتے رہو۔ رزق کی کچی بہت بڑی آزمائش ہے۔ اللہ تمہیں کامیابیاں دے۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں گزشتہ زمانے کے تجربوں کی گہرائی تھی۔ شبیر بس ’آمین‘ کہہ کر رہ گیا۔

آخر نانی کو خود ہی خیال آیا۔ کمرے کی طرف منہ کر کے انہوں نے شانزے کو پکارا۔
”شانی، چائے بنا لو۔“
”ابھی تو پی ہے نانی۔“

دو پٹا کندھے پر ڈالے وہ کچھ جھنجھلائی ہوئی باہر آئی پھر اسے دیکھتے ہی سرسری سا سلام کرتی ہووے سر پر ڈالتی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ ایک غیر ارادی بھرپور نظر کے بعد شبیر نے نظرس جھکا لی تھیں۔

”مجال ہے جو پوری بات سن لے یہ لڑکی، اب مٹھائی پلیٹ میں کون نکالے گا۔“
نانی اس سے زیادہ جھنجھلا گئیں۔ شبیر خاموشی سے سنتا رہا۔ دل تو کر رہا تھا کہ فوراً اپنی خدمات پیش کرے۔ اس پر ہی چہرہ کے ساتھ کام کرنے کا بھی اپنا لطف ہوتا لیکن پاسان عقل ابھی چھٹی پر نہیں گیا تھا۔
”تم پھر شانی کو پڑھاؤ گے اب یا نہیں؟“
نانی نے خود ہی قصہ کو تازہ کرتے اگلی بات شروع کی۔

”اگلے صبح سے جوائن کرنا ہے۔ پھر جاب کی درست ٹائمنگ کا اندازہ ہو جائے گا۔ ارادہ تو یہ ہی ہے کہ وقت نکال کر ضرور پڑھاؤں گا۔ کافی سلیس تو ہو ہی گیا ہے۔“ اس نے سچائی سے جواب دیا۔
اچھی سی چائے، مٹھائی کے ساتھ لطف اندوز ہو کر وہ خوش خوش وہاں سے آیا تھا۔

اسے اندازہ ہوا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس لڑکی سے دلی تعلق جوڑ بیٹھا ہے۔ اس دن انہوں نے کچھ نہیں پڑھا۔ وہ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کھانا کھائے بنا آ گیا۔ شانزے کے چہرے پر بکھرے یاسیت کے رنگ اسے بہت برے لگے تھے۔

”میں اسے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“
خود سے عہد کرتے وہ بھول گیا تھا کہ ان کا ایسا کوئی تعلق نہیں، جس کی بنیاد پر وہ ایسی خوش فہمیاں پالتا۔

☆☆☆

قسمت اور تعلقات کی بدولت شبیر کو اچھی جاب مل گئی۔ ایپنٹمنٹ لیٹر ملتے ہی وہ فری باجی کی تاکید کے مطابق مٹھائی کا ڈبا ماموں کے گھر لے کر گیا تو نانی کا خیال بھی آ گیا۔

”لیس نانی مٹھائی کھائیں۔“ اندر داخل ہوتے ہی سلام کے بعد اس نے پرجوش انداز میں ڈبا ان کے آگے کیا۔

”خیریت، مٹھائی کس خوشی میں؟“

نانی نے ہاتھ بڑھانے کے بجائے اپنے مخصوص روکھے انداز میں پوچھا، اس کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔

”نو کری مل گئی ہے مجھے۔“ اس نے مرے مرے لہجے میں بتایا تھا۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ میرا بچہ، مرد لوگ محنت کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔“

نانی نے پہلی بار اسے شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور دلار سے پکارتے ہوئے خود آگے بڑھ کر مٹھائی کا ڈبا تمام لیا تھا اور اسے ساتھ لیے برآمدے کے تخت کی طرف بڑھیں۔

”جی نانی، کافی دن سے کوشش کر رہا تھا۔ اللہ کا شکر ہے۔ اچھی کمپنی ہے، تنخواہ بھی مناسب ہے۔ کچھ عرصے بعد تجربہ آ جائے گا تو تنخواہ بھی بڑھ جائے گی۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسا رد عمل ظاہر

شانزے نے نہ صرف بہت خوشی سے مہارکھا دی تھی بلکہ اسے لکھنا نہ چھوڑنے کی تاکید بھی کی۔ وہ اس سے حریف باتیں کرتا چاہتا تھا لیکن نانی آگئیں تو دل سوس کر رہ گیا۔ دو چار لمبے جو نانی اٹھ جاتیں، اسے آزادی کے ملتے۔

☆☆☆

جوائنٹ کے بعد سے شہر کا کافی مصروف ہو گیا تھا۔ نئی جاب کی بے شمار مصروفیات تھیں۔ وہ دو بجے سے کام کر کے جلد ترقی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ناشیے میں تو بریڈ، جام، اسپرید وغیرہ سے کام لگ جاتا۔ لیکن آفس کینٹین سے کرتا۔

رات کا کھانا وہ شانزے کو پڑھانے کے بعد نانی کے گھر کھا لیتا تھا۔ اب نانی اس کی مصروفیت سمجھتے ہوئے اس سے شانزے کو پڑھانے پر اصرار نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے از خود یہ اصول بتایا ہوا تھا کہ اگر اسے دیر ہو جاتی تو کسی پیالے میں ساکن نکال کر سیڑھی پر رکھ دیتیں۔ وہ بازار کی روٹی سے کھا لیتا۔ درمیان والے دروازے کو وہ ویسے بھی لاک ہی رکھتیں لیکن رات میں وہ اسے کبھی نہیں کھولتیں کہ وہ جلدی سو جاتی تھیں۔

اتوار کو وہ گھر کی صفائی اور کپڑے دھو بی کو دینے لینے کے کام کرتا تھا۔ تنہا رہنا اتنا آسان نہ تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔

ان ہی مصروفیات میں کافی دن گزر گئے۔

اس اتوار کو وہ شام ڈھلے ماموں کے گھر سے لٹچ اور چائے پی کر آیا تو نانی نے اسے دروازے پر ہی سامان لی اسٹ تھما دی۔

”یہ کیا ہے؟“

بیکری آئلنگز کے ڈھیروں نام دیکھ کر بے اختیار اس نے پوچھا۔

”نانی کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آرہے ہیں، تم ذرا بیکری سے تازہ سموسے، کپک لادینا۔ یہ سب تو سب باسی اٹھا لاتے ہیں۔“ نانی اسے سامان کی تفصیل سمجھا رہی تھیں اور وہ غائب دماغی سے سر

ہار رہا تھا۔

شانزے کا کہیں اور رشتہ ہونے کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے خیال میں تو وہ ابھی اتنی کم عمر تھی کہ نانی دو چار سال تک اس کی شادی کا ارادہ بھی نہ کرتیں۔

”اتنی جلدی کیوں کر رہی ہیں، ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔“ اس نے نانی کی بات کاٹی۔ بسکٹ کی چٹکی اور چھپس کے کرارے پن پر انکھار مارے کرتی نانی کی زبان رکی۔

”اس کی کوئی دوست اپنے بھائی کے لیے آ رہی ہے۔ ابھی رشتہ ہو جائے گا تو دو، تین سال میں شادی کر دوں گی۔ وہ لڑکا بھی ملک سے باہر ہے۔ تب تک اس کا کافی بھی ختم ہو جائے گا۔“ انہوں نے اس مثل درمقولات پر اسے گھورا لیکن بہت جلد سے سمجھایا۔

شانزے کی لکھائی پڑھتے فہمست کے مطابق سامان خریدتے وہ خود کو چند محسوس کر رہا تھا جو اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں پرانی کر رہا تھا۔ سامان نانی کو کھما کر وہ کمرے میں آکر سر تمام کر بیٹھ گیا۔

”دوست کا بھائی ہے تو شاید شانزے کی پسند بھی ہو۔“ ایک خیال ذہن میں سوئی کی طرح چھپا۔ لیکن لڑکا تو ملک سے باہر ہے۔ دوسرا سلی پنشن خیال بھی فوراً آیا۔

تفنی دیر سوچوں میں الجھے رہنے کے بعد اس نے فری باقی کو کال مانی۔

”تم نے میری شادی نہیں کرنی باقی، امی پوچھیں گی تم سے۔“ چھوٹے ہی اس سے سوال کیا بلکہ خوف خدا یاد دلایا۔

”رات تک تو تمہارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ امی بھی خواب میں آئیں تو انہیں بھی کوئی جلدی نہ تھی تو اب کیا ایرجنسی آگئی؟“ فری نے حیرت سے گلہ توڑ جواب دیا۔

”شانزے کا رشتہ دیکھ رہی ہیں نانی۔“ اس نے ایک جملے میں، لہجے میں درد بھر کر ساری رام کھما

ممائی جان نے اسے باکرانی کے سامنے بجا
بھرے انداز میں کہا۔

”خالہ! یہ اب آپ کا بیٹا ہے۔ ماشاء اللہ بہت
بادب، شریف بچہ ہے۔ شانزے بہت خوش رہے
مگی۔ پڑھائی کا کوئی مسئلہ نہیں، شادی کے بعد بیٹا
چاہے پڑھ لے، یہاں کون سا بھرے سسرال کی
ذمہ داریاں ہیں۔“

وہ بنا وقفہ دیے بول رہی تھیں۔ ماموں اور مائی
مسکراتے ہوئے شہیر کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے
سن رہے تھے اور شہیر میاں بظاہر بہت شرافت سے
بیٹھے، کن اکھیوں سے کمرے میں جھانکتے شانزے
کے دیدار کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلسل ناکامی اور
کانوں میں ممائی جان کی تسلسل سے آتی آواز سے
جھنجھلا کر سوچا۔

”فری باجی اور ممائی جب آپس میں باتیں
کرتی ہیں تو سننا کون ہے۔“

ممائی اس موقع پر کسی ایک بھوکولا کر دوسری کو
شکوے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں۔ سب کو لانا بھی
نانی پر بار ڈالنے والی بات تھی سو اس وقت تین
بزرگوں کے زرخے میں شہیر اکیلا بیٹھا شاندار ماضی کی
ان جیتی یادداشتوں سے فیض یاب ہو رہا تھا، جن کی رو
سے شانزے اور اس کی مائی دو پابند بنیں تھیں۔
اس کی اور شانزے کی امیاں بچپن کی سہیلیاں تھیں
اور پیار، محبت کی یہ کڑیاں تیسری نسل میں آ کر ایک
رشتے میں جڑنے والی تھیں۔ مسکرا مسکرا کر اس کے
جڑوں میں درد ہو گیا۔

”بہت گئی ہے شانزے، یہ نہیں کہ آ کر برتن عی
اٹھالے۔“ ماموں ہو کر اس نے میز پر رکھے چائے
کے برتنوں کو گھورا۔ موبائل کی بجٹی قیل کو اپنے لیے راہ
نجات تصور کرتا معذرت کر کے وہ اٹھ کر جا رہا تھا
جب مائی نے پیچھے سے آواز دی تھی۔

”وقت نکال کر شانزے کو پڑھانے آ جانا بیٹا،
امتحان نزدیک ہیں۔“
اس غیر متوقع آفر پر ایک لمحہ کو اس کا منہ کھلا،

کہہ ڈالی۔
”اوہ، مائی کو پہلے ہی اکیلے لڑکے کو رکھنے پر
بہت تحفظات تھے۔ تم بھی ان کی امیدوں پر پورے
اترے۔ ان کا نمک کھاتے ہو اور ان کی نواہی پر نظر
رکھتے ہو۔“ فری باجی نے چھیڑا۔ یہ سارے بدلے
لینے کا بہترین وقت تھا۔
”ان کا نمک ہی تو حلال کر رہا ہوں، مجھ جیسا
بیرا نہیں کہاں ملے گا۔“ شہیر نے شوخی سے جواب
دیا۔

فری باجی کے فریش موڈ سے وہ جان گیا تھا کہ
انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ تمام خدشات جو اس کے
ذہن میں تھے، اپنی موت آپ مر گئے۔
فری نے واقعی تیزی دکھائی۔ انعام بھائی سے
بات کرنے، مائی سے اجازت لے کر ماموں، ممائی
کو باقاعدہ رشتہ لے کر جانے میں محض دو، تین دن
لگے تھے۔

شہیر کی خوش فہمی البتہ دور ہو گئی تھی کہ اس جیسا
نانی کو نہیں ملے گا۔

انہوں نے صاف بتا دیا تھا کہ شانی کی دوست
کا بھائی انجینئر ہے اور وہی میں جاب کرتا ہے۔
اتنے لوگ ہیں۔ اب دور ہٹے ایک وقت میں موجود
تھے تو سوچ کر جواب دینا تو بیٹا تھا۔

ماموں نے پرانے تعلقات کا سارا زور لگا دیا۔
پہلی کتبہ شہیر کے حق میں تھا۔ اس کے پورے خاندان
سے مائی واقف تھیں۔ وہ خود مبینوں سے ان کی نظروں
کے سامنے تھا۔ اس کے کردار میں کوئی جھول نظر نہیں
آیا تھا۔ ملک سے باہر بھیج کر شانزے کی صورت کو
ترسنے سے بہتر تھا کہ ساتھ ہی رکھ لیتیں۔

جواب کے انتظار میں گزرتے چند دن شہیر پر
بہت بھاری تھے۔ آفس میں بھی اس کا کسی کام میں
دل نہیں لگتا تھا۔ بالآخر مائی نے مثبت جواب دیا۔ اور
وہ کو یا خوشی سے ناپنے لگا۔ چند ماہ بعد جب فری باجی
پاکستان آئیں تو ان کی شادی ہو جاتی، اسی لیے ابھی
محض زبانی کا کافی بات کہی کر دی گئی۔

جب وہ خود میریل جل کر کے اسے دکھانے لگی تو اس کی نظروں کا ارتداد ہی تھا جو اسے کیجوز کر رہا تھا۔

”آپ ایسے مت دیکھیں مجھے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر اپنا احوال بحال کرتے کہا تھا۔
 ”پھر کیسے دیکھوں۔“ شہر نے مسکرا کر ہاتھ بالوں میں پھیرتے، سر دھونے کی پوری کوشش کی۔
 شانزے نے اب کی بار گھبرائے، شرمائے کے بجائے ایک ہل اسے دیکھا اور ایک دم باور پائی خانے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔
 ”بائی!“

شہر گھبرا کر پیچھے ہو کر شرافت سے چٹھا، بائی فوراً سامنے آئی تھیں۔
 ”کیا ہوا؟“

”سر دکھ رہا ہے، چائے بنا دیں۔“
 اس کے جواب پر وہ سر ہلاتی روٹ سوڑ گئیں جب کہ شانزے نے شرافت سے کتاب کھول کر پڑھنے شروع کر دی تھی۔

”نہیں ایسے دیکھیں اور برا سائیں۔“ اس کے زبانی نے سب سے سائنٹس مسکان شہر کے ہونٹوں پر چھلکی تھی۔ وہ اکی سیدھی سادی گئیں مٹی پستانہ، بھٹا تھا۔
 اس دن کے بعد سے وہ دونوں دوستانہ ماحول میں پڑ گئے، اور اس طرح کی باتیں بھی کر لیتے۔
 شانزے کا موہا ل فبر شہر نے لے لیا تھا لیکن کبھی افسار کے کج سے زیادہ وہ اہلہ دکھانا نہ نہیں کرتی تھی۔

شہر کو بھی فیری ہائی کے بے زاری سے سننے لگا پھر اور ان کاٹوں نظر مجھ میں آ گیا تھا، اس نے بھی چھوٹے کاٹا اور کج کر دیا، دوسری صورت میں اسے پورا پھر تو بائی غما مار لیں لیکن بعد میں اس نے ہمائیں کی کی پوری لے لے کر سات اس کی لگی شانزے چاہتے تھیں۔
 ۱۱۱۱۱

آپس اور ٹیشن کے ساتھ اب شہر نے اپنے

جس طرح ابھی شانزے اس کے سامنے آنے سے گریز کر رہی تھی، اس سے تو وہ ٹیشن پر فاتحہ بڑھ چکا تھا۔ اگلے لمحے منہ بند کر کے یا ہو کا نعرہ دل میں دباتے اس نے سر ہلا دیا۔
 ”کوئی تو سبیل لگی۔“ خوشی سے اس نے سوچا۔

رات کو فیری باجی نے بات کرتے ہوئے اسے نصیحتیں کر کر کے اس کی خوشی ملیا میٹ کرنے کی پوری کوشش کی۔
 ”تو کیا کروں میں۔“ بہت دیر تک من من کر وہ آخر چڑ گیا۔

”میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ متنگی کی شرعی حیثیت کوئی نہیں ہے سو۔“ فیری باجی نے بہت دلجمعی سے دوبارہ تقریر کا آغاز لیا لیکن وہ جل کر بات کاٹ گیا۔

”سو جب تک نکاح نہیں ہو جاتا، میں شانزے کو بہن ہی سمجھوں۔“ فیری باجی کے ساتھ ساتھ انعام بھائی کے غیر متوقع نتیجہ کی آواز بھی اسے آئی تو اس نے صوابد لے آ کے لکرا لگایا۔
 ”پہ لکر رہیں، بہن ہی سمجھتا ہوں، خالہ زاد بہن۔“

”تم کبھی نہیں سوسو کر کے۔“ بائی روگنہ باجی نے ہلکا سا کہا تھا۔

اپنی مصروف ترین روٹین سے وقت نکال کر بھی وہ شانزے کو پڑھانے شروع کر دیا۔ بائی پاپلے کی طرح بھی ساتھ دینے لگی اور بھی سامنے ملنے میں کام لے لگائیں۔

انعام میں شانزے نے کافی ٹریس ہوئی، اس کے بھائی نے خاموشی سے سر ہلا کر سن لیا۔ نہ کوئی سوال نہ جواب۔ نظریں ہی ہوں کھلی، انہیں۔
 ”جسے میں سے کسی دم نہ لیا پتا تو جرم ہوگا۔“

اب کہ وہ اب پاپلے کی لہجہ بہت آرام سے اس کے کان سے آواز نکالتے ہوئے تھا۔ اس کے لڑکائی افسوس کی لڑش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لکھنے کے شوق سے بھی رابطہ بحال کر لیا تھا۔ اس دن بھی ڈاکیا کسی کہانی کا اعزاز یہ لے کر لایا تھا۔ شہپر احمد کے نام کا مٹی آرڈر وصول کرتے تانی کو کافی حیرت ہوئی۔ ایسا کون ہے جو اسے پیسے بھیجتا ہے۔ جوان جہان کماؤ لڑکے کو کسی کے پیسے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے ڈاکے سے بھیجنے والے کا نام پوچھا۔

”میرے پاس چشمہ نہیں ہے، یہ پردھو تو کس نے بھیجا ہے۔“

ڈاکے نے مٹی آرڈر پلٹ کر ڈائجسٹ اور کہانی کا نام بڑھ کر بتانے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ بہت جوش سے مبارک باد بھی دی تھی۔ ایسا ہونہارا دیب ان کے گھر میں موجود تھا اور وہ بے خبر تھیں۔ وہ بامشکل اپنا غصہ ضبط کرتی اندر آئی تھیں۔ اندر آ کر وہ منہ سرپلیٹ کر لیٹ گئی تھیں۔ شانزے نے طبیعت پوچھی، چائے لا کر دی لیکن انہوں نے سر سے چادر نہ اتاری۔ وہ اسے اپنی سرخ آنکھیں دکھا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شام کو وہ خود کو سنبھال کر انھیں اور درمیانی دروازہ کھول کر سخت برا بھیشیں۔

شہپر بہت تھکا ہوا اندر داخل ہوا تو درمیان والا دروازہ کھلا دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ آج پھر تانی کو اس سے کوئی کام ہے۔ دل نہ چاہنے کے باوجود وہ سلام کرتا اندر داخل ہو گیا۔ حسب عادت نگاہ شانزے کی تلاش میں دوڑائی، وہ کہیں نہیں تھی۔

”السلام علیکم تانی۔“

”تم کہانیاں لکھتے ہو؟“ سلام کے جواب میں محض سر ہلاتے انہوں نے بلا تمہید پوچھا تھا۔

”جی، جی ہاں..... بس کبھی کبھار.....“ حیرت کے پہلے جھٹکے سے منجھل کر شہپر نے خوشی سے عاجزی کا مظاہرہ کیا۔ یہ اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔

”آئندہ مت لکھنا۔“ انہوں نے حکم جاری کیا۔ اسے دھچکا لگا تھا۔

”کیوں؟“ بے اختیار اس نے تیز لہجہ میں کہا تھا۔

شانزے کمرے کے کھلے دروازے میں جا کر باندھے مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ اس پر ٹکا ہوا ہے۔ اس نے اپنا لہجہ مدھم کیا۔

”لیکن کیوں تانی، اس میں کیا مسئلہ ہے۔“

اب وہ لہجہ کر پوچھ رہا تھا۔

”لکھنے، پڑھنے والے لوگ ہمیشہ اپنا خیال میں رہتے ہیں۔ اپنے یونو پیاسے نکل کر مسائل کا مقابلہ کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ رشتوں کے لیے وہ کبھی سہارا نہیں بن پاتے۔“

”بہت ٹھہر ٹھہر کر کل سے سوچا سمجھا جواب دیا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے، ادیب تو بہت حساس ہے۔ اس سے بڑھ کر کون اپنے رشتوں کے لیے سوچتا ہوگا۔“ وہ جذباتی ہوا۔

”بہر حال مجھے پہلے معلوم ہوتا تو شاید یہ رشتہ نہ ہو یا تا لیکن اب بھی اگر تم اپنی ضد پر قائم رہو تو ہمارا تعلق ختم ہو جائے گا۔“ انہوں نے بحث سے انکار کر فیصلہ سنایا۔

شہپر نے بے یقینی سے انہیں اور پھر شانزے کی ڈبڈباتی آنکھوں اور ساکت وجود کو دیکھا تھا۔

”آپ اتنی سی بات پر ایسا کیسے کر سکتی ہیں ویسے بھی شانزے تو یہ بات پہلے سے جانتی ہے۔“

اس نے دوبارہ تصدیق کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا۔ تانی کی نظریں بھی اس کی سمت تھیں۔ ایک آنسو اس کی آنکھ کے کونے سے نکل کر گال پر بہتا چلا گیا تھا۔ شانزے خاموشی سے مڑ کر اندر بڑھ گئی۔

”تمہارے پیسے۔“

تانی نے اسے متوجہ کیا، وہ اسے مٹی آرڈر کی سلف اور نوٹ تھما رہی تھیں۔ اس نے ان کے چہرے کو کوکھیا، وہ بہت سنجیدہ تھیں۔ تب ہی اس کے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بول گئیں۔

”امید ہے کہ تم سنجیدگی سے میری بات پر غور کرو گے۔“ وہ بہت پڑ مردہ انداز میں اوپر آیا تھا۔

☆☆☆

سوچ، سوچ کر اس کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ آج

کے اور میں بھی کوئی لکھنے والے وہ بھی مرد لکھنے والے کو
ہو چکا تھا۔ وہ کوئی نامور ادیب نہیں تھا۔
پھر جس بھی اس کے لئے اپنے کالمز اور کہانیاں
زندگی بھر کی کمال لکھی تھیں۔ وہ جب بھی کسی کو اس
بارے میں بتاتا تو ہمیشہ سبکی کلمات سنتا۔ انعام
جو ان کو اس کے مستقبل کی فکر تھی، وہ معاشی خوش حالی
پا رہے تھے۔ اس لیے اسے اس فیلڈ میں آنے نہیں
دیا گیا اب تو وہ نوکری کرتا تھا۔ اس کا مستقبل محفوظ
تھا۔ پھر جانی کی بے جا ضد کا کیا مقصد تھا۔ اس گفتگو
میں ہی جانی کا قطعی لہجہ ان کے فیصلے کا غماز تھا۔ پھر
بھی چند دن اسے انتظار رہا۔ شاید ثانی کچھ کہہ دیں۔
انہوں نے کہا بھی تو کیا۔

”تمہارے فیصلے پر ہی اس رشتے کے مستقبل کا
دارومدار ہے۔ سوچ کر تجھے بتا دیتا۔“
وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ کیا کہتا۔ کیا یہ رشتہ اتنا
کچا تھا۔ نہ اس نے شانزے سے رابطہ کیا اور نہ ہی
شانزے نے اسے کوئی مسیج کیا۔ وہ دل ہی دل میں
اس سے خفا تھا۔ ثانی کو سمجھانا اس کا فرض تھا۔ اس
کے گال پر لڑھکھا آنسو اور ساٹ، سپید چہرہ تصور میں آتا
تو اسے دکھ میں مبتلا کرتا لیکن پھر غصے سے سوچتا، رونا ہر
مستے کا حل نہیں۔ میں لکھتا نہیں چھوڑ دوں گا۔ چند دن
بعد اسے فری باجی کا فون آیا تھا۔
”شہیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟“
”کیا ہوا؟“

اس نے ابھی تک اس بات کا ذکر کسی سے نہیں
کیا تھا لیکن فری باجی کے لہجے سے وہ بھانپ گیا کہ
”کس بارے میں بات کر رہی ہیں، پھر بھی بظاہر
انجان بنے ہوئے پوچھا۔“
”آج ثانی سے بات ہوئی تھی میری، دماغ کھما
دیا انہوں نے تو میرا۔“ فری باجی بہت پریشان تھیں۔
”انہیں اور آتا ہی کیا ہے۔“ اس نے بدلی گلی
سے کہا تھا۔ فری باجی نے فوراً ٹوکا تھا۔
”تمیز سے، بزرگ ہیں وہ۔ تم بھی کیا ضد لگا
کر بیٹھے ہو ان سے۔ مان لو ان کی بات یا نہ بھی

مانو تو بس مال دو ابھی۔ بعد میں جو مرضی کر لیتا۔“
”میں کیوں بلاؤں؟ جھوٹ ہوں۔“ وہ چپ
کیا۔ آج کل ویسے ہی اسے بہت فضا آتا تھا۔
”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ خود اتنی دہمی
اور عیاضیں۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں، اچھا ایسا کرو تم
شانزے سے بات کرو۔ جو بھی ہو اب اس مسئلہ
کو حل کرو۔ میں نے انعام کو ابھی کچھ نہیں بتایا۔ بات
باہر لکھنے سے پہلے ختم کرو۔ بے ربط سے جملے بولتے
اور ادھوری باتیں کرتے فری باجی نے فیصلہ صادر کر
کے فون بند کر دیا تھا۔

اس نے فون کو دیکھا اور چند لمحوں کچھ سوچا اور
پھر شانزے کے نمبر پر پیغام بھیجا۔
”کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟“
”رات دس بجے۔“ مختصر جواب آ گیا تھا۔
رات تک وہ بہت کچھ سوچتا رہا۔ وہ اس قصے
میں۔ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ثانی کی بے ٹکی شرط
ماننا، انہیں آئندہ ساری زندگی کے لیے شہ دینا تھا۔
دس بجتے ہی اس نے کال ملائی۔
”السلام علیکم۔“ شانزے نے دھیمے لہجے میں
کہا تھا۔

”وعلیکم السلام، کیسی ہو؟“
وہ کتنے دن سے نیچے نہیں گیا تھا۔ اب آواز
سننے ہی اس کی سونپی ہوئی محبت بے دار ہوئی تھی۔
”اللہ کا شکر۔“ اس نے اب بھی ایک لفظ قائلو
نہیں بولا تھا۔
”تم تو شکر ہی کر رہی ہو، تمہیں کیا پروا، جان تو
میری مشکل میں پھنسی ہے نا۔“ وہ شکوہ کر رہا تھا۔
”آپ ثانی کی بات۔“ شانزے نے کچھ کہنا
چاہا لیکن اس نے فوراً بات کاٹ دی۔
”میں ان کی بات نہیں مان سکتا۔ بلا وجہ کی ضد
لگائی ہوئی ہے انہوں نے۔“
”یہ بلا وجہ کی ضد نہیں ہے۔“
شانزے کی آواز بھیسی تھی۔ اس نے اپنے لب
بھینپے۔

”آپ کو معلوم ہے، میرے ابو کون تھے؟“ میرے ابو فیاض ذکی تھے۔ اپنے وقت کے مشہور شاعر۔ یہ انکشاف اس کے لیے نیا تھا۔ فیاض ذکی کی شاعری اس نے پڑھی تھی۔ ان کی کتاب اس کے انتخاب میں شامل تھی۔ وہ کافی جانے مانے تھے۔ اپنے عروج کے دور میں ایک حادثے میں انتقال کے باعث ان کا زیادہ کام محفوظ نہیں کیا جا سکا تھا۔

”لیکن اس بات کا مجھ سے کیا تعلق؟“ اب اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔ شانزے نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

”میرے نانا ابو کا انتقال ہوا تو ان کی پیشین گوئی، یہ گھر، دکانیں۔ نانی کی معاشی حیثیت مستحکم تھی۔ انہوں نے میری امی کو بہت لاڈ سے پالا اور پھر کالج میں امی، ابو کی ملاقات ہوئی۔ دونوں خوب صورت تھے، خواہوں میں رہتے تھے۔ ابو شاعر تھے، عارضی طور پر کالج میں پڑھا رہے تھے۔ ان کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ نانی کو بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر کچھ عزیز نہ تھا۔ شادی ہوئی۔ ابو نے نوکری چھوڑ دی۔ گھر پہلے کی طرح چل رہا تھا۔ کسی کو فرق نہیں پڑا۔ ابو مشاعروں میں جاتے، اپنی کتاب شائع کروانا ان کا مقصد تھا۔

ان ہی دنوں ایک طرف میری پیدائش ہوئی اور دوسری طرف امی کو پہلا ہارٹ ایک ہوا۔ کچھ عرصے بعد صورت حال بانی پاس کروانے تک آگئی۔ نانی نے اپنی بیٹی کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ابو کی بے توجہی انہیں کڑھنے پر مجبور کرتی۔

میں پانچ سال کی تھی جب امی کے علاج کے لیے نانی نے دکانیں بیچ دیں۔ ان دکانوں سے آنے والا پیسا ابو نے وصول کیا تھا اور اس کا ایک حصہ اپنی کتاب کی اشاعت پر لگا دیا۔ امی کا آپریشن ہوا، وہ زندہ نکلیں۔ نانی کو ابو سے نفرت ہو گئی۔ لیکن وہ مجھے ان کے آسے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔

اللہ جانے ابو میری کفالت کرتے یا نہیں لیکن اس

سے پہلے ہی وہ ایک ایسے نیک انسان تھے جو گھر سے ہو گیا۔ نانی کے دل کا زخم اب بھی گہرا ہے۔“
شاعروں، ادیبوں سے چڑ ہے۔“
وہ اب بچکیوں سے رو رہی تھی۔ شہیرا کی چپ کروانے کے لیے الفاظ نکال رہے تھے۔
لفظوں کو قمر طاس پر خفیل کرنے کے لیے وہ ناپائیدار داؤ پر لگا رہا تھا، وہ اسے دھوکا دے کر ہاتھ بٹھکے۔
شانزے نے فون بند کر دیا۔ شہیرا کے سوچنے کے لیے بہت سے نئے درواہے کھولے تھے۔

نرم و نازک جذبے بیان کرنے والا ادیب، سنگ دل بھی ہو سکتا ہے کہ اسے مرنے والی بیٹی سے زیادہ اپنی کتاب عزیز ہو؟ ایسا ممکن ہے، انسان کے روپ ہزار۔ اللہ کی حیران کر دینے والی محنت۔ شہیرا ہو، ادیب ہو یا کوئی تاجر، ڈاکٹر، انجینئر سب انسان ہیں۔ انسانیت یا اخلاقیات پیشوں سے نہیں آتی۔ لیکن وہ خود کیا کرتا، نانی کے خوف کی خاطر اپنے خواب قربان کر دیتا۔

ابو کے جانے کے بعد وہ بہت اکیلا ہو گیا تھا۔ ان کتابوں نے اسے سہارا دیا۔ پھر اس نے ان کتابوں سے ہی امید بانٹنے کا سوچ لیا۔ دو زعمی کے تلخ حقائق نہیں لکھتا تھا بلکہ امید کے جگنو روشن کرتا تھا۔ وہ جگنو جو پڑھنے والوں سے زیادہ خود اس کی روشنی کرتے تھے۔ تو کیا وہ ایک بار پھر تھا، اسی فخر میں چلا جائے گا۔

☆☆☆

اگلے دن شہیرا نانی کے پاس آیا۔ نانی بہت خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی لاڈلی شانزے کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہے اور کل شانزے نے شہیرا سے بات کی ہے۔ انہیں ہمدردیاں لینے کی عادت نہیں تھی۔ پوری زعمی تہا پہلے بیٹی اور پھر نواسی کو انہوں نے بہت محنت سے پالا تھا۔

ان کا تفتاد دیکھ کر محلے میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ کچھ کہتا مگر شانزے کی خوشی کے لیے انہیں جھٹکا

بھی نہ بتا تو وہ جھک جاتیں۔ لیکن وہ شانزے کو کسی بھی طرح انسان کے حوالے کر کے اس کی زندگی برباد نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے لاشعور میں دبا غصہ ابھر کر سامنے آ چکا تھا۔

انہوں نے شانزے کو فون پر رونے دیا۔ شاید اسی طرح شہر ان کی بات مان لے۔ وہ شانزے کی خوشی نہیں چھین سکتی تھیں۔

”یانی۔“ وہ آکر ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔ انہیں کرنٹ لگا۔ ایسا اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ان کے جھکے سے سر اٹھانے سے قطع نظر وہ سر جھکائے بہت اداسی سے کہہ رہا تھا۔

”آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے نا۔ آپ سب کو ایک ہی نظر سے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ اگر کوئی ایک فرد ہم کی حرمت قائم نہیں رکھ پاتا تو یہ اس کی بد نصیبی ہے۔ آپ مجھے تو بد نصیب نہ بتائیں۔ میں بہت بڑا ادیب نہیں ہوں۔ میں تو بہت معمولی سا انسان ہوں۔ میرے کوئی بڑے خواب نہیں، میرے بہت چھوٹے چھوٹے خواب ہیں شاید میرا لکھا ایک لفظ بھی کسی کی زندگی بدل دے۔“

”ان کہانوں سے زندگی بدلتی تو آج انسان اس حال میں نہ رہتا۔“ انہوں نے نئی سے کہا تھا۔ ”آپ کو پتا ہے، ابو کے انتقال کے بعد میں بہت تنہا ہو گیا تھا۔ انعام بھائی نے میرے بل پر لکھنے کی پابندی لگائی تو کتابیں میری دوست بن گئیں۔ کہانی کا ہیرو میں بن جاتا اور ہیرو کے ابو میرے ابو بن جاتے۔ وہ اسے نصیحت کرتے، کوئی شاہاش دیتے تو مجھے لگتا میرے ابو نے مجھے نصیحت کی ہے۔ یہ ان کے الفاظ ہیں میرے لیے۔ انعام بھائی تو بھائی تھے، ابو وہ نہیں بن سکتے تھے۔“

فری اور امانی تو روتی نہیں لیکن میں کہنے روتا۔ سب کچھ تھے نہیں ان کا سہارا ملتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہونے کے لیے، وہ لے کے لیے، چلنے کے لیے، ہمارا ہونا ہے۔ لفظ میرے دوست تھے۔ انہیں لکھنے والے لوگ تھے، کہنے تھے۔ مجھے نہیں معلوم لیکن یہ

میرے دل پر مہم رکھتے۔ میں اس لیے ہی لکھتا ہوں کہ شاید کوئی اور بھی ایسا بڑا دکھی ہو۔ جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ تو میں اس کا دوست بن جاؤں۔ شاید میرے الفاظ کسی روتے ہوئے کو ہسدا دیں۔ میں ادیب نہیں ہوں یانی، میں تو صرف ان لفظوں کا قرض اتارتا ہوں، جنہوں نے مجھے سہارا دیا۔“ اس کا لہجہ رندہ گیا تھا۔ اس کا یہ روپ یانی کے لیے اور کمرے میں بیٹھ کر توجہ سے سنتی شانزے کے لیے بالکل نیا تھا۔

”شانزے کے ابو نے غلطی کی۔ انہوں نے قسم کی تلواریں اپنے چاہنے والوں کے دل میں کاٹ دیے۔ آپ اس کی سزا مجھے کیوں دے رہی ہیں۔“

اب وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ یانی کو ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے روتی اپنی شانزے یاد آئی۔ جب وہ ڈائجسٹ پڑھ سکتی ہے تو شہر بھی لکھ سکتا ہے۔ ان دونوں نے اکیلے پن کا دکھ سہا ہے۔ شانزے کے احساسات کا خیال شہر سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے فیصلہ کیا اور مسکرا کر نہایت اس کے سر پر لگا گئی۔

”سارے ڈائجسٹ یہیں لٹا دیے۔ کچھ کہانیوں کے لیے بھی بچا لو، کرلو جو مرضی کرنا ہے، میری بات تو کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔“ ان کے مصنوعی ہنسنے کے لیے سے جھلکتی خوشی اور لیوں کی مسکراہٹ نے شہر کو شاد کر دیا۔

”ہرا، یانی زندہ ہاد۔ بس اب جلدی سے فری ہائی کو فون ملانا ہوں کہ آتا ہے تو آئیں ورنہ میں یانی کے بدلے سے پہلے شادی کرنے لگا ہوں۔“ اس نے لہجہ لگا کر کہا تھا۔

یانی نے اسے طعنے سے مگھوڑنا چاہا لیکن شہر دس اداسی کی انسا سمیٹ گئی اور ہر سونو لہجوں کی بہار آگئی تھی۔



مکمل ناول

سرخ و سفید چہرہ کبھی کسی زمانے میں تازہ
مکھاب تھا۔ مکھاب ہوا اب یہ مکھاب کلاسا تھا۔ زرد پڑ
گیا تھا چہرے کے موزوں اور سبک نین نقش مکھنڈرات
میں ماضی کی پُر شکوہ اور خوب صورت عمارت، دیکھنے
والے اب بھی دیکھ سکتے تھے۔ بے حد خوب صورت
غذائی آنکھوں کے پوٹے بند تھے۔ بالکل بند،
پکوں پہ سوہوم سی لرزش بھی نہیں تھی۔

”اللہ ان کے حال پہ رحم کرے۔ پتا نہیں کب
تک یہ اس کو سے کی حالت میں رہیں گی؟“

نرس نے ہمدردی سے انہیں دیکھتے ہوئے اس
اسکرین کی طرف دیکھا جہاں دل کی دھڑکن ایک لکیر کی
صورت میں چل رہی تھی۔ دھڑکن کی رفتار تھوڑی کم تھی
مگر اتنی بھی نہیں کہ خطرے کا گمان ہونے لگے۔
نرس کرتی پہ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھ نوکھنے کی

ڈیوٹی نہیں تھی، اس کے علاوہ کچے بعد دیکھ سکتے۔
نرسیں اور چھٹی بیٹی ڈیوٹی سرانجام دیتیں کہ یہاں بیٹھ
کر اس مشہور اور نامور خاتون کی دیکھ بھال کا فریضہ
انجام دیتیں، جن کے بیٹوں نے لندن کے اس
کلینک میں ایک خطیر رقم جمع کروائی ہوئی تھی۔ وہ نہ
بھی کرواتے تو ماں کی بے حد و حساب دولت اور بے
شمار قیمتی جائیدادیں، ان کا میٹھے سے مہنگا علاقہ
کروانے پر قادر تھیں مگر یہ ناموری اور دولت موت
کی آہٹ اور آمد نہیں روک سکتی۔

بند آنکھوں کے پیچھے ذہن، جسم کی طرح ساکت
نہیں تھا۔ دل کی دھڑکن کی طرح دماغ بھی اپنا کام کر
رہا تھا۔ مگر عام حالت اور عام دنوں کی طرح نہیں، بلکہ
ان کا ذہن اس وقت کسی اور ہی عالم میں تھا۔
اس عالم میں جو نیا دی ذرائع اور علتوں کا تاج

نعیمہ تازہ

روقتی ناول

Parlous Site



نہیں ہوتا، یہ عالم خاص خدا کا تخلیق کردہ، وضع کردہ تھا جس میں بندے کا ہوش میں ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اس کیفیت میں ہوش و حواس برقرار رہنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ زندہ رہنا بھی اتنا ضروری نہیں ہوتا۔

موت سے ذرا پہلے اور موت کے بعد خالق اپنی مخلوق کو وہ سب دکھا دیتا ہے جو اپنی زندگی میں وہ

آنکھیں کھول کر بھی نہیں دیکھ پاتا اور موت یا بے ہوشی کی حالت میں بھی دماغ وہ سب کچھ سوچ لیتا ہے جو اپنے ہوش اور اپنی زندگی میں کبھی نہیں سوچتا۔ بیگم زرتاج مہر اس وقت کچھ ایسی ہی کیفیت میں تھیں ان کی خاموش سماعتوں نے وہ سب کچھ سنا جو ان کے بیٹوں نے باری باری کہا اور اب دماغ وہ سب کچھ دہرا رہا تھا جو سب سے بڑے بیٹے سید عبدالعید خان نے کہا تھا۔

بیگم زرتاج مہر کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو چاروں بیٹوں کو اطلاع کر دی گئی۔ ویسے تو ان کا خاندان بہت بڑا تھا۔ رشتے داریوں در رشتے داریوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ تھا جو دور دور تک پھیلا ہوا تھا کئی شہروں اور کئی ممالک میں، مگر شوہر کی وفات کے بعد خوبی رشتے بس یہی تھے۔

چار بیٹے، اپنے اپنے شعبوں میں کامیاب، مشہور اور دولت مند، جیسے ہی ماں کی نازک حالت کی اطلاع ملی سب نے اپنی اپنی مصروفیت کے باجماع ٹھیکر میں سے بہت سی اہم اور ضروری ملاقاتیں دورے اور میٹنگز ادھر ادھر کیں تب بھی ایک کو آنے میں تین دن لگے، دوسرے کو چار اور تیسرے کو ایک ہفتہ ہی لگ گیا۔

بڑے سید عبدالعید جو اپنے حلقے میں میڈی کے نام سے معروف تھے۔ ویسے تو اپنے بزنس کی وجہ سے وہ زیادہ تر سفر میں ہی رہتے تھے۔ مگر جب ان کے پاس زرتاج مہر کی بیماری کا فون آیا تو وہ مہینے میں ہی تھے جہاں ان کے بزنس کا مرکزی آفس تھا۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کو ایک طرف کرتے کرتے انہیں ماچسٹر سے لندن آنے میں چوبیس گھنٹے لگ ہی گئے۔

اسپتال پہنچے، ڈاکٹر ز سے ماں کے متعلق تفصیل

بریفنگ لے کر ان کے کمرے میں آنے کے لیے کچھ دیر کی اجازت ملی۔ بے حد وجہ اور اس سے بھی زیادہ دولت مند شخصیت، عمر نصف صدی کو تھوڑی سی تھی مگر وقت کی محبوب کی طرح مہربان، بس اس سادہ نرمی اور پیار سے چھوٹا ہوا نکل گیا تھا۔

عبدالعید خان بیڈ کے سرہانے کمرے کے انہی ماں کو دیکھ رہے تھے اور نرس بہت مرعوب و متحیر ہو کر چوری چوری انہیں دیکھ رہی تھی۔ مشہور بزنس ٹائیگون مسٹر میڈی کو، جو اچانک ہی اس کی طرف مڑے تھے۔ نرس گڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

”مجھے ڈاکٹر سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ مسٹر میڈی کی زبان کے ساتھ ساتھ لب ولہجہ بھی برطانوی تھا، کیوں نہ ہوتا ان کی پیدائش ہندوستان تھی۔ پاکستانی نژاد برطانوی مسٹر میڈی، ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتے تھے، نرس نے کروادی۔

ان کی فرمائش یا درخواست سن کر ڈاکٹر زیادہ حیران نہیں ہوا۔ ان کے پاس مختلف مذاہب کے مریض آتے تھے اور اکثر مریضوں کے لواحقین، مریض کے سرہانے بیٹھ کر دعائیں کرنے پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ مسٹر میڈی بھی شاید یہی چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ڈاکٹر سے درخواست کی تھی کہ وہ کچھ وقت اپنی والدہ کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر کو کوئی خاص اعتراض نہیں ہوا۔

”ٹھیک ہے، آپ کچھ دیر مریض کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خوش اخلاقی سے مسکرایا مگر مسٹر میڈی کی اگلی بات پر اس کی مسکراہٹ کچھ ماند پڑ گئی۔

”بالکل اکیلے؟“

”جی، کمرے میں کوئی نہ ہو، نرس بھی نہیں۔“

ڈاکٹر نے چند لمحے سوچا پھر اس نے مسٹر میڈی کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے مگر صرف آدھ گھنٹہ۔“

”مگر یہ تو بہت کم ہے۔“ مسٹر میڈی کے

مقبول عام اور منظور نظر کی حیثیت رکھتے تھے۔

مہرولی کے والد اور دادا نے اس وقت سلطنت انگلشیہ سے وفاداری نبھائی جب برصغیر سمیت قریب آدھی دنیا پر ان کے اقتدار و اقبال کا سورج چمک رہا تھا۔ کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، ہمیشہ طلوع کا سماں رہتا تھا۔

پھر غلاموں کی بے داری اور جی داری نے اور گردش ایام کے مخصوص فلسفے نے آدھی دنیا پر حکمران قوم کو اس کے اپنے شہر لندن تک محدود کر دیا۔ اقتدار و اقبال کا سورج غروب ہو گیا۔ پچھلے غلام اب برابری کی سطح پر آنے لگے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے

کہ انگریز قوم کی وفاداری اور خیر خواہی گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

مہرولی خان ایسے ہی ایک خانوادے کی تیسری نسل سے تھے اور اب چوتھی نسل عبدالعید خان، والدین سے ورثے میں ملنے والی ذہانت اور وجاہت کا نمونہ، اپنی ہی قوم کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھنے کا جذبہ، غرور کی حدوں سے بھی آگے نکل چکا تھا۔

پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد مہرولی خان نے کاؤنٹی میں نئی جائیداد خریدی تھی۔ بے شمار کمروں اور بڑے بڑے ہالوں، وسیع درجوں اور سفید و سیاہ ماربل والی عالی شان حویلی اور اس سے ملحقہ جاگیر، جہاں کے میدانوں اور چراگاہوں میں عبدالعید نے نشانے بازی اور گھڑ سواری سیکھی۔ آکسفورڈ سے فارغ التحصیل عبدالعید کو اس کے دور طالب علمی ہی میں میڈی کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔

والدین کی مصروفیات اپنی جگہ تھیں اور بے پناہ تھیں۔ زرتاج مہر کا نام اور کام ملکی سطح پر اپنی ایک مستحکم شناخت بنا چکا تھا۔

مہرولی کے ملکی و غیر ملکی کاروبار، جائیدادوں اور تقاضا پسندی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی کاروباری مصروفیات اور تفریحی مشاغل میں بھی وہ بیوی اور بچوں کے لیے وقت نکال ہی لیتے۔ عبدالعید کے بعد عبدالہادی جو ہیڈی بن گیا اور پھر دو جڑواں بیٹے

عبدالواسع اور عبدالقاریخ، مہرولی خان کی جان اپنے چاروں بیٹوں میں بندھی۔

”میرا نام اور میرا کام میرے بیٹے زندہ رکھیں گے۔“ وہ فخر سے اپنے بیٹوں کو دیکھتے اور ان کی گردن میں سر یا مزید سخت ہو جاتا۔

سارہ کو کتنی اس مشہور اور بہت بڑی فرم میں ملازم تھی جس کی خدمات مہرولی خان نے اپنی حویلی کی تزئین نو کے لیے حاصل کی تھیں۔ سارہ باہر انٹیریئر ڈیکوریشن تھی۔ ساتھ ہی حسین اور جوان بھی، اس کا حسن وہی تھا جسے مشرق میں، شاعر نے چاند سے تشبیہ دی ہے اور جوانی و سکی جسے شاعر نے کنول

کہا، میڈی اردو شاعری نہیں جانتا تھا نہ ہی سمجھتا تھا مگر محبت کی زبان دنیا کے ہر خطے میں ایک ہی ہے۔ وہ سارہ کے چاند جیسے حسن اور کنول سی جوانی سے ہی متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے غضب کے جمالیاتی ذوق اور نفاست و متانت نے بھی میڈی کا دل جیت لیا کہ وہ دل غزل کہنے کو چاہنے لگا۔

وہ یوں تو وہ کب کا بالغ ہو چکا تھا۔ باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا مگر شادی کرنے کا قدم اکیلے، چپ چاپ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مشرق کی کچھ اقدار اور تہذیب گھر میں ابھی موجود تھیں۔ شادی کے معاملے میں والدین کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ جیسے ہی لیا، ایک بھونچال سا آ گیا۔

”تم پاگل ہو گئے ہو میڈی! تمہیں کوئی اور لڑکی نہیں ملی شادی لیے؟“ زرتاج مہر چلا میں۔

”تم نے اسے پروپوز کیا ہے یا اس نے تمہیں پروپوز کیا ہے؟“ باپ نے سکار کا دھواں اڑاتے ہوئے لہجے میں سختی اور آنکھوں میں خشونت بھری۔

”ڈیڈ!“ میڈی نے ایسے ہی جھٹکے لہجے میں انہیں مخاطب کیا جیسے اس کے دہنی طرف آتش دان میں لکڑیاں سرخ شعلوں کے درمیان جلتے ہوئے رہی تھیں۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہارے ڈیڈ، تم اس

ہے، اتنی مہذب اور آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ، تم نے اس پر بھی غور نہیں کیا؟ تم دونوں کی کتنی دلچسپیاں شوق اور مشاغل مشترکہ ہیں، میں تو اسی مغالطے میں تھی کہ تم زہرہ کو منتخب کرو گے۔"

زرتاج مہربان تھی تھی سی لگ رہی تھی۔ بڑے کی آنکھوں میں بغاوت اور شوہر کی آنکھوں میں سختی اور سرد مہری صاف نظر آ رہی تھی۔

"میں سارہ سے محبت کرتا ہوں۔" میڈی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ وہ مزید کچھ کہنے، سننے کی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے تو یہ محبت بھی تمہارا پیچھا چھوڑ دے گی۔"

مہرولی خان استہزائیہ انداز میں بولے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملاں زلیست آمنہ ریاض 300/-

بڑا آدمی نسیم محرق قریشی 400/-

فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل 300/-

دل اک گلشن رضیہ جمیل 300/-

سوچ مگر کی زانی رضیہ جمیل 350/-

حتا نادرہ خاتون 550/-

چلمن نادرہ خاتون 300/-

پندرہواں گنگوٹے کے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 ادا ہال گنگوٹے، فون: 32216361

اور اس کے بارے میں ایسے اندھے ہورہے ہو کہ کہیں اس پر غور نہیں کیا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔"

زرتاج مہربان تھی تھی سی لگ رہی تھی۔ بڑے کی آنکھوں میں بغاوت اور شوہر کی آنکھوں میں سختی اور سرد مہری صاف نظر آ رہی تھی۔

"میں سارہ سے محبت کرتا ہوں۔" میڈی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ وہ مزید کچھ کہنے، سننے کی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے تو یہ محبت بھی تمہارا پیچھا چھوڑ دے گی۔"

مہرولی خان استہزائیہ انداز میں بولے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملاں زلیست آمنہ ریاض 300/-

بڑا آدمی نسیم محرق قریشی 400/-

فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل 300/-

دل اک گلشن رضیہ جمیل 300/-

سوچ مگر کی زانی رضیہ جمیل 350/-

حتا نادرہ خاتون 550/-

چلمن نادرہ خاتون 300/-

پندرہواں گنگوٹے کے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 ادا ہال گنگوٹے، فون: 32216361

”سارہ کو کون چاہے کتنی ہی بڑی فرم سے منسلک ہو، کتنی ہی ماہر انٹیریئر ڈیکوریر ہو، بھی تو آخر ایک ملازمہ، معادضے کے عوض ان کے گھر کام کرنے والی ایک ملازمہ، اس عورت کو بہو کے روپ میں دیکھنا ان کے لیے تو ناقابل برداشت تھا۔

”مئی! ڈیڈ کو سمجھائیں پلیز۔“ میڈی کا چہرہ غصے اور امانت کے احساس سے سرخ پڑنے لگا تھا۔
”مجھے کنی ضرورت مجھے نہیں، تمہیں ہے۔“ وہ بدستور ہونا کے خوشبودار سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے انگارے چارے تھے۔

”ہم کتنا اور کھوڑا بھی خریدتے ہیں تو اعلانسل کا خریدتے ہیں۔ حسب نسب دیکھ کر خریدتے ہیں تمہاری اگلی نسل کے لیے ایسی عورت نہیں چاہیے جو اپنے بیک گراؤنڈ میں ایک معمولی سا خاندان اور نہ جانے کس قماش کا شوہر رکھتی ہو۔“
مہرولی خان کے لہجے میں ایسی حقارت تھی جو کسی کو کھڑے کھڑے خاک میں ملا دے۔ میڈی بھی ان ہی کا بیٹا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے باپ کے کہے یہ خاک ڈالی اور گھر سے نکل گیا۔

ایک چھوٹے سے فلیٹ میں وہ سارہ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

”مہر! اسے گھر لے کر آئیں، وہ ایسی گندی سندی جگہوں پر رہنے کا عادی نہیں ہے۔“ زرتاج مہر پریشان ہو چلی تھیں۔

”رہنے دو، دو چار دن، دماغ درست ہو گا تو خود ہی واپس آ جائے گا۔“ مہرولی خان اس وقت پیرس میں تھے، بیوی سے فون پر بات کرتے ہوئے لاپرواہی سے بولے۔

”کیسے رہنے دوں، میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں، بہت نازک مزاج ہے وہ، چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی اس نے کم تر معیار پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ پتا نہیں اتنے لو اسٹینڈرڈ آف لائف میں وہ کیسے رہتا ہوگا۔“

”جوانی اور محبت کا نیا نیا شمار ہے، یہ بینک اور

قسط ہو گا تو اپنے نکل اور نکل کی ساری آسائشیں آ جائیں گی۔“

مہرولی کے یہاں فولاد کے کارخانے تھے، مزاج اور دل بھی اپنی فیکٹری کے خام مال جیسا ہلکا تھا۔ انتہائی سخت۔ یوں بھی بیٹے کے اس معاملے میں نرمی اور لچک دکھانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

زرتاج مہر اپنے وسیع و عریض پیڈروم میں بیٹے چینی سے بھل رہی تھیں۔ انتہائی قیمتی سا کوان کی لکڑی سے بنے بھاری فرنیچر سے آراستہ وہی اس کمرے میں دیوار پر آویزاں مائیکل انجیلو کا منظر و نایاب شاہکار سارہ کو کون کا منظر کردہ تھا۔ تصویر میں حضرت بی بی مریم خنصہ عیسیٰ کو گود میں لیے ہوئے تھیں، زرتاج مہر تصویر کے سامنے کھڑی اسے دیکھتے ہوئے معید کو یاد کر رہی تھیں، ان کے کانوں میں شوہر کے الفاظ گونج رہے تھے۔ پہلا نشہ اتارنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سے اگلا نشہ انتہائی اثر انگیز ہو۔ اس پہلو پر سوچتی رہیں، سوچتی رہیں پھر ان کی سمجھ میں آئی گی کہ سارہ کو کون نامی نشے کا توڑ کیا ہے۔

☆☆☆

قضا میں بھاری خوشبو رچی ہوئی تھی، سبز گھاس کی نئی جوتوں تلے محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر دکھائی دے رہی تھی۔ یہ بہت ہی وسیع و عریض قطعہ زمیں تھا۔ جا بجا پھولوں کے تختے اپنی شان دکھلا رہے تھے، خوشبو مہکار ہے تھے۔ اسٹنڈرڈ اپ، ڈیزل، گی، گلاب اور بلو بلز، وائلٹ اور پرم روز نے چاروں طرف آتش بازی کا سماں باندھ رکھا تھا۔ رنگ برنگ پھولوں سے پھولوں نے قضا میں آگ جس کی میٹھی میٹھی آنکھیں نظروں کو، دلوں کو فرحت بخش رہی تھی۔

معید کے ہمراہ ٹہلنے ہوئے زہرہ پروین نے ایک نظر اسے دیکھا، جو جدید فیشن کے گرے سوٹ میں ملبوس انتہائی وجہہ لگ رہا تھا۔ اس نے آڈی مانگ نکال کر بال بنائے ہوئے تھے۔ زہرہ کو ہاتھ

پوری طرح اٹھان پڑا تھا اسے دیکھنے کے لیے۔ وہ
 قہقہے اٹھاتے دروازے پر تھکا ہوا بھی مگر معید کے
 پر بھی کتہے تک ہی آتی تھی۔
 ”تو اس بار اپنی سالگرہ تم اکیلے ہی منا رہی ہو؟“
 باغ کی روش پر ہلکتے ہوئے معید نے اس بے
 پرواہ صورت لڑکی کو مخاطب کیا جو فل اسکرٹ اور
 گلابی رنگ کے بلاؤز میں ملبوس تھی، سلی سیزن
 (سوم ببار) کی رعایت سے اس نے بہت ہی
 خوب صورت ہیٹ سر پر پہنا ہوا تھا۔ گلابی ربن اور
 پھولوں سے آراستہ وہ جامہ زیب تھی جو چھٹی اس پر
 یوں سج جاتا جیسے اسی کے لیے بنا ہو، بوڈا اسٹریٹ کی
 ایک ماہر مشاطہ نے اسے یوں سنوارا تھا کہ میک۔
 اپ کہیں نظر نہیں آتا تھا، نظر آتے تھے تو اس کے بے
 حد جاذب نظر اور دلکش نقوش۔

”اکیلے؟“ زہرہ نے اپنی بے حد خوب
 صورت مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ ”تم ہونا
 میرے خاص مہمان۔“

”میرا خیال تھا کہ ہر سال کی طرح بہت بڑی
 اور شان دار تقریب ہوگی۔“

”اوہ، وہ جب کی بات تھی، جب میں چھوٹی
 تھی۔ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ میں نے پایا ہے
 کہہ دیا تھا کہ اٹھارویں سالگرہ تک آپ کی مرضی
 چلے گی، اس کے بعد میری، سو، اب آج اپنی
 انیسویں سالگرہ میں اپنی مرضی سے منا رہی ہوں۔“

زہرہ اس کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر ہلکتی جا
 رہی تھی، بولتی جا رہی تھی یاغ کے پرندوں کی چہکار بھی
 اس کے لفظوں کے ہمراہ تھی۔

”فقط ایک مہمان کے ساتھ۔“ معید
 مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے وہ گریگوری پیک سے
 بہت مشابہ نظر آتا تھا مگر اس سے زیادہ وجیہ اور
 شان دار دکھتا تھا۔

”بہت بڑا اجہوم جس سے آپ اجنبیت محسوس
 کریں، اسے اکٹھا کر کے کیا کرتا ہے، اس سے بہتر
 ایک دوست کا ساتھ ہے جو مانوس ہو، اپنا ہو۔ جس

کی قربت دل کو خوشی دے۔“
 ”تم جانتی ہو زہرہ! میں سارہ سے محبت کرتا
 ہوں۔“ معید اچانک ہی بولا تھا۔
 ”تم مجھے بتا رہے ہو یا خود کو؟“ زہرہ کی ہنسی
 بڑی جان لیوا تھی۔

معید کا دل کئی وادیوں میں بھٹک رہا تھا، ساری
 وادیاں بڑی حسین اور دل لبھانے والی تھیں۔ زہرہ
 نے ہنستے ہنستے اس کا ہاتھ تھاما۔

”میڈی! میں پہلی بار تم سے ملتی تھی تو بارہ سال کی
 تھی اور تم سترہ سال کے، سات سال ہو گئے ہیں ہماری
 دوستی کو اور میں صرف اپنے دوست کو اپنی خوشیوں میں
 شریک کرنا چاہتی ہوں، اس سے، اس کی خوشیاں نہیں
 چھیننا چاہتی۔ کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟“ زہرہ نے دفعتاً
 ہی اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ معید کے چہرے پہ
 ندامت کا سایہ لہرایا۔

”تو پھر، کیا پروگرام ہے؟ پکا ڈلی چلیں۔ ٹریفنگر
 اسکوائر پر کیڑوں کو دانہ ڈالیں گے اور پھر ویسٹ اینڈ
 چلتے ہیں، تھیسز دیکھے ہوئے بہت دن ہو گئے۔“
 ”یا پھر؟“

”یا پھر میں، تم، پیانو اور گیت۔“ زہرہ نے
 دوسرا آپشن بتایا۔

معید کی آنکھوں میں ایک غیر محسوس سی چمک
 آگئی۔

”بورنگ تھیٹر سے بہتر ہے، تمہاری سریلی
 آواز میں مدھر گیت سن لوں۔“

زہرہ بچپن سے ہی پیانو سیکھ کر بجا رہی تھی اور اب
 موسیقی میں پیکر کر رہی تھی، آخری سال تھا۔ وہ ایک
 منجھی ہوئی خوش گلو آریسٹ تھی۔ معید پہلی بار اس سے ملا
 تو وہ پیانو ہی بجا رہی تھی اور معید کی طرف اس کی پشت
 تھی۔ معید نے اسے دیکھنے سے پہلے اس کی دلکش دھن
 سنی تھی۔ اس سے پہلا تعارف موسیقی ہی تھی۔

”ٹھیک ہے، تو پھر آج کی شام تمہارے
 نام۔“ زہرہ نے آنکھوں میں ستارے بھر کر اسے

جناح کی۔

آج کی شام بارے نام۔ مسجد نے اس کا
نرم ہزارک حصن ملائی سا ہاتھ تمام کر کہا۔
نفسا میں پھولوں کی مہک کچھ اور بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

یہ اسرار آتھن سولسری، موتیا اور رات کی رانی
سے مہک رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سرخی میں آگ
دک رہی تھی۔ امیل مانے لائیں روشن کر کے کل
پہنکائی، گھر بھر کے ذرے اور چاقوں میں چرناغ پہلے
تی روشن کر چکی تھیں، اب کھکی تھکی سی دو شاگرد چھپے گی
طرف جارہی تھیں۔

مغرب کی آذان کے لیے بلا صاحب کی
خصوصی اللہ اکبر کی صدا آنے ہی والی تھی۔ جب تک
وہ وضو کرتیں، لہذا ان پوری ہو جاتی اور روایت بامند
کر چکی پہ نماز کے لیے کھڑی ہو جاتیں۔ مرد
صاحبان مغرب بڑھ کر واپس آتے اور ان کے لیے
کھانا لگتا، اس کھلے اور بڑے سے محن میں جہاں
چوڑی چوڑی کیاریوں میں سجے رنگ برنگے پھول
پوری فضا اور ماحول کو معطر کیے ہوئے تھے۔
”خدا جانے باہر کیا حال ہے، قاسم علی آئے
تو اس سے پوچھوں۔“ وضو کرتے ہوئے ماہرمت بی
نے سوچا۔

نماز بڑھ کر قارغ ہوئیں تو باورچی خانے سے
کھڑ پڑ اور محن سے مردوں کی آوازیں آ رہی تھیں،
اب خادما میں کھانا لگا میں کی، پہلے تو رحمت بی بھی
ان کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتی تھیں مگر اب
پچھلے دو سالوں سے ان کی بیماری اور ضعف کی وجہ سے
ان پر کام کا بار بہت ہی ہلکا کر دیا گیا تھا۔ ان کے
مالکان وضع دار اور مہربان تھے۔ ان کا بھی خیال
رکتے تھے اور ان کے بیٹے کا بھی جو اسی گھر میں ملازم
تھا۔ باہر کے سارے کاموں کی ذمہ داری اسی کی
تھی۔ رحمت بی کا کام اب صرف اتنا تھا کہ وہ کھانا
پکانے کے دوران ملازماؤں کی نگرانی کرتیں۔ مریج
مسالوں کا تناسب ان ہی کی مرضی سے طے ہوتا کہ

پچھلے بیس سال سے اس گھر کے مالکان ان کے
کے ذائقے کے عادی ہو چکے تھے۔
آج سے بیس سال پہلے چالیس سال
میں بیوہ ہو کر وہ اس گھر میں ملازمت کرتی
تھیں، گود میں چھوٹا بچہ، جسے وہ اپنے گھر
بامند کر رکھتی تھیں، اس سے پہلے تو وہ اپنے
نے دیں اور واپس لے لیں، اب ان کے
امیدوں کا مرکز اور خوشی کا محور ہے سہو کا
نماز کے بعد حسب عادت بہت ہی تیز
کر دو قارغ ہوئیں تو محن میں گھر کے چاروں
صاحب خانہ میرد جاہت حسین ان کے بیٹوں
میر شجاعت حسین و میر سعادت حسین اور میر
میر سلامت حسین جو اس گھر میں تیسرے
حیثیت رکھتا تھا۔ تقریباً کھانا کر فراغت پانچ
والے تھے۔

آج بڑی بیوہ (میرد جاہت کی والدہ)
ہدایت پر رحمت بی نے گوشت کا قلعہ اور مٹی کی پائے
میں مٹی اڑو کی دال پکائی تھی یا پکوائی تھی۔ بکری
گوشت کے کباب اور رومانی چپاتیاں جو فیروزہ
عمدگی سے پکانے لگی تھی۔ کھانے کے بعد قاسم علی
حقہ تازہ کر کے میرد جاہت حسین کے آگے رکھا۔
”حالات کی کیا خبر خبر ہے؟ میرٹھ سے جو خبر
آئی تھیں اور پھر بجنور سے دوسرے علاقوں سے اور
دہلی کے حالات۔“ سب ہی بہت فکر مند تھے۔
”شروعات میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی جو
دانتوں سے کاٹے جانے والے کارتوس کے بار
میں خبر گرم ہوئی کہ اس میں حرام جانور کی جڑ لگی ہے
مسلمان سپاہیوں نے انگریز کمان افسر کے ہم
کارتوس کاٹنے سے انکار کیا اور حکم عدولی کی سزا پائی
رسالے سے ستر سے اسی مسندوں کو جن جن کر نکالا
اور انہیں پابجولاں بازار میں پھرایا گیا، اگلے
رسالے کے دوسرے سپاہیوں نے بغاوت کر دی،
مسلم ہو کر چھاؤنی پہنچے اور فرنگیوں کے بنگلوں
آگ لگا دی، اپنے آقاؤں کو جانی و مالی نقصان

آزادی، کی لہر کو فرو کیا، فتح یاب ہوا تو مفتوح قوم اور افراد کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی شدید اور سخت تھا۔ برصغیر پر مغلوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اور اب تخت و بخت کا ہوا انگریز کے سر پر بیٹھا تھا جس نے ساجد حکمران قوم یعنی مسلم قوم کو تباہ و برباد اور ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

زوال اک دم نہیں ہوتا، پست بہتی، نا اعلیٰ عیاشی، آپس کی ریشہ درانیاں، دور جدید کے تقاضوں اور علوم سے بے خبری و لاپرواہی، اس قسم کے بہت سے عوامل تھے جنہوں نے دیمک کا کام کرتے ہوئے برصغیر پر مغلوں کے پایہ تخت کو کھوکھلا کیا اور دھیرے دھیرے وہ زوال کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ علامہ اقبال نے اس سارے عمل کو فقہ ایک مصرعے میں یوں بیان کیا ہے کہ

”ہے جرم معصی کی سزا مرگ مفاجات۔“

جب گیسوں پستا ہے تو صحن بھی ساتھ میں پس جاتا ہے۔“

1857ء کے بعد مسلمان، انگریز کے عتاب کا شکار ہو گیا، ہر مسلمان سزا بھگت رہا تھا، عام ہو یا خاص، امیر ہو غریب، سب پر قیامت ٹوٹ پڑی، سب سے پہلے تو بادشاہ اور ان کا خاندان ہی اس ظلم و ستم اور انتقام کا نشانہ بنا۔ شہزادوں کے سر کاٹ کر طشت میں سجا کر ایک باپ کے سامنے پیش کیے گئے جو بد قسمتی سے معزول بادشاہ تھا۔ محلوں میں ناز و نعم سے ملنے والے شہزادے، شہزادیاں جو موت سے بچ گئے تو در در کی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور ہوئے۔

ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بھانسی پہ چڑھائے گئے۔ ہندوؤں کی باڑھ کے آگے گرائے گئے، جیلوں میں قید ہوئے، کالے پانی کی سزا ہوئی، جائیدادیں ضبط ہوئیں۔

جو عرش پہ تھے، فرش پہ آ گئے، جو معزز تھے عزت دار تھے، ذلیل خوار ہو گئے، بادشاہ سلامت بہادر شاہ ظفر رنگون کے قید خانے میں اسیر ہوئے اور وہیں فوت اور دفن ہوئے۔

پہلا دن۔ بدھ ماہ 10 روزہ تھا برطانیہ 1857ء کے پہلے روز یہ سپاہی دلی پہنچے اور انگریز کے خلاف مہم بغاوت بلند کیا۔ انگریز نے اس لڑائی کو بغیر کام دیا جو بدترجیب سنی شہروں میں پھیل رہی تھی مگر حقیقت اس جنگ میں مسلمانوں کے پاس کوئی واضح حکمت عملی اور مضبوط منصوبہ بندی نہیں تھی، بغاوت کا بھی فقدان تھا۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر بے دست و پا تھے، اختیار تھا نہیں، اقتدار نام کا تھا، خزانہ خالی تھا، جدوجہد آزادی کے سپاہیوں کو دینے کے لیے تنخواہ بھی نہ کوئی مالی مدد، بادشاہ سلامت خود انگریزوں کے دہشت خوار تھے اور ان حالات میں وہ وظیفہ بلانا بھی بند ہو گیا تھا۔ فوج کے پاس خوراک بھی نہ اسلحہ، اندرونی انتشار و اختلاف الگ تھا۔

جنرل بخت خان نے اپنی سی کوشش کی مگر وہ کام رہا۔ انگریز نے اپنی حکومت کو جو اس وقت کمپنی کی حکومت کہلاتی تھی۔ مستحکم کرنے اور رکھنے کے حکم اقدامات کیے ہوئے تھے۔

ان کے جاسوس مختلف شہروں خصوصاً دہلی شہر میں پھیلے ہوئے تھے جو پل پل کی رپورٹ سے سرکار انگلیہ کو آگاہ کر رہے تھے۔ ان جاسوسوں میں مقامی ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، انگریزی جاسوسی کا نیٹ ورک اور انٹیلی جنس نظام منظم اور مربوط تھا جس کی پہنچ اور رسائی فوج کے اندر تک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز نے حکومت پر پڑنے والی اس آخری ضرب کو بھی با آسانی تہہ تیغ کر دیا اور اب اگلے نوے سالوں تک کے لیے وہ اس برصغیر پہ حکومت کرنے کے لیے آزاد تھا۔

1947ء تک وہ یہاں براجمان رہا تاوقتیکہ مسلمان ہند نے قائد اعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں اپنے لیے ایک علیحدہ مملکت بنام پاکستان نہ مانگ لی۔

انگریز نے اپنے خلاف اٹھنے والی جدوجہد

کرتا ہے بد نصیب قنبر کہ فن کے لیے
 دو گز زمین بھی نہ ملی کوہئے یار میں
 چشم فلک اس اٹھارے سے ممکن ضرور بھی مگر
 حیران نہیں، وہ تو ہزاروں سالوں سے یہ مناظر دیکھ
 رہی تھی اور سحرانی و جہاں بانی کے معاملے میں اللہ کا
 قانون جانتی تھی کہ جب کوئی قوم زمین پہ حکومت و
 قیادت کے قابل نہیں رہتی اور زوال و تباہی کا شکار
 ہونے لگتا ہے تو اللہ اسے ہٹا کر دوسری قوم لے آتا
 ہے جو جانشینی کی اہل ہوتی ہے، وہ اقتدار کے
 ستم خان پر ارجحان ہو جاتی ہے۔

جو ہاتھ بڑھا کر اٹھالے، جام اسی کا ہے
 تو 1857ء میں قلم و زوال کا شکار ہونے
 والے مسلم معاشرے میں دہلی کے بہت سے
 گھرانوں کے ساتھ ساتھ میر و جاہت حسین کا
 گھرانہ بھی تھا جنہیں قلعہ والوں کے ساتھ تعلق و
 ہمدری اور تعاون کے صلے میں لرزہ خیز نتائج کا
 سامنا کرنا پڑا، ان کی ساری جائیداد ضبط ہو گئی اور گھر
 کے تمام مردوں کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ گھر کی عورتیں
 اور بچے در بدر ہو گئے۔

☆ ☆ ☆
 چراغ کی لرزنی روشنی کا سایہ سفیدی پھری
 دیوار پہ پڑ رہا تھا، وہ پانچ بڑھیا عورتیں جو
 دائرے کی شکل میں بیٹھی تھیں، مغموم، بے بس اور
 آزر دو۔

”بچے، بھال، یہ کیا ہم پر بادشاہی کریں
 گے۔ بنیا گیری کرنے آئے تھے، محل میں کس پیشے،
 قلعے کے داروغہ بن گئے۔“

ایک بڑھیا نے جلے دل کے پھپھولے
 پھوڑے، اس کے جبر یوں بھرے چہرے پہ حزن و
 ملال کی کیفیت تھی اور دم دھیسے کی بھی۔

”ارے یہ موئے فرنگی، ان کی توپوں میں
 کیڑے پڑیں۔ مریں تو ناپاک جالور کا منہ ہو۔ کوئی
 پانی پکانے والا نہ ملتا تھا۔ ارے ڈھائی گھڑی کا
 ہیچ۔ آئے۔“ دوسری بڑھیا نے دوپٹے کی جھولی

پھیل کر منہ بھر بھر کو سنے دیے۔

”چوٹے، لٹیرے میں ان کو روکی، بھتی کھاؤں،
 لاٹ صاحب کی بھتی کھاؤں، شاہ جادو کی بھتی کھاؤں،
 جو رو کی سب کی بھتی کھاؤں“ (کسی کے سر سے
 کے قریبی رشتے کے گھر سے آئی روٹی، کھانا) بڑھیا
 بڑھیا نے ہاتھ چلا چلا کر بد دعائیں دیں۔

ایک مصرعہ طرح پہ غزل کہنے کی باری
 بڑھیا کی تھی جس کے سفید جھک ہال چراغ کی
 میں چمک رہے تھے، اس کی غلامی آنکھوں میں
 ٹہرا ہوا تھا۔ اور سینہ غم کی شدت سے جل رہا تھا۔
 نے ایک نظر اپنی ساتھیوں پہ ڈالی۔

”میں اللہ کے آگے جھولی پھیلاتی ہوں
 ولایت میں گدھے مل چلاؤں۔ الو بولیں، گیدڑ
 کی منخوس آوازیں سدا ان فرنگیوں کے کانوں
 رہیں۔ اونٹ پہ چڑھ کے کتا کائے انہیں، اللہ
 نازل ہوا ان پر، اللہ کا غضب ٹوٹے۔“

وہ بھی اپنا فرض ادا کر کے خاموش ہو گئی،
 سب خنجر نگاہوں سے پانچویں بڑھیا کو دیکھ
 تھیں جو سر جھکائے، آنکھیں بند کیے جانے
 گہری سوچ میں گم تھی۔

”رحمت بی! کن خیالوں میں گم ہو؟“
 بڑھیا نے رحمت بی کو ہاتھ لگایا۔ ہاتھ لگاتے
 کسی ٹھٹھری کی طرح آگے کو لڑھک گئی۔

”ہائے رحمت بی!.....!“ چاروں بڑھیاؤں
 بیک وقت لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔

☆☆☆

دہلی جو عالم میں انتخاب تھا، ہندوستان
 جان اور اس کا دل تھا۔ اس شہر میں، اس دل
 قیامت کا سماں تھا۔ انگریزی توپوں کے دھماکے
 آگش ناک گولے قلعے کی سمت برسار رہے تھے جن
 دہشت ناک آوازوں سے دل سہے جاتے تھے
 مغل بادشاہت آخری سانس لے رہی تھی، تختہ
 تاج لٹ رہا تھا، دہلی کے لال قلعے میں بار
 ہر اس کا منظر تھا۔ سب اپنی اپنی جانیں بچانے۔

مخبری کس نے کی؟

☆☆☆

قلیت چھوٹا تھا، کم از کم اس محل کے مقابلے میں تو کچھ نہیں تھا جہاں سے معید آیا تھا مگر پھر بھی خوب صورت، انفاست اور عمدگی کے ساتھ کچھ اور دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کسی سے آرتھک ذہن کا کارنامہ ہے۔ زہرہ نے قریب نظروں سے درود یوار کا جائزہ لیا اور معید کی طرف متوجہ ہوئی۔

”پھر؟ تم لوگ شادی کب کر رہے ہو؟“

میڈی اپنے ہر دوست کو اس قسم کی سوالی اجازت بھی نہیں دے سکتا تھا مگر زہرہ اس کی بہت خاص دوست تھی وہ معید سے ہر بات کر سکتی تھی سوال کر سکتی تھی، بے تکلفی سے کوئی بھی فرمائش کر سکتی تھی، ہر بات اس سے منوا سکتی تھی۔

”بہت جلد! سارہ کے کچھ پروجیکٹ ہیں، ختم ہو جائیں پھر۔“ معید کا لہجہ ذرا ڈھل مل ساتھ ”کافی پیو گی؟“ وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

”ہاں، تمہارے ساتھ کافی پینا یقیناً بہت اچھا لگتا ہے مگر یہاں نہیں باہر چلتے ہیں۔“ زہرہ مسکراتی اور یہاں سے وہاں تک روشنی سی پھیل گئی۔

معید کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس روشنی میں خود کو گم کر لے یا شاید دریافت کر لے خوش نصیب تھا بہت، کہ دنیا کی دو بے حد حسرت لڑکیاں اس کی زندگی میں تھیں، ایک محبوبہ تھی اور دوسری دوست، مگر یہ خوش نصیبی اسے بے حد افسوس میں ڈال رہی تھی۔ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے نے چہرہ نظروں سے زہرہ کا تاناک چہرہ دیکھا۔ یمن اسی لمحے اسے سارہ کا خیال آ گیا۔

اپنی نظروں کی چوری اور دل کی خیانت نے خود کو ملامت کر کے شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور زہرہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو اوجھڑا اس جگہ کے بارے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔ معید ڈرامے کے مقابلے میں بیلے رقص پسند تھا۔

”وہل مسٹر میر و جاہت حسین آپ ہیں؟“ لال چندر کے سے من والا انگریز انسر اپنی گورا شاہی اردو میں ان سے مخاطب تھا۔

”تمہارے پاس انفارمیشن ہے کہ آپ نے اپنی حویلی کے صحن میں کچھ باغیوں کو چھپایا ہوا ہے۔“ انسر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دم ہی بلا تھ اور میر صاحب کے چہرے کا رنگ متحیر ہو گیا، سانس رک گئی ایک لمحے کو مگر اگلے ہی لمحے انہوں نے خود کو سنبھالا۔

”آپ کی انفارمیشن غلط ہے، یہاں ہمارے گھر والوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“

”انفارمیشن جھوٹ نہیں ہے، جھوٹ آپ بولنا بائے۔“ انسر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ میر صاحب کے سینے پر سنگین کی ٹوک رکھ کر کھڑے ہو گئے، انسر دو سپاہیوں کے ساتھ سیدھا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ”رک جائیے گورا صاحب! اندر زبان خانہ ہے۔“

”ہم صحن کا راستہ جانتا ہے اور وہ آپ کا لیڈر لوگ سے الگ ہے۔“ انسر کا لہجہ بدستور درست تھا۔

میر صاحب بے بسی سے اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ وہ مہربان لب تھے۔ مخبری آخر کس نے کی ہے اندر کی بات، انتہائی راز داری کی بات جو گھر کے باقی افراد کے علم میں بھی نہیں، اس کی خبر کون دے گا؟ کون دے سکتا ہے قاسم علی پہ تو اپنے بیٹوں اور بھتیجے سے زیادہ اعتبار کیا تھا انہوں نے۔ پھر کون ہو سکتا ہے وہ، میر و جاہت حسین مسلسل سوچتے رہے۔ جب ان کے گھر سے مرزا صاحب اور ان کے اہل خانہ نما ہوتے تھے۔

پتہ گزنیوں کو اور پتہ دینے والوں کو سب کو ایک ایک کر کے قرائین سے گولی مار دی گئی۔

آخری سانس لیتے ہوئے میر و جاہت حسین کے دماغ میں یہی سوال پھلکاریں مار رہا تھا۔ آخر

”چلے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر اپنی ’بو ٹھیک کرتے ہوئے آمادی ظاہر کی۔
”کل میں اور می، تمہارے گھر گئے تھے، آنٹی کی عیادت کرنے۔“ زہرہ کا لہجہ سرسری تھا مگر معید چمک اٹھا۔

”کیا ہوا مام کو؟“ بے چینی اس کے لہجے میں تھی اور فکر آنکھوں میں۔
”نہو ہو گیا تھا۔ یونو، موسم کا کمال۔“ زہرہ نے کندھے اچکائے۔

زہرہ کے پہلو میں بیٹھا وہ بیلے دیکھ رہا تھا، کمال کی فنکارہ تھی۔ موج آب کی طرح ادھر سے ادھر بہہ رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو معید اس کمال فن کو بہت انجوائے کرتا مگر اس وقت اس کا دل اپنی مام میں اٹک گیا تھا۔ سارہ سے محبت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس نے اپنی باقی محبتوں کو فراموش کر دیا ہو۔ والدین سے خصوصاً ماں سے محبت تھی اسے، تب ہی ان کی خرابی طبیعت کا سن کر وہ بے چین سا تھا۔

”تم ٹھیک ہو میڈی؟“ زہرہ نے شاید اس کی بے چینی اور عدم دلچسپی بھانپ لی تھی۔ تب ہی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ میڈی نے سر ہلا کر اپنی توجہ اسٹیج کی طرف مرکوز کی۔

واپسی پر زہرہ کو گھر چھوڑ کر اس نے اپنی گاڑی کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا۔ وہاں پہنچا تو دربان نے کسی بھی قسم کی حیرانی اور ہنگامی ہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر اسے وہی پروٹوکول دیا جو دیتا چلا آیا تھا، جیسے وہ ایک ماہ بعد نہیں بلکہ معمول کے مطابق روزانہ کی طرح اپنے گھر واپس آیا ہو۔ میڈی کا ایک اندیشہ تو یہ تھا کہ شاید بہت ہوا جو اسے باپ کے حوالے سے

ہلکی سی غصہ میں اس کا داخلہ ہی بند نہ کر دیا گیا ہو۔

”نہو ہو گیا تھا۔ یونو، موسم کا کمال۔“ زہرہ نے

دی۔ آواز میں واضح طور پر زکام کا اثر تھا۔ میڈی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کنگ سائز شاہانہ مسہری پر کمرل اوڑھے زرتاج مہر لیش ہوئی تھیں۔ بیٹے کو دیکھ کر ان کا چہرہ اور آنکھیں دفعتاً چمک اٹھیں، وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”آپ کیسی ہیں می؟“ معید ان کے سر ہانے آ کر برابر میں بیٹھ گیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا میڈی! تم واپس آ گئے ہو۔ اب جاؤ تو گئے نہیں نا۔“

زرتاج مہر بچوں کی سی معصومیت سے پوچھ رہی تھیں، انہیں لگا کہ زہرہ نے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے مگر اگلے ہی لمحے ان کے ارمانوں پر اوس گر گئی جب انہوں نے بیٹے کا جواب سنا۔

”میں آپ کو دیکھنے آیا ہوں می! ابھی چلا جاؤں گا۔“

”میڈی! اتنے سنگ دل تو نہ بنو۔ پورے ایک ماہ بعد تم نے اپنی شکل دکھائی ہے اور اب آتے ہی جانے کی باتیں کر رہے ہو۔“ زرتاج مہر کے چہرے پر مایوسی اور لہجے میں رقت آ گئی۔

”می! معید نے ان کے شانے کے گرد بازو دراز کیا۔

”میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور ڈیڈ سے بھی، مگر ڈیڈ کا رویہ اور باتیں ناقابل برداشت ہیں۔“

”اچھا، کم از کم آج کی رات تو رک جاؤ۔“ زرتاج مہر نے التجا کی۔

معید نے بے اختیار ایک گہری سانس لی، کچھ دیر ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

”ٹھیک ہے، آپ کے کہنے سے میں آج رات رک جاتا ہوں۔“

”تم ہمیشہ سے میرے فرماں بردار ہو میڈی!“ فرط مسرت سے زرتاج مہر کی آنکھیں

بھیک گئیں۔

”ایک منٹ، میں ابھی آتا ہوں۔“ معید ان کے پاس سے اٹھ کر ہال میں آیا اور اسٹینڈ پر رکھے سیاہ و سنہرے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر سارہ کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو۔“ سارہ کی مترنم آواز سنائی دی۔

”سارہ! میں آج رات می کے پاس ہوں، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں کل آؤں گا۔“ معید نے مختصر اسے آگاہ کیا۔

”کل تو آؤ گے نا؟“ سارہ نے فقط ایک ہی سوال کیا تھا۔

”آف کورس۔“ معید نے اسے یقین دلایا۔

”اوکے۔“ سارہ نے فون بند کر دیا۔

وہ ریسیور رکھ کر پیچھے مڑا تو ایک دم چونک اٹھا۔ دلی شاہ اس کے پیچھے ہی کھڑے تھے۔
”میں نے تو سنا تھا کہ تم بھی نہ آنے کے لیے گھر چھوڑ گئے ہو۔“

ان کا لہجہ اور الفاظ ان ہی کی طرح سخت تھے۔
بیٹے کی انا کو ان لفظوں سے، اس لہجے سے بڑی سخت چوٹ پہنچی تھی۔

”میں می کو دیکھنے اور ان سے ملنے آیا تھا۔“ معید نے اپنے چہرے کے تاثرات باپ سے بھی زیادہ سخت کرنے چاہے مگر زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔

”یہ بہانا بھی خوب ہے۔“ میس و آرام چھوڑنا اتنا آسان نہیں۔ وہ بھی محلوں کا میس و آرام، شہزادوں کی سی زندگی۔ ”بڑی استہزاء“ مسکراہٹ تھی ان کی، معید سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
”ڈیڈ! خاموش ہو جائیں۔“ معید نے منٹھیاں بھینچیں۔

”اس چھوٹے سے ڈربے سے دل اکٹا کیا یا اس چھوٹی عورت سے؟“ دلی شاہ جب ہونے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہے تھے۔

معید کے ہاتھ سے صبر کی مٹاہٹیں چھوٹ

گئیں۔ برداشت کا مادہ ختم ہو گیا۔

”آپ.....“ اس نے باپ کی طرف اٹھائی اور سرخ چہرے سے ہامشکل بولا۔ ”نا قابل برداشت ہیں۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کر سے باہر نکل گیا۔

دلی شاہ نے اس کی اسپورٹس کار اشارت ہونے کی آواز سنی تو ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ بے حد محفوظ کن مسکراہٹ، اپنی کسی متوجہ کامیابی سے لطف اندوز ہونے والی مسکراہٹ انہوں نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

”فریڈ کو آگاہ کر دو، اس کے پاس ایک گھر ہے۔“

ریسیور واپس رکھتے ہوئے ان کی مسکراہٹ نسبتاً جیسی تھی مگر چہرہ اور انداز پر سکون تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر انہوں نے سگار سلگایا۔ فضا میں خوشبودار تمباکو کی مہک پھیل گئی۔

☆☆☆

”کون؟“ کال بیل کی آواز سن کر سارہ دروازے کے قریب آئی۔

”میں ہوں۔“ آنے والے نے نام نہیں بتایا مگر سارہ اس آواز کو بخوبی پہچانتی تھی۔
”کیوں آئے ہو؟“ دروازہ کھول کر سوال کرتے ہوئے سارہ کے لہجے میں سرد مہری اور آنکھوں میں اجنبیت تھی۔

”فارگاڈ سیک سارہ! اتنی کھور تو نہ بنو۔ ایک رشتہ ختم ہوا ہے۔ محبت کا نہ سہی مگر دوستی کا رشتہ تو ابھی جگہ موجود ہے۔“ آنے والا سراپا التجا بتا ہوا تھا۔ سارہ پکھلنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

”اس ایک رشتے کے ساتھ باقی سارے رشتے بھی ختم ہو گئے ہیں۔ اب بولو کیا بات ہے۔“ سارہ نے صاف گوئی کے ساتھ بے مروتی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ابھی تک دروازے کے پچھلے ایستادہ تھی اور اس کا ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔

”سہت کے بارے میں بات کرتی ہے، اگر تم
 اسے دیکھو۔“ اس نے وہاں لہجہ ہو گیا۔
 سارہ کچھ دیر ہنست بھینکتی اسے گھورتی رہی، بچی
 کے سپرد وہ کچھ نہ بتائی بھی ہو گئی تھی۔
 ”کچھ ہے، مگر صرف دس منٹ۔“ اس نے
 گویا جھپٹا رہا لگتے ہوئے مشرودہ آواز کی ظاہر کی اور
 دروازے کے کچھ سے ہٹ گئی۔
 فریڈ لوگ، روم کے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔
 سارہ کی پتھر اور گھورتی نگاہوں کی اسے کوئی خاص
 پروا نہیں تھی۔

”اتنی بد اخلاق تو تم کبھی نہ تھیں۔ اس سردی
 میں برائڈی کا گلاس تو جانی دشمن کو بھی پوچھ لیتے
 ہیں۔“ فریڈ کے چہرے پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی
 جس کے ذریعے چند سال پہلے اس نے سارہ کا دل
 جیتا تھا۔

”تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو اور اپنا بھی۔“
 سارہ نے بے حد اکتائے ہوئے انداز میں اس کے
 سامنے برائڈی رکھی تھی۔

”اچھا میزبان ہمیشہ مہمان کا ساتھ دیتا ہے۔“
 فریڈ نے سامنے رکھے اکلوتے گلاس کو دیکھا پھر سارہ
 کو جتایا۔

”میرا خیال تھا کہ شاید اب تم سدھر گئے
 ہو گے، مگر تم بالکل ویسے ہی ہو جیسے تھے۔“ سارہ نے
 بھی اسے جتایا اور گلاس لینے چلی گئی۔

برائڈی کی طلب تو اسے بھی ہو رہی تھی۔ گلاس
 لے کر وہ فوراً ہی آگئی تھی مگر فریڈ کے لیے یہ چند
 سیکنڈ بھی بہت تھے۔ وہ اپنا کام دکھا چکا تھا۔ سارہ
 کے لائے ہوئے گلاس میں وہ اپنے لیے برائڈی
 اٹھائے لگا اور اس کے آگے اپنا گلاس کھسکا دیا۔ جس
 میں بڑی ہوشیاری سے نشہ آور سفوف ملا تھا۔

”پانی الفت اور قربت کے نام۔“
 گلاس ہوا میں بلند کر کے فریڈ نے کہا اور
 شراب کی چسکیاں لینے لگا۔
 ”تم کیٹ کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے؟“

سارہ نے اپنا گلاس چند گھنٹوں میں خالی کر دیا تھا۔
 اسے ایک گھنٹہ کی سہانگی کا احساس ہو رہا تھا۔
 ”نکسے اس شخص کو زیادہ الفت کی بارانی چاہیے
 تھی۔“ ناقابل اعتبار ہے یہ انسان۔“ سارہ کا دماغ
 اسے اب سمجھا رہا تھا۔

”میں، بہتہ میں وہ بار کیٹ سے ملنا چاہتا
 ہوں۔“ فریڈ نے کن اکھیں ستا ستا دیکھتے ہوئے
 اپنا مدعا بیان کیا۔ ”اور بھٹے میں ایک بار تم سے۔“
 چند لمحوں کے ذرا مانی وقت کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا
 تھا۔

”تم.....؟“ سارہ کا چہرہ دھماکا اٹھا۔ اسے فریڈ
 سے اس ذرا مانی کی توقع نہیں تھی۔
 ”وہ، ٹھیک، طبیعت کی کا فیصلہ تمہارا تھا۔ میرے انہیں،
 میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“ سارہ کو کچھ
 کہنے کا موقع دیے بغیر وہ دوبارہ جلدی سے بول
 اٹھا۔

”جس میں جو کہتا تھا، کہہ لیا۔ اب اٹھو اور چلے
 پھرتے نظر آؤ۔“

سارہ اس سے کہنا چاہتی تھی مگر کہ نہ سکی، اس
 کی حالت، کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ پہلے اسے لگا
 جیسے اس کا سر ٹھوم رہا ہے اور زبان اینٹھ گئی ہے۔
 ایسے اکثر گئی کہ اس سے بھائی بھی نہیں جاری تھی پھر
 کچھ دیر بعد اسے یوں لگا جیسے اس کے چاروں طرف
 ستارے دمک رہے ہیں اور وہ خود بادلوں پر سوار
 ہے۔ سبک بادلوں پر سوار کیف کے عالم میں۔ سارہ
 نے سر جھٹک کر آنکھوں کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔
 دھندلائی ہوئی نظروں سے اس نے سامنے بیٹھے فریڈ
 کو دیکھا مگر اس کا چہرہ بھی دھندلا ہوتے ہوئے
 غائب ہو رہا تھا۔

☆☆☆

عام حالات میں وہ راستہ ڈیڑھ گھنٹے کا تھا مگر
 معید نے شدید برہمی کے عالم میں وہ راستہ ایک گھنٹے
 پانچ منٹ میں طے کیا۔ غم و غصے سے اس کا رواں
 رواں سلگ رہا تھا۔

ماں سے ملنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ شاید باپ کا رویہ بھی کچھ تبدیل ہو گیا ہو۔ ان کی سختی اور رعونت کی جگہ نرمی نے لے لی ہو کہ ان کا لاڈلا بیٹا ایک ماہ سے، ان کی نظروں سے اوجھل، گھر سے دور تھا۔ مگر نہیں، وہ غلط تھا۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے، چٹان اپنے مقام سے سرک سکتی ہے، پتھر میں جو تک لگ سکتی ہے مگر ولی شاہ کے دل میں نرمی اور مروت کا گزر ہونا ناممکن۔ اپنے خیالات میں کم وہ سارہ کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ فلیٹ کی ایک چابی سارہ نے اسے دی ہوئی تھی۔

دروازے کے باہر چند سیکنڈز کے لیے کھڑے رہ کر اس نے اپنے کھولتے ہوئے دماغ پر قابو پانے اور خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی پھر کی ہول میں چابی ڈال کر گھمائی۔

دروازہ کھلتے ہی وہ اپنی جھونک میں دو قدم آگے بڑھا۔ لوٹک روم میں سامنے نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، وہ حقیقت ہے یا خواب، سچ ہے یا جھوٹ۔

اس نے اپنی آنکھیں ملیں، یہ دیکھنے کے لیے کہ سامنے صوفے پر برائے نام لباس میں بیٹھی جو لڑکی جموم رہی ہے، وہ سارہ ہی ہے یا کوئی اور، جسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ انتہائی نشے میں تھی۔ اس کے پہاڑ میں بیٹاؤنڈسم سا مرد اک دم ہی اچھل کر کھڑا ہوا تو سارہ جو اس کے سہارے سے نیچی گئی۔

”اے، کون ہو تم؟“ فریڈ ڈالتے قدموں سے لڑکی کے قریب آیا اور اس کی طرف الٹی بڑھا کر بولا۔ ”اب نہ پتا دیتی ہے، برا بیوی نام کی۔“

”اے، اے، اے، انسان اپنی بیوی کے ساتھ اپنے گھر میں کیوں کر آتا ہے؟“

لہرانے لگا، اسے دیکھ کر معید کو میاں لگا کر اس سے جانے کتنی بوتلیں چڑھائی ہوئی ہیں مگر معید یہ نہیں جانتا تھا کہ فریڈ ایک بہت اچھا ایکٹر تھا۔

”کون ہو تم؟ کیا چوری کرنے آئے ہو؟“ فریڈ کے سوالات ختم نہیں ہو رہے تھے، اس کی ہلکی مستقل پتھر کا مجسمہ بنے معید کی طرف تھی۔ فریڈ پیچھے دیکھنے ہی سے نہیں بلکہ کبھی کبھی سامنے دیکھنے سے بھی پتھر بن جاتا ہے، جیسے معید بن گیا تھا۔

”اگر تم چور ہو تو میری بیوی سے زیادہ قیمتی یہاں کچھ نہیں ہے اور اپنی بیوی کو میں لے جانے نہیں دوں گا۔ گولی مار دوں گا اگر ایسی کوشش بھی کی تو.....“

فریڈ نے اپنی جھونک میں بولتے ہوئے اچانک ہی اس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ معید اک دم لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ دروازے سے نکل آیا تو بے اختیار اس نے اس کا پٹ تھام لیا۔ وہ کھلا ہوا تھا، اسے مورچہ ہی نہیں ملا تھا دروازہ بند کرنے کا۔ اندر قدم رکھتے ہی جیسے اس کی روح سلب ہو گئی تھی۔

”سنا تم نے، میں نے کیا کہا۔ بھاگ جا یہاں سے، میں اپنی بیوی کے آس پاس کسی برداشت نہیں کرتا۔ سوائے اپنے آپ کے۔“

فریڈ کی آواز، غراہٹ میں بدل گئی، اس نے دوبارہ معید کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھایا اسے دھکیلتے کے لیے مگر اس سے پہلے ہی معید بے اختیار خود ہی دو قدم پیچھے ہوا تو وہ دروازے سے باہر تھا۔

”ہی ہی ہی.....“ فریڈ نے بھونٹائی ہی کی گئی ساتھ دروازہ اس کے منہ پر زور سے بند کیا تھا۔ معید کو کچھ علم نہیں کہ وہ کیسے بیڑھیاں اڑ کر نیچے آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ اس کا پورا جسم ہل رہا تھا، ایک ایک روتھیلوں کھڑا تھا جیسے وہ کوئی بہت خوف ناک بھوت دیکھ کر آیا ہو۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا، ویو انوں کی طرح اسٹیرنگ پر ہاتھ زور سے مارے اور دھار میں مار مار کر روئے۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر وہ سیدھا باہر

اور خالی خالی نظروں سے سامنے بھلے اندھیرے کو
جتنے لگا۔ ایسا ہی اندھیرا اس کی آنکھوں میں بھی
پھیل گیا تھا۔ اس کے دل میں بھی۔ اس کے جسم کے
اندہر۔ خون کے ہر قطرے کے ساتھ وہ اندھیرا
پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

ان وفاداروں، جانثاروں کو، جنہوں نے سرکار
انگلینڈ کو قائم اور دائم رکھنے کے لیے 1857ء کے
معرکے میں کارنامے انجام دیے اور اپنی خدمات بجا
لائے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے انہیں انعام و
اکرام دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔

صاحب کمشنر بہادر کی طرف سے دربار منعقد
کیا گیا۔ شامیانے تلے کرسیاں رکھی تھیں، جن پر
مختلف مذاہب اور قومیتوں کے افراد بیٹھے تھے۔
خلعت فاخرہ میں ملبوس ان تمام افراد میں ایک ہی
بات مشترک تھی کہ ان سب نے داسے درے، سننے
آزادی کے اس معرکے میں انگریز اور انگریز حکومت
کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔

ایک ایک کر کے چوہدار نام پکار رہا تھا اور
مطلوبہ فرد اپنی کرسی سے اٹھ کر کمشنر تک جاتا جہاں
اس کی وفاداری اور خدمات کا صلہ، اعزاز، زمین
جاگیر اور مالی وظائف نسل در نسل تک کی صورت ادا
کیا جا رہا تھا۔

ساتویں نمبر پر نام پکارا گیا، اپنا نام سن کر مذکورہ
فصل کے چہرے پر مزید چمک آگئی۔ اس کی عمر تو
اتنی نہیں تھی مگر اس کی عقل عیار تھی اور سوجھ بوجھ اور
ہوشیاری نے چالاکی کو بھی کہیں پیچھے چھوڑا ہوا تھا۔
آنکھوں میں فاتحانہ چمک اور چال میں فخر لیے وہ
کمشنر کے رو بہ پہنچا۔

کمشنر کی آنکھ کے اشارے پر چوہدار نے میز
پر رکھی ایک نقری کشتی اٹھا کر آنے والے کے ہاتھوں
میں دی۔ چاندی کی اس کشتی میں انتہائی نفاست
سے کاندھات ایک ریشمی ڈور سے بندھے تھے۔ ان
کاندھات کی رو سے مذکورہ وفادار کو جو زمین دی گئی

تھی، وہ ایک چھوٹی موٹی ریاست کے برابر ہی تھی۔
اس کے ساتھ ساتھ خان بہادر کا خطاب بھی مرحمت
کیا گیا۔

لینے والے نے مسکرا کر انعام وصول کیا اور
واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا مگر اب چہرے کی چمک
میں کچھ کمی آگئی تھی۔ دل کی ترنگ بھی کچھ بجھ سی گئی
تھی۔ وہ کسی حد تک مایوس اور دل شکستہ سا ہو گیا تھا۔
جتنے انعام و اکرام اور اعزاز کی امید تھی اس سے
بہت کم تھا یہ جو اس وقت اسے ملا تھا۔ ایسے ایسے
اٹلے میلے لوگ جن کی خدمات معمولی اور کارنامے
کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، انہیں کیسے کیسے اعزاز و
اکرام اور انعامات سے نوازا گیا۔ میوٹی میڈل جس
پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر تھی۔ اشار آف انڈیا (ستارہ
ہند) جیسے اعزازات دیے گئے اور میرے جیسا
فصل، جس کی مخبری اور جاسوسی نے انگریز کا اقبال
بلند کرنے میں اتنی مدد کی اسے فقط خان بہادر اور
ایک جاگیر دے کر بھلا دیا۔

”اتنے کم پر اور اتنی آسانی سے بھلنے والا نہیں
ہوں میں، مجھے وہی صلہ چاہیے جیسی میری خدمات
تھیں۔ میں اوپر تک اپنی عرضداشت پیش کروں
گا۔ اپنے حق کے لیے لڑوں گا۔“
اپنے خیالات میں گم قاسم علی کو پتا بھی نہیں چلا
کہ دربار برخواست ہو گیا تھا اور لوگ اپنی کرسیوں پر
سے اٹھ رہے تھے۔

☆☆☆

اس خوب صورت چہرے پر کیا تھا، سچ یا
جھوٹ۔ ان سبز قاتل آنکھوں میں کس کی تحریر تھی،
دھوکے کی یا محبت کی؟
معید کو اب کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں
تھی۔ بے وفا کی کے زہر نے محبت کے نشے کو شتم
کر دیا تھا۔ وہ سارہ سے بات کرنا تو کیا اس کی شکل
بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی معذرتوں سے،
وضاحتوں سے معید کو اب کوئی دلچسپی نہیں مگر سارہ
اس کا رستہ روک کر کھڑی تھی۔

”تمہیں میری بات سننی ہوگی میڈی۔“ وہ چٹان کی طرح اس کی راہ میں حائل تھی، معید کو مجبوراً رکنا پڑا۔

”میرا وقت اتنا فالتو نہیں ہے۔“ معید کے لہجے میں، آنکھوں میں، آواز میں اجنبیت تھی، نفرت تھی۔ ایک لمحے کو سارہ کی سانسیں رکنے لگیں۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالا اور بولنے لگی۔

”تم نے جو کچھ دیکھا، وہ سچ نہیں تھا۔ وہ سب ایک پلان تھا، تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لیے۔ ہمیں الگ کرنے کے لیے پلاننگ کی گئی تھی، مجھے فریڈ نے نشہ آور برائڈی پلائی تھی۔ میں اپنے حواسوں میں نہیں تھی وہ سب جھوٹ تھا میڈی! پلیز میرا یقین کرو۔“

بڑی آن بان شان والی سارہ اس کے آگے تقریباً گزرا اٹھی، مگر معید پر اس کی وضاحتوں کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

”بے سرو پا کہانیاں سنا کر اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔“ سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

”تم جانتے ہو، میں ہیریگنٹ ہوں۔“ سارہ نے اب بھی ہار نہیں مانی تھی۔

”تمہارے کسی معاملے سے میرا کوئی لینا دینا نہیں، جو جی چاہے کرو۔ تمہارے سارے سچ اور سارے جھوٹ تم خود ہی جانتی ہو۔ مجھے اب تمہارا کوئی اعتبار نہیں۔“ معید نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اس کے برابر سے نکلنا چلا گیا۔

”میڈی! تم مجھے ایسے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“ دور جاتے معید کو سارہ نے مڑ کر دیکھا اور حلق کے بل پکائی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم۔“ معید زیر لب بڑبڑایا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔

”اور حقیقت بھی دراصل یہی تھی کہ اب اسے آگے بڑھنا تھا، سب کچھ بھول کر، اپنے ماضی کو

فراموش کر کے۔ وہ ماضی جس میں سارہ کو لگتا تھا اس کے لیے محبت تھی۔

اب ایک نئی زندگی، نئی محبت اور نیا سفر اپنی بائیں واکیے اس کے منتظر تھے۔ وہ واپس لوٹا تو والدین کے ساتھ ساتھ زہرہ پروین نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ اپنے جوہن پر آئی بہار سی وہ لڑکی، الفت اور وفا کے ڈھیروں پھول لیے اس کی راہ میں کھڑی تھی۔ معید کے لیے جائے فرار اب مشکل بن نہیں ناممکن تھی کہ اب وہ گریز چاہتا ہی نہیں تھا۔ اس پر بھی اور خود اپنے آپ پر بھی۔

معید نے اپنا ہاتھ، ان ہاتھوں میں دے دیا۔ گلابی نرم و نازک ہاتھ، خوابوں کی، محبت کی جس وادی میں اسے لے جائیں، معید کو سب منظور تھا۔ زہرہ پروین نے محبت کی ابتدا کی تھی اور معید نے اجازت کر دی۔ یوں ٹوٹ کر چاہا اسے کہ باقی سب کچھ فراموش کر دیا۔ یوں اس کے عشق میں ڈوبا کہ سوائے زہرہ کے کچھ دکھائی دیا نہ بھائی دیا۔ دو تو بہت سالوں بعد اسے ایک خط ملا تو۔

☆☆☆

سنہری مائل بھورے بالوں کو بار بار انگلیوں سے سنوارتے ہوئے جب وہ انہیں منہ پر آنے سے نہ روک سکی تو جھلا کر اٹھی۔

”اگلی بار میرا سیم اسٹائل ایسا ہوگا کہ ایک بال کی بھی جرات نہیں ہوگی، چہرے پر آنے کی اور ڈسٹرب کرنے کی۔“ ہنسنے لگا کپ کرے سے لاکر لگاتے ہوئے نور قاطمہ نے اعلان کیا۔

”تو کیا تم میری نقل کرو گی؟“ گریڈ پائے شرارت سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا جو آدمے سے زیادہ بالوں سے محروم تھا۔ بس چند بکے آس پاس ایک جھار سی بچی تھی، جو بڑی بے ضرورت تھی۔ بالکل بھی نہ کرتی تھی۔

”آئیڈیل برا نہیں ہے۔ شیمو، ہنسنے لگا۔ نور قاطمہ اسٹائل بلیو ڈرائی کا خرچا بھی بچے گا۔“

انہاں کی بیوی سے گویا اس آئینہ بے پر سوچ بچار کر رہی تھی۔
 ”نہاں ہے مگر بیٹہ پا! آپ کی جو والدہ تھیں، ان کے بال بہت خوب صورت تھے؟“

”بہت نہیں، بے حد۔۔۔۔۔ بے حد خوب صورت لے اور گھنے بال تھے۔ ایک بہت اونچا تخت خاص طور پر بنوایا گیا تھا، جس پر لٹا کر ان کے بال دھوئے جاتے تھے۔ ٹائٹن آتی تھی بال دھونے کے لیے، اس کے پاس بڑے اسٹیل قسم کے نسخے اور جڑی بوٹیاں آتی تھیں ہر بزر و غیرہ ہوتے تھے۔ ہماری والدہ کو یہ بال وراثت میں ملے تھے۔ میرے نانا نے ایک بیگانی خاتون سے شادی کی تھی، پسند کی یا اپنی مرضی کی شادی جسے آج کل ”لو میرج“ کہا جاتا ہے۔“

گرینڈ پا حسب معمول شروع ہو گئے۔
 ”میرے وقتوں اور لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک اور احساس ہوتا تھا۔ یاسیت اور ادا سی بھی، جوش اور خوشی بھی۔“

”اور اس وقت کی یہ شادی جو لکھنؤ کے ایک امیر زلوع اور بنگال کی ایک طرح دار فیوڈل طبقے کی فضا میں خاتون سے ہوئی، اس وقت ایک بغاوت یا انقلاب بھی مچی ہوئی تھی۔“

نور قاطمہ نے گرینڈ پا سے کئی بار یہ کہانی سن رکھی تھی، اس لیے انہیں گویا یاد دلایا۔

”ہاں، ہاں۔ بالکل ایسا ہی تھا۔“ انہوں نے تائید میں سر ہلایا۔

”بڑے حیرت انگیز معاملات تھے اور آج بھی تھا۔ مثلاً یہ کیا منطق تھی کہ بھنگی کی بیوی بھنگن، تائی کی بیوی تائن، بھنگی کی بیوی بھنگن، دھولی کی بیوی دھول؟“ نور قاطمہ نے دادا کے زیر سایہ رو کر جو کچھ سنا تھا اس میں مجس، تحقیق اور جستجو سرفہرست تھی۔

”آج سے سو سال پہلے بلکہ قیام پاکستان سے قبل کے برصغیر کی ایک معاشرتی روایت تھی، جو پیشہ و فسادات میں لگنا تھا اور ہر پیشے سے منسلک گروہ،

ایک قوم، ایک برادری میں کر اپنے کسب سے جڑا رہتا تھا۔ تو مرد، عورت اسی ذات یا پیشے کے حوالے سے جانے اور پہچانے جاتے تھے اور ویسے یہ تو آج کل بھی ہوتا ہے مثلاً بادشاہ کی بیوی ملکہ، شہزادے کی بیوی شہزادی، صدر یا وزیر اعظم کی بیگم خاتون اول کہلاتی ہیں۔“

گرینڈ پا اس کے تجسس، جستجو اور سوالات کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تو تھے۔

”مگر اب ایسا نہیں ہوتا کہ اگر مثلاً ایک شخص ہیر اسٹاکسٹ ہو تو اس کی بیوی لیڈی ہیر اسٹاکسٹ کہلائے۔ بیوی کی شناخت تو اس کے اپنے کام سے ہوگی، وہ ڈاکٹر ہو، انجینئر ہو یا کوئی ڈریس ڈیزائنر، وہ وہی کہلائے گی جو ہے۔“ نور قاطمہ نے پھر سوال اٹھایا۔

”ہاں، کیونکہ اب یعنی آج کی دنیا میں پیشوں سے وابستہ ذات، قوم اور برادری کا رواج اور تصور کہیں تو بالکل ہی ختم ہو چکا ہے اور کہیں آخری سانس لے رہا ہے۔ آج کوئی بھی انسان کوئی بھی پیشہ اختیار کر کے اس میں کامیابی اور ترقی حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں اچھائی اور برائی کے دونوں پہلو ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ نور قاطمہ بہت انہماک سے انہیں سن رہی تھی۔

”اچھائی یہ ہے کہ بہت سے پیشے اور کام جو نچلے درجے میں شمار کیے جاتے تھے اور ان سے وابستہ افراد سماجی اعتبار سے کم تر سمجھے جاتے تھے۔ اب یہ رجحان نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص جو اعلا پانے پر کوئی ہیر سیلون کھول لے یا منرل واٹر کی بوتلی کا مالک ہو۔ وہ تائی یا بھنگی کہلانے کے بجائے بزنس من کہلاتا ہے۔ گانے والے میراثی نہیں، گلوکار اور اداکاری کرنے والے بھاٹے کے بجائے فنکار کہلاتے ہیں۔“

گرینڈ پانے ایک لمحے کو رک کر سانس لی پھر

دوبارہ بولنے لگے۔

”مگر ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اب خاندانی نہایت اور شرافت وجہ معیار نہیں رہی۔ اعلا کردار پیچھے چلا گیا، دولت کے ڈھیر پر کھڑا نہیں، دوسروں کی نظروں میں سر بلند ہے۔ دنیا کی ہر معاشرت میں کم و بیش یہی صورت حال ہے، کہیں کم کہیں زیادہ۔“

”ہوں۔“ نور فاطمہ کا ذوق سے فیک لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔
”کافی پیو کی؟“ گرینڈ پا اٹھ کر کچن کاؤنٹر کی طرف بڑھے جہاں سامنے ہی کافی میکر رکھا ہوا تھا۔
”کافی میں دودھ، بہت ساری چینی اور چاکلیٹ یاؤڈر ڈال کر ہٹائیں تو پی لوں گی۔“
دراٹسل گرینڈ پا بالکل اسی کافی پیتے تھے۔
”تجہ کڑوی جسے نور فاطمہ اگر ایک کمونٹ بھی پی لے تو فوراً آخ تمہو کر دے اور گرینڈ پا اس کی کافی کا مذاق اڑاتے تھے۔“

اس سے بہتر ہے کہ تم دودھ میں اوولین ملا کر پی لیا کرو۔ کافی ڈالنے کا تکلف کیوں کرتی ہو؟“
”آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔“ نور فاطمہ بڑے سویت انداز میں جواب دیتی تھی۔
”تم نے نوٹس تیار کر لیے میرے؟“ کافی ہاتھ ہوتے گرینڈ پانے سوال کیا۔
”بس تمہو اس کا مہرہ کیا ہے۔“

نور فاطمہ کی گہری سیاہ آنکھیں اب بھی اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ گرینڈ پا ایک کتاب لکھ رہے تھے جس میں مدد کے لیے وہ ان کی معاون یا اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی۔ کام نور فاطمہ کی پسند کا تھا اس لیے بہت شوق اور جان فشانی سے کر رہی تھی۔ ایک سوال کب سے اس کے دماغ میں کلبار رہا تھا۔ وہ کافی کا انتہار کر رہی تھی تاکہ کافی کے ساتھ ساتھ گرینڈ پا کے جواب سے لطف اندوز ہو۔

ہلہ ہلہ

میرے پیارے میڈی!

لاکھ چاہنے پر بھی تم سے نفرت نہیں کر سکی۔ محبت کا اور تمہارا وہ مختصر سا ساتھ، ایک خوب صورت یاد بن کر ہمیشہ میرے دل میں رہا۔ اب کڑے اٹھارہ برسوں میں پلوں کے نیچے بہت پانی بہہ چکا ہے۔ تمہارے لیے اب یہ الفاظ غیر ضروری اور بے معنی ہوں گے کہ تم نے جو کچھ دیکھا، وہ جھوٹ اور ایک ہٹا گیا منظر تھا۔ میں بے گناہ تھی۔

”جہیں اب تو میرا یقین کر لیتا چاہیے، کینسر کی آخری اسٹیج سے اور ایک مرتا ہوا انسان بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بول ہی نہیں سکتا اور تمہیں اس بات کا بھی یقین کرنا چاہیے کہ میں نے تمہاری ایک بیٹی کو جنم دیا ہے۔ دو ماہ پہلے اس کی سترہویں سالگرہ تھی۔ میں نے اس کا نام ماریہ رکھا تھا۔ میرے بعد وہ اس دنیا میں بالکل اکیلی ہو جائے گی اور ایک باپ کے ہوتے ہوئے اس کی اولاد اکیلی نہیں ہونی چاہیے۔ جب تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے تو میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی۔ خط لکھ کر میں نے اپنی نرس کے حوالے کر دیا کہ میرے بعد وہ اس خط کو پوسٹ کر دے۔“

فقط وہ، جس نے تمہیں بے تحاشا چاہا اور جواب میں وہ چاہے جانے کے بجائے دھکاری کئی۔

عبدالمعید نے خط سے غسلک ایک اور پرچا دیکھا جس پر ماریہ کا ایڈریس اور تصویر چسپاں تھی۔ آنندھیوں کی زد میں آئے پتے کی طرح خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے معید نے اس تصویر پر اپنی نظریں جمائیں۔

پہلی بار دیکھا جانے والا ایک اجنبی چہرہ مانوسیت کی جھلک لیے ہوئے تھا۔ اس چہرے پر ناک اور ٹھوڑی کی ہٹاؤٹ بالکل وہی تھی جو ولی شاہ کے خاندان کی امتیازی خصوصیت تھی۔ سبز آنکھیں اس نے ماں سے لی تھیں، وہ تصویر کی نظریں بھائے کم صم بیٹھا تھا۔ اس کا وجود اپنے آگس میں تھا اور

دل دوام نہیں اور بھگ رہے تھے۔ ہر جگہ بھگ رہے تھے۔ کبھی زرتاج میر کا خیال آتا، کبھی زہرہ پروین کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا تو کبھی وحیان کی ہوا اس کے دو پیارے پیارے لائق فائق بچوں کی طرف اڑ جاتی جو دنیا میں اسے سب سے زیادہ عزیز تھے۔

”اس دنیا میں کون ہے جو جوانی میں محبت نہیں کرتا؟ مگر محبت کی سزا اتنی خوف ناک تو نہیں ہوتی۔ اتنی خوف ناک ہونی تو نہیں چاہیے۔“

ساری چیزیں لفافے میں ڈال کر اس نے لفافہ دراز میں ڈالا اور انٹرکام کا ریسور اٹھایا۔

”مس میٹلین! اگلے دو گھنٹے کی ساری میٹنگز اور پروگرام کینسل کر دیں۔“

اپنی سیکریٹری کو ہدایت دینے کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ اسے جس خطرناک طوفان کا سامنا ہے، اس سے نمٹنے کے لیے دو گھنٹے کافی ہیں؟ یا دو دن؟ یا دو ہفتے؟ دو مہینے؟ دو سال؟ یا دو صدیاں؟

☆☆☆

بخدمت حضور سر فریڈرک ہملٹن صاحب! بہادر کشن دہلی۔

وام اقبال

جناب مع القاب

دریائے علم را گوہر نایاب، مرجع علم و فضلاء، حکماء و دور شن۔ لا آفتاب جہاں تاب۔

خدمت عالی میں گزارش ہے کہ اگرچہ مجھ میں کوئی لیاقت و قابلیت خاص نہیں پھر بھی مجھ کا کارہ نے باقیوں کی سرکوبی کے سلسلے میں جو خدمات سر انجام دیں، وہ حضور کے علم میں آنا ضروری ہیں۔ میں نے شہر دہلی کے کئی گھرانوں، خاندانوں اور افراد کے خیالات، رجحانات اور معاملات سرکار تک بڑی ہوشیاری سے پہنچائے، جو وہ سرکار انگلشیہ سے بغض و عناد کے حوالے سے رکھتے تھے اور باغیان دہلی نے انہیں جان کلمہ علی سے ہمدردیاں رکھتے تھے۔ میں نے ایک ایک تفصیل براہ راست ہائی

کمانڈ کو بھیجی۔ میں نے سرکار کی خیر خواہی اور ملکہ مقدسہ انگلستان غلہ اللہ ملکہ و سلطانیہ کا اقبال مزید و مزید بلند کرنے کی خاطر کئی بار اپنی جان جو کھوں میں ڈالی۔ کسی خطرے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سرکار برطانیہ کے لیے کاربائے نمایاں انجام دیے۔ میری کوششوں کی بدولت مغل شاہی خاندانوں کے ایک پورا گھرانہ اور انہیں پناہ دینے والوں کی سرکوبی ہوئی۔

اس کے علاوہ سینکڑوں نہیں بلکہ یہ تعداد ہزار کو پہنچتی ہے جنہیں میرے بے مثال و لا جواب نظام چاسوسی نے بے نقاب کیا اور دہلی فیلڈ فورس کے ہاتھوں وہ اپنے انجام کو پہنچے۔

شب و روز انتہائی راز داری اور کامیابی کے ساتھ سرکار کی خدمت میں مصروف رہنے کے باوجود مجھے جو صلہ دیا گیا، وہ آپ کے شایان شان نہیں کہ آپ جو دو سقا اور داد و بخش کے بادشاہ ہیں۔

یہاں میں یہ ذکر کرنا انتہائی ضروری سمجھتا ہوں، میر پر تاب گزرا راجپوت، جن کی خدمات کا دائرہ میرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ انہیں مجھ سے زیادہ بڑی جاگیر اور اعزاز دیے گئے ہیں، آپ ان سب کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

میں عاجزانہ واثق امید کا اظہار کرتا ہوں کہ سرکار انگلشیہ جو اپنے حامیوں اور وفاداروں پر ہمیشہ سے مہربان اور نسی رہی ہے۔ میری درخواست پر غور فرما کر میری جدوجہد، کوششوں اور قربانیوں کا شایان شان صلہ دے گی۔

خدائے بزرگ و برتر ہماری سرکار کو روز بروز ترقی بخشے اور آپ کا اقبال بلند کرے۔

سید قاسم علی
برہمقام دہلی

☆☆☆

پردہ سرکار انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا، نیچے سڑک اور اس پر بھاگتا ٹریک، آس پاس کی وکٹوریہ عہد کی پرانی عمارتیں، سب کچھ دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر وہی کھنٹی دھند، اس واہیات موسم میں تو

باہر لگتا بھی عذاب سے کم نہیں۔

گرینڈ پانے مایوسی کے عالم میں پردہ برابر کیا اور اپنی لکھنے کی میز پر آن بیٹھے۔ ان کا شروع سے خیال رہا تھا کہ اگر لندن کا موسم اتنا دایمیت نہ ہوتا تو یہ دنیا کا سب سے بہترین شہر تھا۔ مگر خراب موسم نے اس شہر کے کچھ نمبر کاٹ لیے تھے۔ نور فاطمہ کے خیالات بھی کم و بیش ان ہی جیسے تھے۔

”ہاں نہیں، یہ لڑکی کب آئے گی۔“ اکیلے تو یہ گھر جیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ گرینڈ پانے ایک نظر کمرے کے اطراف میں دوڑائی اور ایک گہری سانس لے کر لکھنے بیٹھ گئے۔ اپنی کتاب کے لیے انہیں کچھ معلومات درکار تھیں جس کے لیے انڈیا آفس لائبریری جانا تھا اور بھی کئی لائبریریاں کھنگال کر وہ کتاب کے لیے نوٹس بنا چکے تھے۔

نور فاطمہ نے اس سلسلے میں ان کی بہت مدد کی تھی۔ ایک دن مذاق میں نہیں بلکہ خاصی سنجیدگی سے انہوں نے نور سے کہا تھا کہ.....

”میں سوچ رہا ہوں اس کتاب کے ٹائٹل پر میرے ساتھ تمہارا نام بھی آنا چاہیے۔ ریسرچ کا کام تو ادھے سے زیادہ تم نے کیا ہے۔“
”بالکل ٹھیک، جب اس کتاب کو ”نوئل پرائز“ یا کم از کم ”جبر پرائز“ ملے گا تو آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی مشہور ہو جاؤں گی۔“ نور فاطمہ بہت ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی۔

گرینڈ پانے لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیا تھا مگر وہ لکھنے کے بجائے نور فاطمہ کے بارے میں سوچ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ داؤد امین کے بارے میں بھی۔

نور فاطمہ اسے ملانے لائی تھی۔ گرینڈ پانے ایک بار نہیں، تین بار اس سے ملے تھے۔ دودھ گھٹنے طویل نشست رہی تھی ان کی۔ بظاہر وہ ہر اعتبار سے ایک اچھا لڑکا تھا، وکالت پڑھ کر ایک مشہور فرم سے وابستہ تھا، ذہین تھا۔ اس کی گفتگو میں اکثر جو باتیں اور حوالے ہوتے تھے، وہ اس کے وسیع مطالعے کے

نماز تھے۔ اتنا مہذب، شائستہ مزاج اور تعلیم یافتہ نوجوان انہیں بطور داماد پسند آ جانا چاہیے تھا اور وہ یہی کوشش کر رہے تھے مگر پھر بھی بار بار انہیں کینا لگ رہا تھا کہ نور فاطمہ کو ابھی کچھ عرصہ ٹھہر کر کچھ اور سوچ بچار کر کے پھر فیصلہ کرنا چاہیے اور انہوں نے اپنا رائے کا اظہار بھی نور سے کر دیا تھا۔

☆☆☆
بیش تر لڑکیوں کی طرح سردی میں ٹھہرتے ہوئے ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم کھانا نور فاطمہ کو بھی بے حد پسند تھا اور وہ اس وقت اپنا یہی شوق پورا کر رہی تھی۔ لیڈر جیکٹ اور جینز کے ساتھ اس نے گلے میں چیک کا مظکر ٹیل دے کر ڈالا تھا۔ تراشیدہ بال شانوں سے ذرا نیچے تک تھوڑی لا پرواہی اور ذرا زیادہ خوب صورتی کے ساتھ یکسرے ہوئے تھے۔ بی بی آئس کریم کھاتے ہوئے اس کے گلانی ہونٹ سرخ ہو رہے تھے اور آنکھیں اور چہرہ ہمیشہ کی طرح چمک رہا تھا۔

”میرا بس چلے نا تو کھانا وانا کچھ بھی نہ کھاؤں۔ صبح، دوپہر، شام بس آئس کریم کھا کھا کر پیٹ بھر لیا کروں۔“ نور فاطمہ نے بڑے جوش سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”پھر تو تمہیں کسی آئس کریم پارلر کے اونر سے شادی کرنی چاہیے۔ چوبیس گھنٹے ڈیلیوری اور فری سروس کی سہولت رہے گی۔“

داؤد امین نے ایک معصومانہ سی آرزو کے جواب میں نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔ وہ نور فاطمہ سے بالکل ناراض تو نہیں ہوا تھا لیکن بہر حال تھوڑی سی برہمی اس کے چہرے پر اور لہجے میں آئی تھی اور یہ اس کے خیال میں محبت کرنے والے کا حق ہے اور رہے گا۔

”تم کچھ خفا خفا سے لگ رہے ہو؟“ آئس کریم میں کھو نور فاطمہ نے ذرا چوہک کر داؤد کے وجہہ مگر خفا چہرے کو غور سے دیکھا۔
”تو کیا یہ خوش ہونے والی بات ہے۔ گرینڈ پانے

نہیں خرید سونے بچنے کا مشورہ دیا اور تم فوراً
اپنی ہوسیں دنیا کی سب سے فرماں بردار پونی! "
"داؤد! مجھے میں تم سے محبت کرتی ہوں، ایسے
فی گرینڈ پا سے بھی کرتی ہوں۔ ان کی بات کو یا
جواب کو میں انکار نہیں کر سکتی۔" نور فاطمہ آئیں کریم
کھاتے کھاتے ذرا سنجیدہ ہو چلی۔

"کیا وہ مجھے پسند نہیں کرتے؟" داؤد کے
لبوں میں کچھ بے چینی سی تھی۔

"آخری اطلاعات آنے تک تو ایسی کوئی بات
نہیں تھی۔" نور نے کندھے اچکائے۔

"پھر کیا بات ہے؟ تین میننگز کر چکا ہوں میں
اب تک ان سے۔ اب بھی "میں" ان کی سمجھ میں
نہیں آیا؟" داؤد اب وکیل بن گیا، جرح کرنے

"گرینڈ پا کو میں اچھی طرح جانتی اور سمجھتی
ہوں، سوچ سمجھ کر بلکہ بہت زیادہ سوچ بچار کر کے
وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے یہی
سایا تھا مگر نہ جانے تمہارے معاملے میں مجھ سے
یہے بچک ہوئی۔" نور فاطمہ اس کی برہمی اب
فائے کر رہی تھی۔

"میں جس فرم میں جاب کرتا ہوں، وہ انکلینڈ
کا مشہور فرم ہے۔ انہوں نے میرے پہلے انٹرویو
کے بعد ہی مجھے منتخب کر لیا تھا۔" داؤد یہ بات پہلے
کی تانچا تھا مگر اب جتنا رہا تھا۔

"اگر تم جاب کے لیے گرینڈ پا کے پاس جاؤ تو
پہلے انٹرویو کے ابتدائی دو چار سوالات کے
جواب دینا ہوں۔ سلیکٹ کر لیں گے مگر جاب دینے میں
نہیں دیتے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔"
نور فاطمہ کی آنکس کریم ختم ہوئی تھی لہذا اب اس کے
آنکس شریوں ہو گئے۔

"کیا فرق ہے؟ دونوں معاملات میں
میں نے اپنی قابلیت اور ذہانت ویسی جاتی ہے۔"
نور نے آہ آہ کریم کا کپ میز پر رکھا اور نکتہ

"ہوں، تمہاری بات ٹھیک ہے مگر میرا خیال
ہے کہ جاب دیتے وقت امیدوار کا دماغ اور لڑکی
دیتے وقت دل دیکھا جاتا ہے۔"

"گرینڈ پا کو کیا لگتا ہے، کیا میں تمہارے
ساتھ ان فیئر ہوں؟ میرے دل میں کوئی جھوٹ، کوئی
کھوٹ وغیرہ ہے؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے داؤد! ان کو مجھ سے حد سے
زیادہ محبت ہے بس، جو وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ
کرنے میں ہچکچا رہے ہیں۔ تم پریشان مت ہو، میں
انہیں راضی کر لوں گی۔"

نور فاطمہ مسکرا دی۔ داؤد کی فکر اور پریشانی
اسے اچھی لگ رہی تھی اور اس نے اس کا اظہار بھی
کر دیا۔

"عجیب لڑکی ہو تم، میں پریشان ہو کر اچھا لگ
رہا ہوں تمہیں۔" داؤد نے تاسف سے گردن ہلائی۔
"کیونکہ یہ فکر اور پریشانی میری محبت میں
ہے، میرے لیے ہے۔" نور فاطمہ نے اپنے ہاتھوں
کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں جکڑا۔
"مام ڈیڈ کا پروگرام تھا، اگلے اتوار کو گرینڈ پا
سے ملنے کا۔" داؤد نے اپنا موبائل اٹھایا۔

"ہاں تو مل لیں۔"
"انہیں بھی یہی جواب ملے گا مزید سوچ بچار
اور انتظار کا۔" داؤد اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کہا تو ہے، میں انہیں راضی کر لوں
گی۔" نور فاطمہ اس کی ہم قدم ہوئی۔
"تم بھی ان سے ملی ہوئی لگتی ہو۔" داؤد کی خفا
خفا سی نگاہوں نے اس کے چہرے کو اپنی گرفت میں
لیا۔

"کردی نا وکیلوں والی بات، مجھ پر بھی
شک؟" نور فاطمہ کی ہنسی بے ساختہ اور جان دار تھی۔

☆☆☆
لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس خط کو نظر
انداز نہیں کر سکا اور دو دن بعد اس نے خود کو اس
بلڈمک کے باہر کھڑا پایا جس کے قہر و غور پر ماریہ کی

رہائش تھی۔ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ کر وہ مطلوبہ
فلٹ کی بیل بجار ہاتھا۔

”یس۔“ دروازہ اسی نے کھولا تھا۔

عید المعید اسے فوراً پہچان گیا تھا۔ وہ اپنی تصویر
جیسی ہی تھی اور اپنی بڑی بڑی سبز آنکھوں سے عید
المعید کا جائزہ لے رہی تھی۔ جس کا قیمتی لباس، مہنگے
جوتے، بیش قیمت گھڑی، اس کا پورا سراپا، پوری
شخصیت اس عمارت اور اس کے تھرڈ کلاس فلٹ سے
بالکل بھی بچ نہیں کر رہی تھی جس کے سامنے وہ کھڑا
تھا اور پھر چند لمحوں میں وہ سمجھ گئی۔

”آپ مسٹر میڈی ہیں؟“

”تم کیسے جانتی ہو؟ وہ چونکا۔

”ممی نے مرنے سے پہلے بتایا تھا۔“ ماریہ کا

چہرہ اور لہجہ سپاٹ تھا۔

وہ دروازہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ عبد المعید اندر
آ گیا۔ وہ صوفے پر چپ چاپ بیٹھا تھا اور یاریہ کی
خاموش نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں یا گھور رہی تھیں۔
عبد المعید کو اس کے اس انداز پر ابھن ہو رہی تھی۔
”کیا بتایا تھا سارہ نے میرے بارے میں؟“
عبد المعید نے بہت محتاط ہو کر سوال کیا تھا۔

”نہی کہ آپ میرے باپ تو بن گئے مگر ان
کے شوہر نہ بن سکے۔ آدھے رستے میں ہی انہیں
چھوڑ کر بھاگ لیے، جیسے ہیری مجھے چھوڑ گیا ہے۔
جیسے ہی میرے ہسپتال گنٹ ہونے کی خبر سنی، فرار
ہو گیا۔ سیم می جیسی پتویشن۔“

ماریہ نے کندھے اچکائے۔ اس کے لہجے میں
عجیب سی بے نیازی اور لاپرواہی تھی جیسے جو ہوا ہے یا
ہو رہا ہے، وہ تو ہونا ہی تھا۔

عبد المعید کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے
پر آ گیا تھا۔ اپنا اب تک کی زندگی میں اس نے کبھی
خود کو اتنا مجبور اور بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ ایک
ایسے موڑ پر کھڑا تھا جہاں رستہ ہونے کے باوجود بھی
وہ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ ایک قدم بھی آگے بڑھانا
دشوار تھا اور کھڑے رہنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔

☆☆☆

کوٹھڑی میں ایک دیے کی روشنی تھی جو ٹنڈرائی
تھی۔ رفعت آرا اسی بورے پر نیچے لیٹی تھی جو کوٹھڑی
کے کچے مگر لیے پتے فرش پر بچھا ہوا تھا۔ لاکھ ضلہ
کرنے پر بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے منہ سے
آہ نکل ہی جاتی۔ میسے اور سسرال دونوں جگہ ناز و نعم
میں عمر گزاری تھی۔ نرم گدیلوں، تکیوں پر لیٹنے، ہونے
کی عادت تھی۔

عرش سے فرش پر آنے کے بعد بہت کچھ سہا
مگر اس وقت کی تکلیف سب سے بڑھ کر تھی۔ وہ
پورے دنوں سے تھی، اس وقت اور ایسی حالت میں
نیچے لیٹنا ایک قیامت تھی، کمر تختہ ہو رہی تھی۔ پورے
پدن میں درد کی لہریں ایک کے بعد ایک آ رہی
تھیں۔

”ہائے اللہ میاں جی! ہم کیا کریں ہوا جی۔“
تکلیف سے بے چین ہو کر اس نے پہلے اللہ کو پھر
انہیں پکارا جنہوں نے ہر ہر قدم اس کا ساتھ دیا تھا۔
”صبر سے کام لو بھنو! جب سارے مشکل
وقت گزر گئے تو یہ وقت بھی گزر ہی جائے گا۔“ ہوا
نے تسلی دی۔

”وقت تو گزر گیا مگر ہم سب کو خاک کر گیا۔“
طیبہ بیگم نے خاک کے فرش پر بیٹھے بیٹھے ایک آہ
بھری۔ ”سات ماہ ہونے کو آئے مگر اب تک دل کو
صبر آ یا نہ قرائن سکون۔ لوگوں سے رشتوں سے، عیش
و آرام اور ساز و سامان سے بھری پری حویلی۔ آہ وہ
زندگی، ہوا کا جو بھی جھوٹکا آتا، خیر کا، خوشیوں کا
پیغام لاتا۔ پھر ایک ایسی آندھی چلی کہ سب کچھ بکھر
گیا۔ لوگ بھی، رشتے بھی، گھر اور گھر کا عیش و آرام
ساز و سامان، سب کچھ چشم زدن میں تباہ و برباد
ہو گیا۔ ختم ہو گیا۔

میر و جاہت حسین اور اس کنبے کے سارے
مردوں کی موت کی خبر حویلی پہنچی تو بڑی ماں کھڑے
سے ہی گر پڑیں پھر بھی نہ انھیں۔ خوف و ہراس کا
ماحول، افراتفری کا عالم، پھر قاسم علی نے خبر دی کہ

گرہی فوج کے سپاہی حویلی پر حملہ کرنے والے
سراہان کی لوٹ مار کریں گے پھر آگ لگا دیں
خبر پہنچی جلدی ممکن ہو، یہاں سے نکل جائیں۔
دونوں بیٹیں، دوپورانی جنھانی طیبہ اور رفعت

ایک دوسرے سے لپٹ کر بے طرح رو دیں، ویسے
بھی سوائے دن رات انہیں روینے کے سوا اور کام ہی
نہ تھا۔ زندگی سراپا آنسو بن گئی تھی، دونوں بہنوں کا
مکمل برنڈھ میں تھا، گودلی سے بہت زیادہ فاصلہ نہیں
تھا مگر حالات ایسے تھے کہ پڑوس کی خبر لینا بھی مشکل
تھا۔ بیک اپنی خبر کیسے پہنچاتیں کہ ان پر کیا
ذمت گزر رہی۔ قدرت کو ہی رحم آیا کہ جامع مسجد
والی کے قریب بوا کے ایک خالہ زاد بھائی رہتے
تھے۔ بوا دونوں بہنوں کو وہیں لے گئیں، بڑی مشکل
سے جیتے چھپاتے وہاں پہنچے، چھوٹا سا گھر، غریبانہ
باؤل، مگر شرم لحاظ والے تھے۔ گھر کی ایک کونٹری
انکس دے دی۔

”اب تو بوا! بادشاہ ہے، بادشاہ کے کنبے یہ برا
وقت آیا ہوا ہے تو حویلیوں اور جاگیروں والے کس
تختی میں ہیں۔“

”ہاں بھئی! ٹھیک کہتے ہو۔“ بوا نے ایک آہ
بھری۔

”یہ بچے اپنے ساتھ خدا جانے کون سی زہریلی
ہولائے ہیں جو بھی سانس لیوے، مر جاوے۔ میں
کہوں جنھن میاں! یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور
کب؟“ بوا ایسی بیٹھی جنھن میاں سے حال احوال
کنا بھی رہی تھیں، بتا بھی رہی تھیں۔

”لوٹ اس کروٹ بیٹھے یا اس کروٹ۔ ہمیں
توہنی ہی پتا ہے۔“

جنھن میاں نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں
جیسے سات ماہ تک وہ زیادہ تر خاموش ہی رہیں۔
پہلے موت پورے ہندوستان میں جہاں جہاں جو جو
نہایت گز رہی تھی، گز رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی
صہیت کا ہندوستان سے خاتمہ کر دیا گیا۔ اب اس
بیمار ملک کو روپیہ کے نام کا سکہ چلنے والا تھا۔ تاج

برطانیہ کے نو آبادیاتی ہیروں میں ایک ہیرا
ہندوستان نام کا بھی شامل ہو گیا تھا۔ جو مطلقاً
نہیں ہے، انہیں سزا میں دی جا چکی تھیں اور دی
جا رہی تھیں اور وفاداری کی سند پانے والوں کو انعام و
اکرام سے نوازا جا رہا تھا۔

جنھن میاں کے چھوٹے سے گھر کی نیم تاریک
کونٹری میں۔ سزا یافتہ خاندان کی بہو رفعت آرا
بورے پر لیٹی تڑپ رہی تھی۔

”کاش! میں موت آجائے۔“ درد کی شدت
سے وہ تڑپی۔

”نہ بھنوا اللہ سے اس کی رحمت مانگو، موت
نہیں۔“ بوا نے ان کا سر سہلایا۔

”ہم کیوں نہ مر گئے ان سب کے ساتھ۔“
رفعت آرا کو صرف جسمانی نہیں ذہنی تکلیف بھی
بہت تھی۔ زندگی کی وقت کی، حالات کی، بہت ساری
حقیقتوں کو اس نے اب تک قبول ہی نہیں کیا تھا۔ تب
ہی ہر آنے والے دن نے اس کی ذہنی تکلیف میں
اضافہ ہی کیا تھا۔

رات کا تیسرا پہر گزر رہا تھا، اب تک کا سارا
وقت آنکھوں میں کٹا تھا۔ پوچھی اور سحر کے پہلے
اجالے کے ساتھ ہی فضا میں ایک ننھی منی سی چیخ بلند
ہوئی۔ اس رونے کی آواز نے کونٹری میں موجود
نفوس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

”ماشاء اللہ چاند کا لکڑا ہے۔“ بواجی نے دلائی
میں لپٹی بچی کو پیار سے دیکھا۔

”یہ تو بالکل بڑی ماں کا عکس لگ رہی ہے۔“
طیبہ بیگم بچی کو دیکھتے ہی بے ساختہ بولیں۔

”ہاں بھنوا! میری آنکھوں نے بھی یہی دیکھا
کہ یہ تو بالکل اپنی دادی حضور کی شبیہ ہے۔ اس لیے
اس کا نام اپنی دادی کے نام پر ہی ہو گا نور فاطمہ۔“ بوا
جی نے بولتے ہوئے بچی کو طیبہ بیگم کی گود میں دے
دیا۔

☆☆☆

خالی ڈھنڈا حویلی میں دیوانوں کی طرح ادھر

سے اصرار اصرار سے اصرار کرتے ہوئے لکھنا کہیں
 تو ایک شخص کے ساتھ لگ کر بیٹھ کر لکھ رہے ہیں۔
 سارا اسباب بندھا ہوا کمرے میں دھالوا ہوا ہے،
 جس میں رکھا ہوا تھا کئی چنگڑوں اور ذیل گاڑیوں،
 ساراں جاچ کا تھا، اب بھی بہت سا باقی تھا۔ وہ انوں
 پھر سے لگ چکے تھے مگر اتنی بڑی سولی میں پہلے
 تھا اسباب خانہ دار کی تھا۔ اٹھتے پھر سے پہلے لکھ
 ہو رہے تھے۔ رحمت کی دیکھ میں لکھ نہیں آ رہا تھا۔
 قاسم علی مع کا کیا چراغ چلے کمرے میں کہ تھا،
 آتے ہی کھانا کھا کر سو جانا مگر آج تو باؤں تھا۔
 حویلی کا سارا سامان بندھوانے میں مصروف قاسم علی
 کمرے سے نکل کر آیا تو رحمت کی کوئی چیز لکھ رہا تھا
 دیکھ کر اس کی ڈشانی پر ناگواری کی شکایں پڑ گئیں،
 اندر جا کر دو کرسیاں ہاری ہادی اٹھا لیا۔

”لہاں جان اچھے کیوں نہیں ہیں، اسباب
 بیٹھے۔“ اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش
 کی۔

”کیا کفر کہتے ہو، یہ ہمارے مالگوں کی کرسی
 ہے ہم اس پر نہیں کے تو کوڑھی ہو کر مریں۔ رہنے
 دو۔ ہم بیٹھے ہی لکھ رہے ہیں۔“ رحمت بی نے بیٹے کو
 ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔
 ”اب یہ سب ہمارا ہے، سرکار نے یہ ہمیں
 دے دیا ہے۔“ قاسم علی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”اولی اللہ! ہمیں کا ہے کو دے دیا؟“ رحمت
 بی یوں اچھلیں جیسے پھوٹنے کاٹ لیا ہو۔

”اللہ رکھے اس حویلی کے اور ساز و سامان کے
 وارث زندہ ہیں۔ سب کچھ ان ہی کا ہے، ہم کیوں
 دوزخ کے انگارے بنیں؟“
 ”سب لوگ مرکب گئے۔ کسی کا کچھ پتا نہیں،
 نہ کوئی خبر پڑی ہے۔ اب یہ سب کچھ سرکار کا ہے، ہمیں
 نہیں دے گی تو کسی اور کو دے دے گی۔“ قاسم علی
 کے لہجے میں درستی کے ساتھ سبک دلی اور شقاوت
 بھی تھی رحمت بی تو تڑپ کر رہ گئیں۔
 ”کفر کے کلمے منہ سے نہ نکال قاسم علی پہلے

اسی اس کہ لکھنا تھا، اس کا ہاتھ لکھ رہے ہیں
 بیٹے ہیں ان کے بیٹے کی دیکھ رہے ہیں
 مالگوں کی لکھ رہے ہیں، رحمت بی نے لکھنا
 لکھنا وہ ہمارے یہاں آئی ہیں، انہیں لکھنا
 شہد کی قبروں کی لکھنا پھر سے اپنے لکھنا
 لکھنا۔“ رحمت بی نے لکھنا لکھنا لکھنا

”سرکار کے خلاف ہمارے مالگوں کا اس
 بھی براہ الامام ہوا ہے، لہاں جان انہیں لکھنا
 ہوگا۔ اب وہ ناگوار ہونے لگے ہیں، اب راجہ اس
 کا ہوگا۔ لکھنا ہم لکھنا گئے۔ وہ شہد کی
 قبر میں آپ کی آئندہ لکھنا کے لیے بیٹھے ہیں۔
 ہو لکھنا رہے ہیں، جو دعائیں لکھنا ہیں، اپنی لکھنا کے
 لیے لکھنا۔ ماضی کو بھول جائیں کہ آپ کیا تھیں، ہم
 کیا تھے، اب ہم وہ نہیں ہیں تو تھے۔“

”میں تو اب بھی وہی ہوں، اب اپنے مالگوں
 کی خبر نہ لے، پوری زندگی کا تمک لکھنا، اب آخر
 عمر میں تمک حرامی کیسے کروں؟“ رحمت بی نے لکھنا
 سے بولیں، ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا، وہ جو
 اور اور ہاتھ نہ بیٹھے کی باتیں۔

حویلی کا سب سامان چلا گیا، قاسم علی بھی چلا
 تھا اپنی جائیداد پر جانے کے لیے جہاں ایک نئی زندگی
 اس کی منتظر تھی۔ بڑی شان دار حویلی، نواکی بھی اس
 نے..... دہلی کی اس حویلی سے بھی شان دار، جس
 میں وہ ملازم تھا۔

اپنے خاص کارندے مہابت خان کے ساتھ
 وہ حویلی کے مختلف گوشوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ کس
 کچھ رہ تو نہیں گیا حالانکہ مہابت خان نے یقین دلایا
 تھا کہ اب سوائے سنگڑ پتھر کے یہاں کچھ نہیں رہا مگر
 پھر بھی قاسم علی نے خود مکیوم پھر کر اپنی سولی کی۔ پوری
 حویلی خالی ڈھنڈا رہی تھی، شاگرد پیشہ کی طرف بھی
 بے روٹی اور ویرانی تھی۔ سوائے ان بڑیوں کے، جو
 بہت پرانی ملازما میں تھیں، اپنی عمریں انہوں نے
 اپنے مالگوں کی خدمت میں گزار دی تھیں، جب کام

ہاج کے قاتل نہ رہیں تو بھی مالکوں نے ان کا اکرام کر دیا۔ سب سے پہلے ان کی تمام تر ضروریات بدستور پوری ہوئی رہیں اور اب ان کو تمام تر بددعائیں اور فتنے اٹھریزی حکومت کے لیے وقف ہو گئے تھے جس کے جوہر وہم نے ان کے مالکوں پر اتنا بڑا قہر ڈھایا اور ساتھ ساتھ خود انہیں بھی بے آسرا کر دیا۔ شاگرد پٹے کے صحن میں وہ چاروں بڑھاپوں سرسبز ڈائے بیٹھی تھیں۔ نہ انہوں نے قاسم علی کو نظر اٹھا کر دیکھا نہ مہابت خان کو، دونوں باتیں کرتے ان سے ذرا فاصلے سے گزر گئے۔

”ان بی بیوں کا کیا کرنا ہے؟ باقی سب تو جہاں جہاں سینک سائے چلے گئے۔ یہی چاروں رہ گئی ہیں۔“ مہابت خان نے چلتے چلتے سوال کیا۔

”گائے بوڑھی ہو جائے اور دودھ دینے کے قابل نہ رہے تو اسے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ اپنے پاس رکھ کر کوئی نہیں پالتا۔“

قاسم علی نے وہی جواب دیا جو اس کی بے رحم مرثیہ اور خود غرض فطرت کے عین مطابق تھا۔ چلتے چلتے دونوں حویلی کے پچھلے برآمدے میں آ گئے تھے، یہاں زنان خانہ ہوا کرتا تھا۔ برآمدے سے ملحقہ لائن سے کمرے تھے جو گھر کی خواتین کے استعمال میں تھے۔

قاسم علی برآمدے کے گول ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور مہابت خان سے بولا۔

”مہابت خان! پانی تو لے کر آؤ، پیاس نموس ہو رہی ہے۔“

”جی حضور۔“ وہ لپک کر گیا اور منگے سے پانی نکال کر کٹوا بھر کر لے آیا۔

”حضور کی عرضی کا جواب آیا سرکار کی طرف سے؟“ خالی کٹورا واپس لیتے ہوئے مہابت خان نے سوال کیا۔

”آجائے گا جواب بھی۔ سرکار کوئی فارغ تو نہیں ہوئی ہے، سوئیں ہزار جھیلے ہیں جان کو۔ دے دے گئے تھاب، جب جاگیر دے دی، خطاب دے

دیا، اعزاز بھی دیا۔ انعام و اکرام بھی تو جواب بھی دے دیں گے۔“

قاسم علی کو اندر سے مضطرب تھا مگر مہابت خان کو متانت سے جواب دیا۔

”حضور نے تو جاں نثاری اور خیر خواہی کی حد کر دی مگر سرکار نے ویسی دلداری نہیں دکھائی جیسی دکھانی چاہیے تھی۔ کیا نہیں کیا آپ نے ان کے لیے، کتنے گھرانوں کی، لوگوں کی تفصیلات فراہم کیں۔ وہ فساد کی جو اپنے تئیں جہادی بنے ہوئے تھے، ان کی معلومات اکٹھی کیں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر ورنہ کسی کو ذرا بھٹک بھی پڑ جاتی تو سرائی کر چوک پر لٹکا دیتے آپ کا۔ پھر میر صاحب کے گھر سے جس طرح آپ نے پورا کا پورا بادشاہی کنیہ پکڑا کر وفاداری کی۔ ٹھیک سے قدر دان سرکار ہوئی تو جنے کیا سے کیا انعام و اکرام دیجی۔ سر آنکھوں پر بٹھائی، مگر یہاں تو سرکار نے گدھے کھوڑے سب برابر کر دیے۔“

مہابت خان بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا۔

مہابت خان جیسے خوشامدی آس پاس نہ ہوں تو قاسم علی جیسے نفس پرست، گھمنڈی سانس بھی مشکل سے لیں۔ مہابت خان نے قاسم علی کی دکھتی رگ پر ہاتھ ڈالا تھا، وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔

”امید تو بہت تھی سرکار سے مگر خیر اب عرضی ڈالی ہے کچھ تو جواب آئے گا ہی۔“ قاسم علی نے سر اٹھا کر آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھا جو بے فکری سے پرواز کر رہے تھے۔

”ہماری بھی پرواز کا وقت آ گیا مہابت خان۔ اب دولت کے، عزت کے آسمان پر اڑان بھرتے نظر آئیں گے ہم۔“

”کیوں نہیں سرکار! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے، آپ کی اڑان اونچی سے اونچی کرے۔“

”آمین۔“ قاسم خان آگے بڑھ گیا۔

مہابت خان پیچھے پیچھے چلا۔

ان دونوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ ان برابر برابر

طیش آرہا تھا مگر زبردستی تو کرنے سے رہا، ہمارا
واپس چلا آیا۔

رات میں حسب معمول بڑھیاؤں کی منطقی
جی، سب نے روز کی طرح بد عاؤں اور کنسوں کا
سلسلہ شروع کیا۔ رحمت بی کی باری آئی تو بیٹے کو
دعا دینے سے پہلے ان کی روح پر دوا کر گئی۔
☆☆☆

شب خوالی کا لبادہ پہن کر بستر پر لیٹ تو کیا
آنکھیں بھی بند کر لیں مگر نیند تو اختیار سے باہر تھی۔
دماغ میں ہزار اندیشوں کا میلانگا ہوا تھا۔ سوچ سوچ
کر سر بھٹنے کے قریب تھا مگر کوئی راہ نظر نہ آئی کوئی
حل بھانگی نہ دیتا تھا۔ باپ کے سامنے اپنی مشکل کا
تذکرہ کرنا یا مدد چاہنا، ایک اور قیامت کو دعوت دینا
تھا۔

زرتاج مہر کی سوشل لائف اتنی مصروف تھی کہ
وہ کچھ وقت اگر بیٹے کی بات سننے کے لیے نکال بھی
لیتیں تو بات سن کر یقیناً غش کھا جاتیں۔ وہ صرف
مشہور ہی نہیں بلکہ بہت معزز اور عزت دار، خاندانی
گھرانے کی حیثیت سے جانے مانے جاتے تھے۔
گھر کو کہ اس معاشرے میں اس طرح کی
اولادیں ایک عام سی بات تھیں، انہیں نیچرل چائلڈ کا
نام دیا گیا تھا مگر یہ رعایت عمومی لوگوں کے لیے تھی۔
اشرافیہ کی تو ویسے بھی عام سے عام بات بھی خبر کی
سرخ بن کر اخبار میں لگ جاتی تھی۔ ولی شاہ اور
زرتاج مہر بھی برداشت نہ کرتے کہ ان کا نام اس
طرح اخباروں میں اچھالا جائے اور لوگوں کی مپ
شب کا نشانہ بنے۔

پھر عبدالمعید کی ازدواجی زندگی اور خوشیاں دلو
پر لگ گئی تھیں۔ ابھی تک تو زہرہ بے خبر تھی مگر اس خبر
پر اس کا رد عمل کیا ہوتا تھا۔ عبدالمعید کو بنوئی اندازہ تھا
پھر اس کے بچے، جو اتنے بڑے تو تھے کہ معاملات پر
اپنے رد عمل کا اظہار کر سکیں۔ ان کے ذہن پر اس خبر کا
بہت بڑا اثر پڑتا تھا۔
”کیا بات ہے میڈی اتم اتنے پریشان کیوں

بنے کروں میں سارے کمرے خالی نہیں تھے۔ ایک
کمرے میں وہ وقادار بڑھیا بیٹھی تھی جسے اپنے
بالکوں کی بربادی کا غم کھائے جا رہا تھا، جو حویلی کے
ہر ہر کمرے، گوشے، کونے کھدوے اور چپے چپے پر
اپنے چائیس بیالیس سالوں کو بکھرا ہوا دیکھ رہی تھی۔
یہاں گئے مینوں کے حسن سلوک کے بوجھ تلے دبی
ہوئی۔ یہاں سے جانے کے لیے اس کے قدم ہی
نہیں اٹھ رہے تھے۔

اس نمک حلال عورت نے مہابت خان اور
قاسم علی کی زبانی اتنی بڑی نمک حرامی کی مختصر داستان
سنی تو سکتے میں آگئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا اپنے
کانوں پر اور اپنے آپ پر۔ وہ خود سے سوال کر رہی
تھی۔ کیا یہ سانپ میں نے جتا جس نے میرے
محسنوں کو ڈس لیا؟“

رحمت بی کا دم گھٹنے لگا، سانس اٹکنے لگی تھی۔
جہاں چاروں بڑھیاں بدستور سر نہیڑائے بیٹھی
تھیں۔ رحمت بی بھی ان میں شامل ہو گئیں، اتنے
میں قاسم خان تیز تیز چلتا ہوا دہاں آیا۔
”حد ہوئی اماں جان! آپ سے ہم نے کہا تھا
کہ جا کر سواری میں بیٹھیے، ہم ابھی آتے ہیں اور
آپ یہاں موجود ہیں۔“ وہ بہت جھٹایا ہوا لگ رہا
تھا۔

”ہم کل جائیں گے۔“ رحمت بی نے بیٹے کی
طرف دیکھا بھی نہیں۔
”کل تک آپ کیا کریں گی یہاں، نہ سازو
سامان ہے نہ کھانا پینا۔ روٹی کا بھی کوئی خاص
بندوبست نہیں رہا۔“

قاسم علی کچھ دیر جواب کا منتظر کھڑا رہا مگر رحمت
بی کچھ نہ بولیں، خاموش رہیں۔
”آپ بھی کبھی بچوں کی طرح ضد پکڑ لیتی
ہیں، ٹھیک ہے۔ آپ رک جائیں آج رات یہاں،
کیونکہ کل آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔ میں ابھی ایک
ملازم کے ہاتھ کچھ سامان اور کھانے پینے کی اشیاء
بجواتا ہوں۔“ قاسم علی کو ماں کے پیٹے روئیے پر

”دفع کرو اس لڑکی کو، بھاڑ میں جائے میری بلا سے۔“

مگر شاید اخلاقیات کی کچھ رمت اس میں ابھی موجود تھی۔ جب بھی وہ ماریہ سے پیچھا چھڑانے کا ارادہ کرتا، اندر سے کوئی اس کو ملامت کرتا۔ عبد المعید کے سوا ماریہ کا کوئی اور رشتہ دنیا میں موجود نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو شاید ہی کوئی اسے قبول کرتا۔

عبد المعید نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کر کے اپنی ازدواجی زندگی کو بھی داؤ پر لگالیا تھا۔ مگر گزرتا ہر ہر لمحہ اس کے لیے کڑا امتحان تھا۔ اس کا وجود سچ اور جھوٹ کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ زہرہ کے سوالات کا جوابات دیتے دیتے وہ تھک جاتا تھا، اسے مطمئن کرنے کی کوششوں میں کبھی بے زار بھی ہو جاتا۔

گلے میں چھپھوند رانک گئی تھی، نکل سکتا تھا نہ اگل سکتا تھا۔

☆☆☆

قاسم علی کے ہاتھوں میں گورنر جنرل کا فرمان محررہ بمطابق 22 جنوری 1858 تھا، تین بار وہ اسے پڑھ چکا تھا۔ ہر بار خوشی کے مارے اس کا برا حال ہو جاتا، اب وہ اس فرمان کو چوتھی بار پڑھ رہا تھا۔

”یہ دیکھتے ہوئے کہ فساد شروع ہونے سے قبل کیپٹن براؤن کی طلبی پر تم دہلی ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوئے اور بعد ازاں کیپٹن موصوف کے ماتحت کمانڈر انچیف کے میرٹھی مقرر ہوئے اور تم نے خفیہ اطلاعات کی فراہمی میں اپنے فرائض نہایت شان دار اور بہترین طریقے سے ادا کیے اور یہ کہ محاصرہ دہلی کے دوران تم نے مستند خبروں کی فراہمی میں مؤثر کارگزاری دکھائی۔“

اور یہ کہ تمہیں ایک خاص مہم سونپی گئی اور تم علاقہ کے زمین داروں کو اپنے مقاصد میں شریک کر کے، ان کے جاسوسوں کے ذریعے باغیوں کی نقل و حرکت کی اطلاعات فراہم کرتے رہے۔

جس کی زبردستی میں زہرہ، شوہر کو بغور دیکھ رہی تھی۔ میڈی کی طرح وہ بھی نہیں سوئی تھی۔

”میڈی کے پاس یہی ایک بہانا یا جواز ہے کہ وہ زہرہ کو دیکھنے کے لیے تمہیں بزنس پر بلانے لگے۔“

”اس سے پہلے تو تم کبھی بزنس پر بلانے لگے تھے؟“ زہرہ نے ہمیشہ آفس میں ہی چھوڑ کر آتے تھے۔

”اس بار پر بلانے ہی کچھ ایسی ہیں کہ میرے ہاتھ ساتھ چلی آئیں۔“

”میڈی! مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“ زہرہ نے عبد المعید کے رخسار پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”زہرہ! ہم دونوں میں ایک ہی پریشان کافی ہے۔ اگر تم بھی غم مند ہو گئیں تو مجھے تسلی کون دے گا؟ میری دل جوئی کون کرے گا؟“

عبد المعید نے زہرہ کی زلفوں میں منہ چھپالیا جسے خطرے کو دیکھ کر ریت میں اپنا منہ چھپالے یا کبوتری کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لے لیکن منہ چھپانے یا آنکھیں بند کرنے سے فقط خود فراموشی اور غلط فہمی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، خطرہ نہیں ٹل جاتا۔

بہت سوچ بچار کے بعد عبد المعید نے اس مسئلے کا حل نکال ہی لیا۔ ایک بہتر جگہ نئے فلیٹ میں ماریہ کو منتقل کیا، اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرائی۔ پہلے تو اس نے ہاسٹل میں رہائش کے لیے ماریہ کو منظور کیا مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

”مجھے کیلے رہنے کی عادت ہے۔“

اس کا دونوں انکار سن کر عبد المعید کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ماریہ خود سر ہونے لگی۔ ماریہ کی مالک۔ دل چاہتا تو اس سے بات کہتا، مگر تو منہ میں گھٹن گھنٹیاں ڈالے بیٹھی رہتی۔ عبد المعید نے کئی بار سوچا، بہت سوچا اور اپنے دل کو سہانگی کی حد تک سخت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے

اور یہ کہ تم نے شاہ دہلی کے خاص ملازموں سے ساز باز کر کے قلعے کے اندرونی حالات سے آگاہی حاصل کی اور یہ کہ تمہاری قابل قدر کوششوں سے سابق شاہ کا قریبی ایک اہم گھرانہ گرفتار ہوا۔ اور یہ کہ تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر شہر دہلی میں دوسروں کو انعام میں لینے والے جعلی خطوط لکھے اور اس طرح وہاں بے اطمینانی اور نا اطمینانی کے بیج بوئے۔

اور یہ کہ تمہارے اندر جاسوسی کی اعلا درجے کی لیاقتیں ہیں، تم ہمیشہ قابل اعتبار رہے اور ہمارے لیے سودمند رہے اور یہ کہ تم نے متحدہ انہم اور امتیازی خدمات انجام دی ہیں۔ لہذا صوبہ پنجاب ضلع میں جنہیں ہزار ایکڑ زمین کی جاگیر بخشی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ 2280 روپے تمہارے نام تاحیات پانچ سو روپے برائے نسل بعد نسل، ہماری کمال حمایت کے سبب یہ عمر بھر جاری رہیں گے اور چودہ سو روپے کی جاگیر نسل بعد نسل تمہارے ان بیٹوں کے لیے ہوگی جو تمہارے اپنے خونی رشتے کے وارث ہوں۔

چیف کمنشنر پنجاب کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ جنہیں اس فرمان عام کے ساتھ ایک خلعت مانگی پانچ ہزار روپے پیش کی جائے۔ تم بلاشبہ اس اعلا انعام کو اپنی آسائش اور بہبودی کا ذریعہ سمجھو گے جو بعض تمہاری خدمات کے جنہیں عطا کیا گیا ہے اور اس فرمان کو اپنے دوستوں اور ہمسروں کے درمیان ذلتی فخر اور عزت کا باعث خیال کرو گے۔

☆☆☆☆

لنچ کا وقفہ تھا، داؤد امین ابھی تک اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ کمپیوٹر کے آگے بیٹھے اس کے ہاتھ مستقل حرکت میں تھے۔ آنکھیں اسکرین پر، ڈیٹ کو لا کا ایک کین میز پر رکھا تھا جس میں سے وہ وقفہ وقفہ سے نمونہ بھر لیتا، اتنے میں دروازہ کھلا اور لارا جونز اندر داخل ہوئی۔

”یہ ہاتھ مارا لنچ۔“ اس نے شاہ سے ڈبا نکال

کر تیرے کھلم کھلا ہوا کی مہک آفس میں بچھا۔
”تھیک یو ڈیو! تم نے یہی سب سے جاننا دوست ہو۔“ داؤد امین نے اسکرین سے غور سے بٹائیں اور لارا کھینچا۔

”کل سے بہت معروف ہے، لنچ کے لیے بھی وقت نہیں مل رہا۔“ لارا نے اپنا لنچ کا ڈبا کھینچا ہوئے تبصرہ کیا۔ داؤد مسکرا دیا۔ کمپیوٹر بند کر کے اپنے لنچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں اتنا ایکسائٹڈ ہوں کہ مجھے بیک بھی نہیں لگ رہی۔“ داؤد نے زیتون کا کھڑا اٹھا کر حوض میں رکھا۔

”تو مسٹر داؤد! اس ایکسائٹڈ کی وجہ کا اعلان کب کریں گے۔“

لارا کے ٹھنڈے پرسکون لیجے اور تفصیل میں ایک میٹھا سا طنز چھپا تھا جسے بھانپ کر داؤد نے قہقہہ لگایا۔ لارا کو لگ گیا، بڑی اچھی دوست تھی۔ آفس میں سب سے زیادہ وہی داؤد کے قریب تھی، اپنے پیشہ دارانہ معاملات ایک دوسرے سے ڈسکس بھی کر لیتے تھے اور مشاورت بھی مگر اس بار داؤد نے دو چار روز سے اپنے ارد گرد ایک خاموش پراسرار تھا قائم کی ہوئی تھی۔ لارا کا اشارہ اسی طرف تھا اور داؤد فوراً سمجھ گیا تھا۔

”میں تمہاری طرف سے اسی بات کا انتظار کر رہا تھا۔“ لارا کا فقرہ سن کر وہ بہت محفوظ ہوا تھا۔ بڑے اطمینان سے جیزا کا ایک کھڑا ختم کر کے داؤد نے بتایا۔

”بھئی تمہاری قہاس کا کیس میرے پاس آیا ہے، میں نے یہ کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ساری دنیا کو معلوم ہے کہ وہ مجرم ہے۔“ لارا بھی بہت اطمینان سے اپنا لنچ ختم کر رہی تھی۔

”کیس کا فیصلہ دنیا نہیں، عدالت کرے گی۔“
”جوتوں پر، گواہوں پر اور بیانات پر چلتی ہے۔“
”سارے ثبوت اور گواہ جیلری کے خلاف ہیں۔“

”مگر میں اسے بے گناہ ثابت کروں گا۔“
داؤد کے چہرے پر، لہجے میں وہی اعتماد تھا جو اس کی
فحبت کا خاصا تھا۔

”جو دھوپیں منزل پر بیٹھنے کا یہ مطلب نہیں ہے
کہ دوڑے بھی اتنے ہی بلند کیے جائیں۔“
لارا مسکرائی۔ یہ طنز نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی۔
اس کیس کے بارے میں وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی
کہ جو ثبوت اور گواہ موجود ہیں وہ جیفری کا موقف
کمزور ثابت کرنے اور اسے سزا دلوانے کے لیے
کافی ہیں۔

”جانتی ہوا ایڈم نے یہ کیس لینے سے انکار
کیوں کیا؟“

”شاید اس کے ضمیر نے اجازت نہیں دی، کوئی
بھی اچھا وکیل جیفری جیسے کہ مرسل کو رہا کروا کر خود کو
اور اپنے کیریئر کو داغ دار نہیں کرے گا۔“ لارا ذرا
حفاظت ہو کر بولی۔

”کم آن لارا! بچوں جیسی باتیں مت کرو۔“
داؤد نے باقی ماندہ پیزا ختم کرتے ہوئے مسکرا کر
اسے دیکھا۔

”اگر ہم ہر کیس اخلاقیات کے پیمانے پر
تولنے بیٹھ جائیں تو دنیا کا ہر وکیل اپنے پورے کیریئر
کے آدھے سے زیادہ کیسز لڑنے کے بجائے چھوڑ
دے مگر تم جانتی ہو ایسا نہیں ہوتا۔ میں اس فیلڈ میں
آیا ہوں تو مجھے پیسہ بھی کمانا ہے اور آگے تک جانا
ہے اور یہی بات ایڈم کی تو نوے فیصد وکلاء کی طرح
اس نے یہ سوچ کر یہ کیس چھوڑ دیا کہ جو توں اور
گواہوں کی موجودگی میں جیفری کو سزا یقینی ہے۔ یہ
وہ مقدمہ ہے جس میں جیفری کی طرف سے لڑنے
والے ہر وکیل کو اپنی ہار یقینی نظر آ رہی ہے۔“ بخ بستہ
نیز کا کھونٹ بھرتے ہوئے داؤد نے اپنا تجربہ پیش
کیا۔

”اور تمہیں یہ ہار نظر نہیں آرہی؟“ لارا نے
ایک مہری سانس لی۔
داؤد میز پر کہنیاں ٹیک کر آگے کو جھکا اور اس

نے لارا کی آنکھوں میں جھانکا۔

”لارا ڈیر! مجھے اس کیس میں فقط ایک ہی شے
نظر آتی ہے، وہ ہے بھاری فیس جو جیت کی صورت
میں دینی ہو کر ملے گی۔ اتنی بڑی رقم کے لیے میں کسی
بھی ہار کو جیت میں بدل سکتا ہوں اور تم سے زیادہ
میری صلاحیتوں کو کون جانتا ہے۔“

”اتفاق سے میں اس مافیائے بھی تھوڑی بہت
باخبر ہوں جو جیفری کے پیچھے ہے اور اسے سپورٹ
کر رہا ہے۔ بے شک جیت کی صورت میں وہ
تمہاری فیس ڈبل کر کے دے سکتے ہیں مگر یہ بھی
دھیان رہے کہ شکست کا جواب ایک گولی بھی ہو سکتا
ہے۔ جو ان لوگوں کے لیے ایک عام سی بات ہے۔“
لارا بے حد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”بڑی کامیابی کے لیے رسک بھی بڑا ہی لیا
جاتا ہے۔“ داؤد امین لارا سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو چلا
تھا۔

☆☆☆

”قسمت کے پھیر ہیں یا تقدیر کی گردش یا
گناہوں کی سزا یا خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے
کوئی آزمائش۔ کیا ہے یہ سب؟ لاکھ سے خاک پر
اور آسمان سے زمین پر آگئے؟“

رفعت میں اپنی بہن کی نسبت برداشت کا مادہ
کم تھا پھر وہ بھی بے حد کم سن۔ چودھواں برس لگا
تھا کہ بیاہ ہو گیا اور بیاہ کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ
پورے گھرانے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ طیبہ بیگم کون
سا عمر اور تجربے کی بجائی سے گزری ہوئی تھیں۔ دو
سال کا ہی تو فرق تھا دونوں میں، مگر مزاج میں ٹھہراؤ،
بردباری اور صبر و تحمل کے اوصاف چھوٹی بہن کی
نسبت زیادہ تھے پھر بھی زندگی میں یہ جو انقلاب
آپا۔ مشکل ہی تھا کہ جھیل پاتیں اگر جو بوا ساتھ نہ
ہوئیں۔

خدیجہ بوا ان دونوں بہنوں کی آپا تھیں، بچپن
سے ہی دونوں بہنیں ان سے بہت مانوس تھیں۔
شادی ہوئی تو ڈھیروں ڈھیر ساز و سامان کے

علاوہ ایک ایک ذاتی مازمہ اور ہوا بھی جہنم میں ساتھ
آئی تھیں اور جہاں تک ممکن تھا وہ حق تک ادا کر رہی
تھیں۔ اس وقت بھی وہ ٹیلی فون فاطمہ کے ”لوئی“
کر رہی تھیں بلکہ تقریباً کر رہی تھیں۔ بچی کا جانہ
سلا جلا چہرہ اور فراخ پیشانی دیکھ کر کیا کیا کچھ سوچ کر
رہ گئیں۔

”سب نصیب کے کھیل ہیں۔ اگر جو ہوتی یہ
بچی اپنے باپ دادا کی جو ملی میں، وہاں پیدا ہوتی تو
کیا کیا نہ خوشی منائی جاتی۔ کیسے کیسے نیش و آرام اور
نازوں میں پلتی، وہ لاڈ اٹھائے جاتے کہ شہزادیوں
کے بھی کیا اٹھے ہوں گے۔ میر صاحب کی کتنی
خواہش تھی گھر میں اللہ کی رحمت آئے۔ اپنی بیٹی نہیں
تھی مگر بیٹی کا ارمان اور چاؤ بہت تھا۔ ہائے.....“
ہوانے ایک سرد آہ بھری۔ ”سب کچھ ختم
ہو گیا۔ لوگ بھی، ان کی شان و شوکت اور مال و
دولت بھی اور ان کی خواہشیں اور ارمان بھی۔“ بوا کی
بوڑھی آنکھیں بات بے بات بھگ جاتی تھیں۔
رفتہ اپنی آہ سے جھکے جھکے شکوے کر رہی تھی
یا اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

”جب وہ دن نہیں رہے تو یہ بھی نہیں رہیں
گے۔“ طیبہ نے ہولے سے بہن کو تسلی دی اور نور
فاطمہ کو گود میں لیا۔

”ہمیں ڈر لگتا ہے، کہیں ہماری بیٹی کا نصیب
بھی ہماری طرح نہ ہو۔“

”نہ میری رانی نہ، ایسی باتیں نہ کرو۔ خیر کا کلمہ
ٹکا لو منہ سے۔ اس بچی کی تو ماشاء اللہ جیسی روشن
پیشانی ہے، ویسا ہی روشن نصیب بھی ہو گا ان شاء اللہ
اور اللہ میری ان دونوں شہزادیوں کا بھی اقبال پھر
سے بلند کرے۔ چاندی کے چھپر کھٹ پر سوئیں،
سونے کے برتنوں سے کھیلیں۔ چاند کی پریاں آ کر
جھولا جھلائیں، سب مل کر اللہ کے گیت گائیں۔“
ہوا اپنے آئینے کی جمبولی پھیلا کر کے حضور
دعا کر رہی تھیں، وہی دعا جو ان دونوں کو بچپن میں
رات سونے سے پہلے لوری کی شکل میں سناتی تھیں۔

”کیا ہا، ابا حضور اور بھائی صاحب ہمیں
ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں۔“ طیبہ کی امید اب کچھ
نہیں ٹوٹی تھی۔

”آمن، آمن، آمین، آمین۔ یا رب العالمین۔“
ہوا صدق دل سے آمین کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

کسی نے کہا تھا کہ برطانیہ کی سلطنت پر
آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔ ارنسٹ جوہن نے ایک
طویل پامعنی نظم بعنوان ”ہندوستان یا نئی دنیا کی
بقاوت“ لکھی۔ اس کے دیباچے میں ارنسٹ جوہن
نے اس مشہور شہنشاہی نعرے یا مقولے کو یوں لکھا
کہ ”برطانیہ کی نور آبادیوں پر سورج کبھی غروب نہیں
ہوتا، لیکن خون بھی کبھی خشک نہیں ہوتا۔“

برصغیر جو ایک سونے کی کان تھا اور اب بھی
ہے۔ اس کان سے سونا نکالنے کی آرزو میں برٹش
بھی یہاں آئے، فراہسی بھی، مگر فتح انگریز کو گئی جو
سولہویں صدی میں تاجربن کر اس خطے میں داخل ہوا
اور آہستہ آہستہ اس نے یہاں کے حکمرانوں کی
مختلف کمزوریوں اور نا اتفاقیوں سے فائدہ اٹھایا۔
ڈیوانڈ اینڈ رول کا کلیہ یہاں چسپاں کیا اور پہلے
1757ء میں لارڈ کلایو کی معیت میں بنگال کے
حکمران سراج الدولہ کو شکست دے کر ایسٹ انڈیا
کمپنی کے اقتدار کی راہ مزید ہموار کی گئی۔ 4 مئی
1799ء کو ریاست میسور، قلعہ سرنگا پٹم میں، ٹیپو
سلطان شہید نے انتہائی بہادری سے لڑتے ہوئے
اپنی جان دی تو دو گھنٹے تک انگریز فوج کا کوئی سپاہی
ڈر کے مارے سلطان کے قریب نہ آیا کہ کہیں زخم نہ ہو۔

بنگال اور دکن کے ان دونوں عالی ہمت اور
بہادر حکمرانوں کو شکست دینے کے لیے باہر سے حملہ
کیا گیا اور اندر سے لقب لگائی گئی۔ دونوں کی شکست
میں ان کے قریبی وزراء کی غداری نے اہم کردار ادا
کیا۔ تاریخ کے اس تاریک اور شرمناک باب کو
اقبال نے یوں رقم کیا۔

بھفر از بچل، صادق از دکن
تک دین، تک ملت، تک وطن

اور پھر 1857ء میں مسلمانوں کے رہے
ہے اقتدار کی بجائی بھی سانس بھی چھین لی گئیں
زور کی پختہ حکومت کو گرانے کے لیے فقط ایک دھکے
کی ضرورت تھی، جسے دے کر اگلے نوے سالوں تک
انگریز اس خطے کا فرمان روا تھا۔ اس کے اقتدار کی
بنیادوں میں لاتعداد باشندگان برصغیر کا خون
ہے جس میں کثیر اور نمایاں تعداد ایک ہی قوم کی تھی
”تھے مسلمان۔ اس کی واضح اور بڑی وجہ یہی تھی کہ
یہ اس خطے کے حکمران تھے جس پر تسلط کا عزم اور
ارادہ لے کر انگریز یہاں وارد ہوا تھا اور یہی وہ قوم تھی
جس کی خاک میں بھی اگر کوئی معمولی سا چنگاری باقی
رہ جاتی ہے تو اسے شعلہ بن کر بھڑکنے کا فن آتا ہے۔
اس قوم کو گرنے کے بعد سنبھلتا آتا ہے۔

1857ء کی آخری ضرب میں یہ اس مسلمان
کو خاک کرنے کی کوشش کی گئی، کچلنے کی کوشش کی گئی
جو جہانباںی و جہاں گیری کی چنگاری اپنے اندر رکھتا
”تھا۔“

نور قاطرہ، گرینڈ پا کا لکھا تازہ ترین باب پڑھ
دی تھی اور اس کے ذہن میں کئی سوالات ابھر رہے
تھے۔

☆☆☆

سر جھکائے بڑے انتہاک سے ایک ضروری
فائل کا مطالعہ کر دیا تھا۔ اچانک اس کے آفس کا
دروازہ کھلا، عبدالمعید نے چونک کر سر اٹھایا اور اپنی
جگہ ٹھہر گیا۔ اس کے سامنے ماریہ کھڑی تھی اور
بچے بچے اس کی سیکریٹری کی تھیں۔

”کراہیہ زبردستی اندر گھس آئیں، میں نے
دستے کی کوشش کی تو بدتمیزی کرنے لگیں۔“ کی تھیں
سے عبدالمعید کو مخاطب کرتے ہوئے ماریہ کو گھورا۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے، بہت
لدھی۔“ ماریہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے
گئی۔

”کیٹ اتم جاؤ اور تھوڑی دیر تک کسی کو اندر
نہیں بھیجتا۔“ عبدالمعید نے اپنے غصے اور خوف کو
قابو کرتے ہوئے کی تھیں کو حکم دیا۔

”اوکے۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں
کندھے اچکائے اور چلی گئی۔

”تمہیں یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟“
انتہائی غصیلے لہجے میں وہ ماریہ سے مخاطب ہوا۔

”آپ نے اپنا کوئی رابطہ نمبر نہیں دیا، پچھلے
ایک ہفتے سے آپ آئے نہیں۔“

”میں مصروف تھا، تمہیں ایسی کیا ایرجنسی آن
پڑی جو تم یہاں تک چلی آئیں اور.....“ وہ ایک
لمحے کو رکھا۔ ”تمہیں یہاں کا ایڈریس کس نے دیا؟“

عبدالمعید کا رویہ انتہائی درشت تھا۔ ماریہ کو
اپنے سامنے، اپنے آفس میں دیکھ کر ایک لمحے کو تو
اس کی سانس ہی رگ گئی تھی۔

”آپ گھر آ رہے ہیں، آج یا کل؟“ ماریہ
نے اس کے اکھڑے لہجے اور سوال کو نظر انداز کیا۔

”تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟“ عبدالمعید نے
الفاظ بدل کر پھر وہی سوال دہرایا۔

”آپ آئیں گے تو اس سوال کا جواب مل
جائے گا۔“ ماریہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں، فوراً باہر
نکل گئی۔

☆☆☆

طیبہ، گرتے کا کپڑا گھٹنوں پر پھیلائے بڑی
احتیاط اور عرق ریزی سے ٹانگے بھر رہی تھی۔ باہر صحن
میں بیٹھے شبنم بھائی اور بوا کی آوازیں، بخوبی سنائی
دے رہی تھیں۔ رشیدہ بھابھی ہنڈیا کے لیے مسالا
پیس رہی تھیں۔ سل نے کی مخصوص کھٹ کھٹ بھی
ان آوازوں میں شامل ہو گئی تھی۔

”جو پتا اور نشانیاں آپ نے بتائیں، وہاں گیا
تھا اس رجواڑے میں تو کوئی مہندر راجپوت اپنے
کنبے کے ساتھ ہے۔ سنا ہے کہ انگریز کی طرف سے
انعام میں حویلی اراضی اور زمین داری ملی ہے۔ کھلم
کھلا کسی سے پوچھ نہیں سکتا، کیا خبر کون جتنا ورثہ

صاحب کا جاسوس ہے، کون نہیں۔ دہلی بی زبان میں ایک دو سے پوچھا، کسی نے سلی بخش جواب نہیں دیا یا تو واقعتاً لاعلم ہیں یا پھر ڈر کے مارے منہ میں گھٹنیاں ڈالے ہیں۔ ”خمن میاں نے بولتے بولتے ایک گہری سانس لی۔

”وہ سردار حسین سقہ، غلام مصطفیٰ درزی اور تارا چند بزاز، کوئی ملا؟“

”تینوں میں سے کسی کا کچھ پتا نہیں۔ مالکوں کے ساتھ نوکر بھی سب غائب ہیں۔ ہاں غلام مصطفیٰ کا کوئی بھائی بھتیجا تھا، اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے پیغام دے آیا ہوں کہ بڑی حویلی والے خان صاحب کے خاندان کا کوئی بھی فرد آئے پالے تو پیغام دے دینا۔ ان کی دو مستورات اپنی کھلائی (بوا) کے ساتھ میرے ہاں ہیں۔ اپنا پتا دے آیا ہوں۔“

خمن میاں نے اپنی طویل بات کا اختتام کیا، بوانے اطمینان کی سانس لی۔

”چلو یہ بھی بہت ہے، کیا خبر کوئی ڈھونڈتا ڈھاڈتا آئی جائے۔“

یہ گفتگو سننے ہوئے انڈر بیٹھی طیبہ کی انگلی میں کئی بار سوئی گچ سے کھینچی مگر اسے اس معمولی تکلیف کی چنداں پروا نہ تھی۔ اس کا رواں رواں دعا کر رہا تھا کہ میکے سے کوئی نہ کوئی انہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آ جائے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ باہر بوا اب رشیدہ بھابھی کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

”اے بیوی! مسالا پیس رہی ہو یا پتھر کوٹ رہی ہو۔ ایسی دھنا دھن؟ بے کا شور تو مولا کانوں میں گھسا جا رہا ہے۔“

”اماں! ہمدی کی کانٹھ بڑی سخت ہے، اسے ہی کوٹ رہی تھی۔“

رشیدہ بھابھی کا ہاتھ بولنے کے دوران بھی نہیں رکا تھا۔ ہمدی کی کانٹھ پر مستقل مار رہی تھیں۔ جب کلاسنے لگے تو ہالا خرواہی گئی تھی۔

”ایسی سخت شے کو تو پہلے ہاون دستے میں کوٹ لیا کرو۔“ ہوانے گکے ہاتھوں مشورہ دے ڈالا۔

”یہ سل ہی کچھ چکنی ہو گئی ہے۔ عرصہ ہوا کھانسی نہیں گئی۔“ رشیدہ بھابھی نے مسکے کی ایک اور بیانیہ بیان کی۔

”لاؤ، میں ابھی خمن میاں سے کرواتی ہوں۔ تم فارغ ہو جاؤ اپنے کام سے۔ دیے آج کیا ہوا رہندہ رہی ہو؟“

”آلو گوشت؟“

”لاؤ تو پھر کو کھیر چن دو لہو۔“ بوا ہر ادھر توڑنے کے لیے کیاری کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

صوفیہ برعین یاریہ کے مقابل بیٹھے عبدالعید کے چہرے پر ناگواری تھی۔

”آئندہ تم نہ میرے آفس آؤ گی، نہ مجھ سے ملنے کہیں اور، میں خود ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ سمجھیں تم؟“

”سمجھ گئی۔“ یاریہ نے سرد مہر انداز میں جواب دیا۔

”اب بتاؤ تم.....“ عبدالعید کا سوال ادھر ہی رہ گیا۔ بیڈ روم کے کھلے دروازے سے ایک لڑکا باہر آیا اور یاریہ کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔

”ہیلو۔“ عبدالعید کو اس نے مسکرا کر ہیلو کیا تھا۔ وہ بامشکل بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ جینز شرٹ میں ملبوس، سرسئی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی۔ ٹھوڑی پر جیسے کسی زخم کا چھوٹا سا نشان تھا۔ گے میں چین اور ہاتھوں میں بریسلٹ اور کڑے بجوئی طور پر اس کی شخصیت کا تاثر نچلے طبقے کے کسی نیم خواندہ اور لاابالی لڑکے کا تھا۔

”یہ ہیری ہے۔ ہیری آنرک۔ میرا بوائے فرینڈ۔ ہم شادی کرنے والے ہیں۔“

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

عنیدین ولی

دوست کی مشعل

اس کا نام مشعل تھا۔ بڑی بڑی روشن چمکتی
ان کے اندر لائٹین فٹ کر رکھی ہو۔ اتنی روشنی۔ اللہ۔
یہ آنکھیں تو اندھیرے میں بھی چمکتی تھیں۔ اس کی



چمک دیکھ کر اکثر ہی روشن مہرہ ہو کر رہ جاتا لیکن اسے چڑانے کو کہتا۔

”سچ بتا دو۔ تمہارے اندر کسی جانور کی روح تو نہیں سمس گئی؟ کیونکہ اندھیرے میں صرف ان کی ہی آنکھیں چمکتی ہیں۔“ وہ چڑ جاتی۔ جس چیز کی تعریف ساری دنیا کرتی تھی۔ وہ ان کی برائی کرتا۔ اسی لیے اس کی اپنے چچا زاد روشن سے بھی نہ بنی۔ کبے بنتی بھلا۔ دوسرا کا شرارتی اور وہ نازک دل کی۔ اس کی شرارتوں سے وہ ہمیشہ خائف رہتی۔ بھی ان کے پیچھے چھپی نبت وہ محسوس ہی نہ کر پائی۔

اور ویسے بھی اس قسم کی باتیں محسوس کرنے کے لیے تھوڑی بہت عقل تو چاہیے ہی ہوتی ہے اور وہ تو کوری تھی۔ بالآخر بھی۔

بھی کسی ہم عمر تو کیا چھوٹی بڑی عمر کی لڑکی سے بھی دوستی نہ ہوگی۔ شاید وہی اسے دنیا داری کی کچھ عقل دے سکتی۔ یا کم از کم اس سبکی کے گھر آنے اور روشن کی خوب دینی پر مر مٹنے سے ہی مشعال کو اپنے ننھے سے دل میں دبی محبت دریافت کرنے میں آسانی ہوتی۔ یہ خوش فہمیوں بھرا خیال روشن کا تھا۔ اور وہ خوش فہم کیوں نہ ہوتا؟ وہ مشعال سے دو سال پہلے پیدا ہوا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی غیر معمولی تھی۔ دادا ابائے اسے یہ نام دیا کہ بھی بچے گا۔

دو سال بعد وہ پیدا ہوئی۔ اس کے پیدا ہونے کے چند گھنٹوں بعد رات پھیل گئی۔ اچانک ہی ان کے کمرے کا بلب فیل ہو گیا۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ دادی نے سوچا کہ وہ اٹھ کر موسم بٹیاں روشن کر دیں، اس سے پہلے کہ وہ اپنی سوچ پر عمل پیرا ہوتیں، بہو بیگم کی کاہلی آواز ان کی سماعتوں میں اترتی۔

”اماں۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ بچی کو دیکھیں کیا ہو گیا ہے۔“ اور انہوں نے دیکھا۔ لمبے بھر کو تو وہ بھی گھبرا گئیں۔ لیکن فوراً ہی خود پر قابو پایا۔ مشعال اپنی گہری سیاہ بے تمام چمکی آنکھیں کھول کر یہاں وہاں دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا تھا اور اس

اندھیرے میں دو ستاروں سے چمکتے نین نے ان کی چند لمحوں کے لیے خوفزدہ ہی کر دیا تھا۔ بھلا آئی سے پہلے کبھی ایسا ہوا ہوتا تو ان کے دل کو بھی ڈھارس ہوتی۔ روشن میں بھی یہ خاصیت تھی لیکن اتنی نہیں۔

خیر دادی نے اسی وقت اس کا نام مشعال رکھا۔ روشن کی روشنی مشعال کے آتے ہی پھس ہو گئی۔ اب وہ ہر جگہ لائٹن جیسی آنکھیں لے کر گھومتی۔ لوگ رک رک کر ان غیر معمولی حسین آنکھوں کو دیکھتے۔ حیران ہوتے۔ کچھ ماشاء اللہ کہتے، کچھ نہ کہتے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں درد ہو جاتا، کبھی اچانک ہی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ دادی جب تک زندہ رہیں بلا ناغہ اس کی نظر اتارتی رہیں۔

ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کی آنکھوں نے بھی چمکنا کم کر دیا۔ اب نظر بھی کم ہی ملتی تھی۔ مگر بہر حال وہ آج بھی روشن کی آنکھوں سے کئی گنا حسین آنکھیں لے کر گھوما کرتی۔

شروع شروع میں تو روشن جل بھن کر کباب بن جاتا لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا۔ ان کے سر میں ڈوبتا گیا۔ وہ اسے دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔ مشعال کو دیکھنا اس کا حق بھی تھا۔ وہ اس کے اٹکوتے چاچو کی اٹکوتی بیٹی تھی۔ پہلا حق روشن کا تھا۔ آخر گھر کا بچہ تھا۔ گھر کا بچہ ایسے حقوق کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی تیز تھا۔ دل ہی دل میں سب طے کر لیا۔ حساب کتاب بھی کر لیا۔ اتنی عمر میں مستثنی ہوگی، پھر نکاح، پھر شادی۔ شادی میں فلاں فلاں مہمان آئیں گے۔ وہ اپنا کمرہ ایسے سجائے گا، ویسے سجائے گا۔ یہ کرے گا، وہ کرے گا۔ ہاں سب کچھ کرے گا۔ بس مشعال سے نہیں پوچھے گا کہ آیا وہ بھی اس ساری پلاننگ میں شامل ہونے کی خواہشمند ہے یا نہیں۔

مشعال اس کے چاچا جی کی بیٹی تھی لیکن اس کی شخصیت کا ایک رعب تھا جو روشن کو ڈاڑھ لیکٹ کچھ بھی کہنے سے روکتا۔

کئی بار اس نے دانستہ ایسی حرکت کی کہ وہ سب کچھ نہ سکی تھوڑا بہت ہی اس کے جذبات سمجھ جائے۔ لیکن اس

دیکھا، پھر اس کی ٹانگوں کو اور پھر جو ہنسا شروع ہوئی۔ وہ چھت پر بھاگ گیا لیکن اس کے تھکے روشن کے کانوں کے پردے پھاڑتے رہے۔

وہ بے حد افسردہ تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ مشعال پورے گھر کی لڑلی تھی۔ لڑائی تو وہ بھی تھا لیکن جو اہمیت مشعال کی تھی وہ کسی کی نہیں تھی۔ اسے مشعال کی اہمیت نہیں پوری کی پوری مشعال چاہیے تھی۔ اس کے دل میں دوسرے آنے لگے۔ وہ دوڑ کر ماں کے پاس گیا۔

”کیا چاہنے سے کام کرنے کی اجازت دے دی؟“ وہ جواب جانتا تھا پھر بھی سوال کر بیٹھا۔ امینہ نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔

”کیا اسے اجازت نہیں دینا چاہیے تھی؟“ وہ تہہ کیے ہوئے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی۔ بیٹے کی بے قراری نے انہیں سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ آخر اسے مشعال کے آفس جانے سے کیا مسئلہ؟

”نہیں۔“ اس نے قلعیت سے کہا۔

”کیوں؟“ ان کے بھی ابرو تن گئے۔

”کیا چچا چچی یہ بات نہیں جانتے کہ وہ سکتی

حسین ہے اور اس کی آنکھیں۔ کوئی اس پر عاشق ہو گیا تو؟“ وہ بے اختیار میں بول اٹھا پھر فوراً ہی

ٹکا ہوا جھکا لیں۔ امینہ نے حیران ہو کر اپنے بیٹے کو

دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑا بڑا ”میں عاشق آوارہ“

لکھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس یادیدہ رقیب سے جلن

کی سرخی بھی گالوں پر تیر رہی تھی۔ ان کا دل چاہا وہ

اپنے اس معصوم سے بیٹے کا منہ چوم لیں۔ لیکن وہ بھی

اسی کی اماں تھیں اور مشعال کی چچی۔ دل پر قابو پایا۔

”کوئی اس پر عاشق ہو کر جاؤ چوچلوں سے

اسے بیاہ کر لے جائے۔ اس سے اچھی بات اور کیا

ہوگی بھلا؟ دیے بھی وہ اس قابل ہے کہ.....“ اس

سے زیادہ وہ سن نہ سکا۔ تیزی سے کمرے سے نکل

گیا۔ امینہ مسکرائی رہ گئیں۔

☆☆☆

دن بھی نکالی تھی۔ وہ کوئی بھری اندھی نہیں تھی لیکن اب روشن کو لگنے لگا تھا کہ یہ تینوں خصوصیات اس میں اس حد تک پیدا ہو جاتی ہیں جب وہ جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں میں محبت بھر کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ اب بے شکور تھا کہ وہ دانستہ ایسا کرتی ہے یا غیر دانستہ۔ بہر حال جو بھی تھا۔ اسے اس بات کا پکا یقین تھا کہ مشعال صرف روشن کی ہے اور یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں میں مشعال کی آنکھوں سے بھی زیادہ چمک بھر جاتی۔ آسمان کے مارے ستارے جلنے بجھنے لگتے اور وہ محبت کے پانیوں میں چھٹی چھٹی کرنا ہنسا رہتا۔

☆☆☆

اس کے ہنسنے کے دن بھی شاید گئے چنے ہی تھے۔ ایک دن مشعال نے کھانے کی میز پر اس کی ہاتھوں میں بم پھوڑا۔

”ابا۔ میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔“ روشن کے

منہ میں نوالہ پھنس گیا۔ روشن کی اماں امینہ نے اس کی

کمر سہلانے کے بہانے زور زور سے دو چار دھمکو کے

چر دیے۔ سب یہی سمجھے کہ نوالہ پھنس گیا ہے، امینہ سمجھ

گئی کہ اسے نوالہ نہیں مشعال کی بات پھنسی ہے۔

”ارے واہ۔ بڑی جلدی خیال آ گیا میری بیٹی

کو۔“ میں نے تو سوچا تھا کہ رزلٹ والے دن ہی تم

مجھ سے یہ فرمائش کرو گی لیکن تم نے تو پورا ہفتہ گزار

لیا۔“ وہ شرارت سے بولے۔

روشن کی روشنی بجھ گئی۔ یہ کیا؟ ایک اس کا ہی

گھر ساری دنیا سے نرالا ہونا تھا؟ کیا چچا جان جانتے

تھیں کہ یہ دنیا کتنی بڑی ہے اور آفس کے لوگ تو سب

سے بڑے۔ اسے اب کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دونوں

بچوں کی بات درمیان میں ہی رو گئی۔ امینہ زبردستی

چلو رہی تھیں شاید۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہوا اور پھر ڈھنکی

آواز آئی۔ کرسی پیچھے مڑی۔ وہ پیچھے، ٹانگیں اوپر۔ اور

اس کوئی بھری اندھی کی ساری حیات یکے بعد

دوسرے ہانکا شروع ہو گئیں۔ اس نے پہلے روشن کو

مج بڑی حسین تھی۔ لیکن روشن کا سوڈ سخت آف تھا۔ مشعال نے جس آفس کو جوائن کیا تھا وہ روشن کے رشتے میں ہی پڑتا تھا تو اس کے باوجود نے ایک ایڈ ذراپ کی ذمہ داری اس کے سنبھالنے کے لئے قبول کر لی۔ مشعال خوش تھی کہ وہ آسانی سے نہ صرف آجائے کی بلکہ بس میں سفر کرنے سے جو وقت بڑھتا ہو وہ بھی بچا جائے گا۔

مشعال چار سو روپے کی تنخواہ پر آئی۔ سیارنگ کا کرن اس کی زندگی پر خوش رہا تھا۔ پہلی ہی سرفی، سکا اور گالوں پر پچھڑی کا پیش۔ دو تہی جان سے جل گیا۔ مشعال نے اپنے ہاتھوں سے تو کیا زبردستی سے بھی دوڑ جاتی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ سے ہاتھ ملنے لیا۔

”تم بڑھ کر کے آ جاؤ۔ میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”ایف۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ روشن جھپٹے کچھ دن سے زیادہ ہی خاموش رہنے لگا ہے؟“ یہ سرت تھیں۔ اس کی کھانے میں عدم دلچسپی کو تو وہ جھپٹے تھی دن سے محسوس کر رہی تھیں۔ اب بات بھی تب کرتا جب پوچھنا گزیر ہو جاتا۔ مشعال کی موجودگی کی وجہ سے وہ خاموش ہو گئیں۔

وہ بھی بیٹے کی بے سکونی محسوس کر رہی تھیں لیکن ظاہر ہے وہ اس کے خدشے کے پیش نظر اب مشعال کو گھر میں بند رہنے کا تو نہیں کہہ سکتی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ سرت سے اس مسئلے کو ڈسکس کریں گی لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئیں۔ کیا خبر وہ اس کی ضرورت سے زیادہ حساسیت کو شکلی غفلت نہ سمجھتی تھیں۔

وہ سوچتی تھیں کہ اب جلد ہی وہ ان سے مشعال اور روشن کے رشتے کی بات کریں گی۔ یہی بہترین حل تھا۔

☆☆☆

”تمہیں پتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے باس بالکل بچک ہیں۔ ان کی عمر یا مشکل ہی انیس تیس سال ہوگی۔ آفس کی ساری لڑکیاں ان کی وجاہت کے قسے سناتی رہتی ہیں۔“ وہ آفس کریم کھاتے ہوئے استیقامت سے بتاتے گی۔ وہ جو اس بات پر خوش تھا کہ وہ

اور مشعال کچھ دیر سکون سے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہیں گے تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ وہ اس کے ساتھ زبردستی کی تروی گولی رکھ چکی تھی اور اب اس کے خلاف اپنے اندر اظہار رہا تھا۔ آفس جاتے ہی اسے ہر جگہ وجاہت دکھائی دینے لگی تھی، سنائی بھی دے رہی تھی۔ ایک ہی سامنے کی چیز تھا جو نہ کھاتا نہ سنا کرتا۔

”تو اس میں اتنی حسرت کی کیا بات سن رہے ہیں؟“ یہ تمہارے ستر سالہ باس کس سے غیبی کے ہو گئے؟“ ایک تو یہ بالائے لوگ محسوس ہوتا تھا ہمیشہ ہی یاد رکھتے ہیں۔ روشن نے آفس کریم کا بھر کر منہ میں ڈالا۔

”وہ مجھے نہیں علم تھا کہ تم اسے جھپٹے ہو سکتے ہو۔ مگر جوان باس کی اتنی ہی خواہش ہے۔ میرا آفس جوائن کر لو، لیکن جھوٹ تو نہ بولو۔“ وہ روشن پر امنہ بنا کر جوان باس یوں کہنے لگی جیسے وہ جوان باس نہیں بیوی کی خواہش رکھتا ہو۔ ویسے اس کا آفس پر انہیں تھا۔ روشن کے دماغ میں ایک دم ٹپک بول۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ وہاں تو انہیں بھی زیادہ پتا ہے اور جوان لوگ بڑے آرام سے غی چیزیں قبول کر لیتے ہیں جبکہ یہ بڑھے ٹھڈے تو تو بہ تو یہ۔“ سفید چہرہ بالوں اور چڑچڑے مزاج والے باس کی شکل یاد آئی۔ یہی اس کا منہ بن گیا۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی تھیں کہ کاش۔ کاش مشعال کے آفس میں موجود سارا اٹل انتہائی بد صورت ہو یا کم از کم باس ہی ہو کہ وہ ہفتے بھر میں آفس سے بھاگ جائے۔ اس دعا میں الٹ گئی تھیں۔ ایک سے ایک ہندسہ لڑکائی سے ایک حسین لڑکی وہاں موجود تھی۔ اس کا دل نہ ڈھٹا تو وہ عنقریب خود ہی ڈوب جاتا۔

”ٹھیک ہے تم مجھے سی دی دے دینا۔ ویسے آج کل کچھ سٹش خالی ہیں۔ امید ہے تمہیں وہاں جاب مل جائے گی۔“ وہ مسکرا کر خوش دلی سے کہہ رہی تھی۔ وہ ان آنکھوں میں ڈوب سا گیا۔ لیکن بس کچھ

مشعال نے مشکل سے گھومتے سر کو اٹھایا۔

سامنے ایک لمبا ترنگ سفید شرٹ میں لمبوس کوئی آسمانی دیوتا کھڑا تھا۔ لیکن مشعال کو وہ کیونکہ کر دیوتا دکھائی دے سکتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اس سے ٹکرائی تھی اور وہ پتھر کی چیز کچھ اور نہیں وہ خود تھا۔ اس کا منہ اور اس کی ناک۔ دونوں ہی اس کی شرٹ پر لگے عجیب وہ غریب قسم کے پتھر سے ٹکرائے۔ چونکہ وہ تیزی سے باہر نکل رہی تھی اس لیے ٹکرائے زوردار ہوئی۔ ناک پر لگنے والی ضرب سے اس کی نکسیر پھر سے پھوٹ گئی۔ وہ ناک پر ہاتھ رکھے نیچے جھکی تھی۔ اس کی کولیک دوڑ کر اس کے پاس آئی۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“ جب کہ وہ اس نووارد کو دیکھ رہی تھی۔

”دکھائی نہیں دیتا آپ کو؟ مانا کہ قد کاٹھ اور جتنے سے آپ سائے لگتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر آتے جاتے کو ٹکرائے مارتے پھریں۔“ وہ غصے سے دھاڑی۔ پھلتے پانی نے ان سیاہ آنکھوں کی چمک میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ وہ ہکا بکا سا کھڑا اس کی زبان کے جوہر سے آشنا ہو رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ نہیں پائی کہ آیا سب ایک دم خاموش کیوں ہو گئے ہیں اور کوئی اس سائے کو کچھ سنا کیوں نہیں رہا۔ وہ غصے سے روشن کو دیکھتی خون آلود ناک پر نشور مٹی باہر نکل گئی۔

وہ اس بات پر غصہ بھی کہ روشن کیوں اس کی مدد کو نہ آیا۔ وہ کیا بتاتا کہ وہ خود اس وقت حاجت مند تھا۔

☆☆☆

اس کے تمام شکوک درست ثابت ہونے لگے۔ وہ زعیم حیدر۔ وہ بھی مشعال کی آنکھوں کا دیوانہ ہو گیا۔ پورے آفس میں چہ گولیاں ہونے لگیں۔ اس شام تو وہ غصے میں گھر چلی گئی۔ اس نے روشن کے آنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ لیکن رات ہوتے ہی وہ چھت پر آئی اور اسے خوب باتیں سنائیں۔ ”کیسے مزن ہو تم؟ ایک آدمی نے ٹکرائے میری ناک توڑ دی، میرا اتنا خون بہا اور تم بت بنے کھڑے رہے؟ کل کو کوئی اور مسئلہ ہوا تب بھی تم

پھنڈے کے لیے۔ کیا کام کا آئیڈیا تھا۔ وہ اس کا آفس نہ صرف جوتن کر چکا تھا بلکہ اب خوش بھی رہنے لگا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی ہوئی۔ اپنے کام میں مصروف، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ۔ وہ خوش اخلاق تھی لیکن سب کو ایک حد میں رکھتی تھی۔ اس کے سارے خدشات دم توڑنے لگے۔ لیکن یہ تو ابھی صرف شروعات تھی۔

ان دونوں کا مشترکہ پاس، جس کی وجاہت کے چہرے وہ بھی سن چکا تھا لیکن دونوں ہی اس کے دیدار سے خروم تھے۔ اس وجاہت کے نمونے کی آمد ہونے ہی والی تھی۔

☆☆☆

وہ سب کے سب میٹنگ روم میں تھے۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد وہ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ روشن نے دیکھا، مشعال اسے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ فوراً اس کے پاس آیا۔ ”کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ تشویش سے پوچھنے لگا۔

”ہاں۔ آج گرمی بہت زیادہ ہے تا تو صبح میری نکسیر پھوٹ گئی۔ اور جلدی جلدی کے چکر میں ہاتھ روم کے دروازے سے بھی ٹکرائی۔ اب سر میں پھر سے درد شروع ہو گیا ہے۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔“ وہ اس کا اترا چہرہ دیکھ کر فکر مند ہو چکا تھا۔ دونوں کا آنا جانا بھی ساتھ تھا۔ مشعال نے اس کی بات کے جواب میں لپٹا پس اٹھایا۔ بھی امداد نے روشن کو آواز دے دی۔

”تم باہر جاؤ میں آتا ہوں۔“ وہ اس کی بات سن کر اٹھی اور ابھی اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اسے بھی امداد نے پکارا۔ وہ اسے کوئی لطیفہ سن رہا تھا۔ اچھوتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھے بغیر باہر نکلنے لگی کسا سے لگا کہ وہ کسی پتھر کی چیز سے ٹکرائی ہے۔ سہانہ جی اس کے منہ سے نکلی۔ سب ہی اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

شاید یہی سب کرو گے۔“ مشعال شدید بدگمان تھی۔
وہ چپ رہا۔ وہ سوچتی یہ جادو جاسکھتا ہے؟
اگلے دن اسے علم ہوا کہ جس شخص سے وہ ٹکرائی
تھی، وہ کوئی اور نہیں بلکہ زعیم حیدر تھا۔
اسے زعیم نے اپنے آفس میں طلب کیا۔ لیکن
بالکل نہ ڈانٹا نہ ہی اسے گزشتہ شام کی کوئی بات یاد
دلائی۔ بس اس کی آنکھوں میں دیکھا رہا۔
مشعال کی روشن آنکھوں کی چمک مامی پڑ
گئی۔ وہاں ہر اس جھل گیا۔

پھر اکثر ہی وہ اسے یہاں یہاں سے آفس
بلا تا۔ وہ روشن کی جانب عجیب سی نظروں سے
دیکھتی۔ وہ تو یوں مین گرا تھا جیسے اندھا ہو۔ جیسے وہاں
مشعال کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوئے وہ جانتا بھی نہ ہو۔
مشعال اس کے رویے سے الجھنے لگی تھی۔
اب وہ بھلا اس کا دماغ بڑھ سکتی تو اسے علم ہوتا
کہ اس میں اتنا بھروسا بھرا ہے کہ بڑے آرام سے
اس میں آگ لگائی جاسکتی ہے۔ اس کا دماغ خود ہی
کہانیاں گھڑتا ہے اور خود ہی انجام بھی بنتا ہے۔
اس کے گمان کے مطابق مشعال کو بھی اپنے
لیے کوئی ایسا ہی حسین، وجیہہ اور شان دار مرد ہی
درکار ہوگا۔ اب جب کہ وہ مرد دروازے سے باہر آچکا
تھا اور بے دھڑک اپنی آنکھوں سے سالے جذبات
کہنے بھی لگا تھا تو اسے اپنی محبت کو چھپا کر مزید ذلت
سے بچتا ہی بہتر راستہ لگا۔
جبکہ مشعال۔ وہ کیا سوچتی تھی۔

ہم ہم

زعیم بالکل ویسا ہی تو تھا جس کے سبب وہ کبھی
خوابوں میں اذان بھرا کرتی تھی۔ لیکن نجانے کیوں
اسے دیکھ کر بھی اس کے دل کی کلی نہ کل سکی۔
وہ جب غصے میں اس سے لڑ جھڑ کر اپنے
کمرے میں آئی اور بستر پر لیٹی تب چمن سے زعیم کی
تصویر اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔

وہ ان آنکھوں میں ابھرتی حیرت، پھر شدید
پسندیدگی کو لمحے بھر میں محسوس کر چکی تھی۔ اسے

ٹکرانے پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا اس کے گھر میں
آیا۔ وہ اس کی آنکھوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی
چھین کر ساتھ ہی لے جائے گا۔
اگلے روز اسے علم ہوا کہ وہ اس کا پاس بند
چلو جی۔ ایک خوبصورت ٹڈل کلاس لڑکی اور ایک
وجیہہ امیر کبیر لڑکا۔ زبردست قسم کا کرا اور پسندیدگی
کا سفر شروع۔ سب کچھ کتنا مکمل تھا نا۔ لیکن پھر بھی
کچھ سنگ تھا۔

وہ آئے دن سوچتی۔

”زعیم کتنا خوب صورت ہے۔“

”یہ روشن کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ زیادتی

خاموش رہنے لگا ہے۔ میں نے شاید زیادتی
بدتمیزی کر دی۔ صبح ہوتے ہی اس سے سوری کر لیں
گی۔“ وہ پرسکون ہوئی۔ سوری بھی کہہ دیا لیکن
دیے کا دیسا رہا۔ جسے چلتے دیے کو کوئی پھونک مار کر بچو
دے۔ لیکن دھواں تو نکس نکس تھا۔ ہاں شاید اس دے
تیل ختم ہو گیا ہوگا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔ بھی زعیم کی
نگاہ بھی اس پر پڑی۔ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ
لگا۔ مشعال کی مسکراہٹ سٹ گئی۔

”دیکھتا تو روشن بھی ہے لیکن۔ لیکن کبھی
میری مسکراہٹ اسے دیکھ کر کسمٹی کیوں نکسے؟ بلکہ اس
وقت تو ہونٹ مزید پھیل پھیل جاتے تھے۔ کتنی مشکل
سے خود کو کنٹرول کرتی تھی۔“ وہ پھر سے
جانی۔ مسکرا دیتی۔ وہ سمجھتا کہ زعیم کا دیکھنا اس کے
لیے سکون آور و وائین رہا ہے۔ وہ نکس جانتا تھا کہ اس
کی دوا تو روشن تھا۔ چمکتے ستارے جیسا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایمین اسے رہنما
کہتے تھے کہ وہ ہاں کرے اور وہ اس کا رشتہ لے کر
جائیں لیکن وہ ہر بار ٹال دیتا۔ اس کے کانوں میں
یہ اب یہ آواز گونجنے لگی تھی کہ عتریب زعیم مصطفیٰ
پر پولوز کر دے گا۔ یہ خبر سن کر اسے اپنے وجود سے
جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

جبکہ دوسری طرف مشعال کے لیے آفس میں
رہتا مشکل ہونے لگا۔ اسے روزہ کرنا پڑا۔

”بکواس مت کرو۔“ وہ یک دم پھر کر بولی۔
اس قدر شدید رد عمل دیکھ کر وہ ذرا پشیمان ہوا۔
”میں نے بہت بڑی غلطی کر دی۔ مجھے ان
سے یہ انگٹھی نہیں لینی چاہیے تھی۔“ مشعال رو ہانسی
ہو کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ روشن نے حیران ہو کر اس کی
انگلی کی طرف دیکھا جہاں اس کی امی کی دی گئی انگٹھی
جگمگا رہی تھی۔ مشعال کو گزشتہ رات کی بات یاد آئی۔
جب امینہ بیگم اس کے پاس آئی تھیں۔ اپنے
بیٹے کے دل کا حال سناتے ہوئے وہ مشعال کے
چہرے کے بدلتے تنگ دیمچتی رہیں۔ جس پر پہلے تو
حیرت پھیلی اور پھر وہ پرسکون ہو گئی۔ حقیقتاً وہ اس
سے اجازت مانگنے آئی تھیں۔ پس پردہ اس بات کی
تصدیق کہ وہ بھی ان کے بیٹے سے محبت کرتی ہے۔
اس نے بنا سوچے سمجھے انہیں ہاں کہہ دی۔ وہ
اتنی خوش ہوئیں کہ اپنے ہاتھ سے انگٹھی اتار کر اسے
پہنا دی۔ مشعال کا وجود ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔

”یہ سب کیا تھا مشعال؟“ وہ حیران تھا۔ اتنا
حیران کہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔
”یہ میری بے وقوفی تھی۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔
وہ اس کی ”بے وقوفی“ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔
اس سے پہلے وہ کچھ کہتا وہ تیزی سے باہر نکلی۔ روشن
اس کے پیچھے بھاگا اور راہ میں ہی روک لیا۔

مشعال کی آنکھ سے گرنا آنسو اس نے سرعت سے
صاف کیا اور ایک دم ہی اس کی انگلی سے انگٹھی نکالی۔

”میں چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر تم یہ بے وقوفی
کرو اور مجھے اپنا محبوب اور ہونے والا شوہر قبول
کرو۔“ روشن نے مسکراتے ہوئے اس کی نازک انگلی
میں انگٹھی پہنائی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دی۔
روشن کے چہرے کے سارے رنگ واپس
لوٹ آئے تھے۔ وہ سر اٹھائے سامنے دیکھتے ہوئے
اس کا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ مسکرا دی۔
ان دونوں کو ایک ساتھ چمکنا تھا۔

☆

تھا وہ عجیب سا ہو چکا تھا، کم صبر رہتا۔ مشعال اسے
دیکھتی تو خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا۔ وہ سمجھنے
کے بجائے جھنجھلا جاتی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ زعمیم کے بڑھتے اتفاقات
سے پریشان روشن کے کسی رد عمل کے انتظار میں تھی
لیکن وہ دیکھ کر بھی ان دیکھا کر رہا تھا۔ کیوں؟ کیا
اس کی غیرت سوچکی ہے یا پھر وہ بے حس ہو چکا ہے؟
مشعال کی سوچیں الجھتی چلی جا رہی تھیں۔

ایک روز زعمیم نے اسے اپنے آفس میں بلایا
اور بے حد خوب صورت لفظوں میں اس سے اظہار
محبت کرنے لگا۔ مشعال کے چودہ طبق روشن
ہو گئے۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ وہ
بے قراری سے ہاتھ میں پہنی سوئے کی انگٹھی کو
گھماتے، جواب سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھول کر
ایک بے حد حسین لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے
ہی زعمیم ایک دم ہی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مشعال
بھی کھڑی ہو گئی۔

اب وہ دونوں گال سے گال رگڑ کر مل رہے
تھے۔ مشعال کی نظریں جھک گئیں۔ اس لڑکی نے
ایک اور بے باق حرکت کی۔ شاید ہی وہ اندر کہیں اس
کے حسن سے خائف ہو گئی تھی۔ اسی لیے جتائے بغیر
بے درہمکی۔ مشعال کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ
تھی۔ زعمیم جل سا ہو گیا۔

وہ ان سے اجازت لے کر باہر آئی تو سامنے
ان ہی روشن موجود تھا۔ آنکھوں میں غصہ اور تھوڑا تھوڑا
ساتھ لے۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ وہ حیران سی اسے دیکھتے
ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”مجھے تو نہیں البتہ تمہیں ضرور گہرا صدمہ ہوا ہوگا،
ان کی گرل فرینڈ کو دیکھ کر۔“ وہ بولا تو لہجہ میں جلن تھی۔
”مجھے کیوں ہوگا صدمہ؟ میں انہیں پسند نہیں
کرتی۔“ اس نے سادگی سے کہا۔ زعمیم کے اظہار کو
وہ سمجھا نہ تھی۔

”انکو رکھتے ہیں۔“ اس نے پھر چوٹ کی۔

میرا دلیر ساتھ

”حمزہ۔۔۔ ارے او حمزہ!“

شاہانہ خاتون کی پاٹ دار آواز نچلے پورشن کے درود پوار سے نگرانی، گھومتی، چکرائی، اور پر والے پورشن میں موتیوں سے فریم پر لگا کپڑا سجائی نور کے کانوں سے نگرانی۔

اس نے ایک سنہرا سوتی سوتی میں پرو کر کپڑے کے اندر اتار دیا، بالکل ویسے ہی جیسے شاہانہ ٹائی کی کڑوی کسلی باتیں اپنے دل کے اندر اتار لیتی تھی۔
”کیا ہوا دادی؟“

وہ آواز سنائی دی جس کو سننے کے لیے کان سارا دن خنجر رہتے۔ دل ان قدموں کی چاپ کے ساتھ دھڑکتا تھا۔

”ارے یہ شیمو کی ایک بوتل کم ہے۔ میں نے غور کن کر چار بوتلیں رکھی ہیں۔ نیلی والی ایک بوتل کم ہے۔“
”لو جی، آگنی ناتا کی شامت۔“ نور نے دل میں سوچتے ایک اور موتی سوتی میں پرو دیا۔

”دیکھیں دادی! جب جب آپ میری ڈیوٹی لگاتی ہیں، چیزوں پر ہمدہ دینے کی، میں پوری دیانت داری، فرض شناسی اور..... اور.....“
زور ڈالا گیا۔ ”پاں، اور تن دہی سے اپنے فرائض کی انجام دہی کی کوشش کرتا ہوں۔“

نور کے چہرے پر مسکراہٹ رہی تھی۔
”تو یہ بوتل کم سے کم میری موجودگی میں غائب نہیں ہوئی۔“



”اچھا، بات سن۔ مگینہ کا فون آیا تھا، مگر آری ہے پاکستان۔“

نور کے مونی ہاتھ لگتے ہاتھ لگے بھر کور کے۔
”مگینہ.....“ زیر لب دہرایا۔ پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔

”کہہ رہی تھی حنزہ کی پڑھائی بھی اب مکمل ہونے ہی والی ہے۔ بس کوئی دن، تاریخ طے کر کے اس قصے کو بھی منشا دیں۔“

نور کی سوئی کپڑے کی جگہ انگلی میں اتر گئی۔
سی کی آواز کے ساتھ اس نے انگلی پر ابھرتی تضحیٰ کی سرخ بوعد کو دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے دبایا۔

”بھئی، آخر جلدی کس بات کی ہے پھوپھو کو؟ میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔“ حنزہ کی جھنجھلاہٹ بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”ہوتی ہے جلدی لڑکی کی ماں کو۔ تجھے کیا خبر۔ تو بس ذہنی طور پر خود کو تیار رکھ۔ مگینہ کے آنے کے کوئی دس پندرہ دن بعد مگینہ خود بھی آ جائے گی۔ جو کام وقت سے ہو جائے وہی اچھا۔“ وہ دونوں گھٹنوں پر دباؤ ڈالتی اٹھیں۔

نیچے سے آوازیں آتا بند ہو گئی تھیں۔ یہ نور کے اندر کا شور تھا جو بڑھ رہا تھا۔

اس نے زور سے اپنی زخمی انگلی دبائی۔ تکلیف کس چیز کی زیادہ تھی، یہ وہ خود بھی سمجھ نہیں پاتی تھی۔

سہ پہر، کوئی چار، ساڑھے چار کے قریب قریب کا وقت ہوگا۔ سڑکوں پر رش بھی ذرا کم ہو گیا تھا، لوگوں کا بھی، گاڑیوں کا بھی۔
یہ وقت ہوتا تھا حاکم حسین کی مصروفیت کا۔
”آؤ، آؤ بزرگواؤ بیٹھو۔“

حاکم حسین جیسے ہی رشید امیر ڈریسنگ روم حمام میں داخل ہوئے۔ کرسی پر آؤ اتر چھاؤ کر اور رشید اہلادی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سلامی دینے والے انداز میں ان کا غیر مقدم کیا۔

”ہاں جب، جب میں گھر پر نہیں ہوتا، تب تب کی ذمہ داری میری نہیں ہے۔“

”ارے بھیا! یہ بڑھا تو کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ادھر میں کہیں آگے پیچھے ہوئی نہیں اور اس نے چور بازاری، لوٹ مار کا بازار گرم کیا نہیں۔ اب کیا نہانا، دھونا بھی چھوڑ دے انسان.....؟ ارے باہر کے چور، اچکے ہوں تو انسان رپٹ (رپورٹ) درج کر دے تھانے میں۔ اب گھر کے اندر ہی ڈکیت موجود ہوں تو شریف انسان کیا کرے؟“

حنزہ نے ان کی بات پر کندھے اُچکائے

مطلب مجھے کیا پتا کیا کرے۔

”ساری زندگی گزر گئی میری چوروں، ڈاکوؤں، غاصبوں سے نمٹتے۔ مگر زندگی میں سکون نصیب نہ ہوا۔ یہ بڑھا اور اس کے ہوتے سوتے (اب کے اور والوں کو بھی درمیان میں رگڑا گیا)۔ سب کچھ کھا گئے۔ ارے بھیا، نصیب والے ہوتے ہیں جو جوانی میں عیش کرتے ہیں۔ ہماری تو جوانی بھی جہاد کرتے گزری، بڑھا پانچھی۔“

ابھی الفاظ ان کے منہ میں ہی تھے کہ حنزہ کے لبوں سے ایسی کا فوارہ چھوٹا۔

”دادی جہاد؟ ادھر میرے اللہ..... جہاد.....“ وہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہونے لگا۔

نور کا سوز خواہ مخواہ ہی اچھا ہو گیا۔ موتی، کپڑا فریم، جیسے ہر چیز سے روشنی ہی پھونٹنے لگی۔

”دادی..... اس کا یہ مطلب ہوا آپ جب فوت ہوں گی تو آپ کو شہید کا رتبہ ملے گا؟ اودہ میرے خدا! واقعی جہاد.....“ حنزہ کی آنکھیں تھمنے میں نہیں آ رہی تھیں۔

”بس کر جا، اس پر بہت برداشت کر رہی ہوں تجھے میں۔“ وہ کشمکشیں لگا ہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

”سوری دادی..... سوری۔“ بڑی مشکلوں سے اس نے اپنی ہی کنٹرول کی۔

کے تمام غلبہ، معاملات کی خبریں بیٹوں پر فخر و کبر
 پانچاپا کرنا تھا۔ بیٹوں بیٹہ کروہ ہر قسم کا لالچ لٹے
 کرتے تھے۔

اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لانے کے لئے
 مزہ اب ماہوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔

مہاں تک پہنچنے کا راستہ بچن سے ہو کر گزرنا
 تھا۔ وہ بچن اور باغ کے درمیانی دروازے تک پہنچا
 ہی تھا کہ نگ کی آواز سنائی دی۔

اس نے پاٹ کر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ
 سے ٹکرا کر پیچ کر گیا تھا۔ ساتھ ہی آواز سنائی دی۔

”مزہ بھائی! پندرہ سالہ بیٹا کیلری سے آ رہا
 دھڑ باہر کو لٹکائے باغ میں جھانک رہا تھا۔

مزہ واپس آ گیا۔
 ”مزہ بھائی کے بیٹے، کب سے تھے آواز

لگا رہا ہوں۔ کنکر بھی پھینکے، کدھر تھا؟“ سخت ناراض
 لہجہ میں استفسار کیا۔

”بس مزہ بھائی اکھانا ایسا مزے دار تھا
 کھا کر ایسے کدھے کھوڑے بچ کر سویا کہ کچھ ہوش

رہا۔“ آواز میں ابھی بھی خند کا غلبہ تھا۔
 ”تو کھوڑے کدھے بلکہ میرا تو خیال ہے

ابیل بچ کر سویا تھا۔“ بیٹا کھی کھی کرنے لگا۔
 ”دوہار میں کیا کھایا آپ نے؟“ کچھ خیال

آیا تو پوچھا۔
 ”دو بھجوریں اور دادی کے کاجے چھانی کر دیے

والے ملنے۔“
 بیٹھنے دو بارہ ہنسنا شروع کر دیا۔ ”مطلب

ہیٹ تو خوب اچھی طرح بھر گیا ہوگا۔“
 ”اے ہیٹ میں کب سے چوہوں نے اچھلنے

پھیلایا ہوا ہے۔ کچھ کھانے کو ہے تو دے۔“
 ”بڑا کچھ ہے۔ آپ بیٹریوں پر آئیں، میں

لے کر آتا ہوں۔“
 اوپر بیٹھنے کے دونوں پر ہنسنا کا ہرونی منہ

مشترک تھا جہاں سے اندر داخل ہوتے ہی انہیں

”یہ لو بھئی، یہ رکھ لو۔ کبھی کبھی کاکوں کو اعلیٰ
 چائے بھی پادیا کرتا۔“

گاسے نے پتی کا ڈاھا پکڑا، سپدھا ہاتھ ماتھے
 تک لے جا کر سیوٹ والے انداز میں شکر یہ ادا کیا۔

باہر نکلنے لگے تو چھوٹا کچھ مائیکروسی لگا ہوں سے
 دیکھنا محسوس ہوا۔

انہوں نے ایک بار پھر قبیلے کے اندر ہاتھ
 دے دیا۔ اب کے ایک چھوٹا میوے کا پیٹک برآمد کیا

اور اس کی طرف بڑھایا۔
 ”یہ لو بھئی، کچھ جان شان ہٹاؤ، کمزور دکھ رہے ہو۔“

چھوٹے نے دانت لٹکاتے ہوئے ایکٹ
 وصول کیا۔

باہر نکل کر حاکم حسین نے اپنا سواری تھیلا
 جہاز کر کے کیا اور تھیس کی دائیں ہاتھ کی جیب میں

ڈال لیا۔
 ابھی تو موچی کے پاس جانا باقی تھا، پر تھیلا

خالی ہو چکا تھا سو ارادہ ملتوی کر کے کمر کی راہ لی۔
 ”پہنی واقعی نقصان میں جا رہی تھی، ہا۔۔۔۔۔۔“

ایک ٹھنڈی سانس ان کے حلق سے خارج ہوئی۔
 ☆ ☆ ☆

”بیٹا اشی شے..... چہ چہ..... او او او.....“
 کئی دیر سے وہ منہ سے مختلف قسم کی آوازیں

نکال رہا تھا مگر جواب نادرہ۔ دو تین کنکر بھی مارے
 جو گرل سے ٹکرا کر نگ کی آواز پیدا کرتے اوپر کی

کیلری میں کہیں کم ہو گئے۔
 یہ ان کے بڑے سے وسیع وعریض کمر کا پھیلا

حصہ تھا۔ چوڑا سا کیلری نما حصہ جو کسی عام سے
 چھوٹے کمر کے بڑے سے صحن جیسا تھا۔ یہ حصہ

مکلوں کی موجودگی سے باغ کہا جاتا تھا اور نہ اس میں
 باغ والی اور کوئی خاصیت موجود تھی۔

اس کے اوپر، اوپر والوں کی ہانگنی تھی۔ جو قدرے
 کمپنڈی تھی کس باغ کا آدھا حصہ کھلا ہوا تھا۔
 یہ جگہ مزہ اور بیٹا کی غلبہ میں ایک ایسی جگہ تھی، اوپر

”تو پھر کیسی بات ہے۔ ہاں۔“ حمزہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”اگر جو میں اتنا بھوکا نہ ہوتا ناں جتنا کہ اس وقت ہوں تو یہ کھانا تیرے منہ پر واپس مارتا۔“

انتہائی جلال کے عالم میں حمزہ نے ٹرانزل کھانا شروع کیا۔ ”اور تو میرے جعفر کے جانشین! اب بتا رہا ہے مجھے بات پکی ہونے کے بعد۔“

”نہیں نہیں حمزہ بھائی! پلیز ناراض نہ ہوں۔ مجھے تو خود آج پتا چلا ہے جب بیلا آئی نے آیا کہ ہاتھ پر پانچ ہزار کا نوٹ رکھ کر انہیں اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا، تب۔“

”تب.....“ حمزہ نے منہ ہکا بکا کر اس کی نقل اتاری۔ ”اگر وہ تیرے ہاتھ پر پانچ ہزار رکھ کر، تجھے پیار کرتیں تو مطلب تیرا رشتہ پکا ہو جاتا؟“ سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑتے اور چمچہ منہ میں ڈالتے سوال کیا۔

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

ہاتھ میں لے کر لے جاتی تھیں اور سامنے بے حد کھلا ہوا کھنڈ تھا۔ کھنڈ کے آخری کنارے پر کھنڈ اور کھنڈ کے پھوڑے باغ۔ میٹھیوں کے نیچے ہاتھ روم تھا ہر لائن سے بنے چار بڑے بڑے کشادہ کمرے۔

حمزہ اور نیچو کی گفتگو بھلے ہی باغ میں ہوتی ہو، چروں کا تبادلہ میٹھیوں ہی کے راستے ممکن تھا۔ نیچو جب بڑے اٹھا کر میٹھیاں اترتا تو حمزہ اس کے استقبال کو پہلے سے وہاں موجود تھا۔

نیچو نے ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا، بریانی کے ساتھ کباب، سلاد، راستہ سب کچھ موجود تھا اور تھا بھی دایرہ قرار میں۔ حمزہ کا جی خوش ہو گیا۔

”ارے واہ..... کسی کی دعوت تھی کیا؟“

”آ کر بیٹا ہوں۔“ وہ واپس بھاگا۔

”کہاں جا رہا ہے؟“ حمزہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔

”میٹھا لینے۔“ وہ کہہ کر دو دو میٹھیاں پھلاتا تھا اور چلا گیا۔ یعنی واقعی دعوت تھی۔

حمزہ آخری میٹھی پر بیٹھ کر بریانی کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔

نیچو نے کالج کا ایک باؤل اس کے سامنے کیا جس میں جلی اور کیک سے سجائے ٹرانزل موجود تھا۔

”ہاں، اب بتا۔ یہ اتنا اہتمام کس سلسلے میں؟“ اس نے چاول اور بوٹی سے بھر ایک چمچہ منہ میں منتقل کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ آپا کے سسرال والے آئے ہوئے ہیں۔ بات کتنا ہوگئی ہے ان کی، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے یہ۔“ اطلاع فراہم کی۔

یونی اور چاول حمزہ کے حلق میں پھنس گئے۔ آٹھویں اٹل کر باہر کو نکل آئیں۔

”اوسے گو لے، تو مجھے اپنی آپا کا رشتہ پکا ہونے کی ٹریٹ دے رہا ہے۔“ ہامشکل چاول حلق سے نیچا ہمارے۔

نیچو نے میٹھیوں میں حمزہ بھائی! ایسی بات نہیں ہے۔“

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

حلمن

قیمت - 300 روپے



نادرہ خاتون

نکاح کا کہ

بکھرے عرصہ (11 اگست: 37) - 1111/1111/1111 - فون نمبر 37720021

نے آپ کو یہ سارا کرنے کے بعد، ابو سے کہا تھا۔ ”بھائی! آج سے آپ کی نور میری ہوئی اور چوہدری محمد ابرار آپ کا ہوا۔“

”چوہدری محمد ابرار۔“ دانت پیس کر یام لیا۔
یوں لگ رہا تھا جیسے بوٹی کے ساتھ چوہدری کی گردن پیار ہا ہو۔

”کھانا کھا کر برتن سائیڈ پر رکھے اور ٹیپو کی طرف متوجہ ہوا۔“

”اچھا تو مجھے یہ بتا، دیکھنے میں کیسا لگتا ہے یہ چوہدری محمد ابرار۔“ حلق تک کڑوا ہو گیا، رقیب روسیہ کا نام لیتے ہوئے۔

”ویسے ہی لگتے ہیں جیسے ہیں۔“
”چہ۔۔۔۔۔۔“ حمزہ کے منہ کا ذائقہ خراب ہوا۔

”بھئی، وہی تو پوچھ رہا ہوں کیسے ہیں؟“
”خوب مونے تازے۔“ ٹیپو نے دونوں ہاتھ پھیلا کر ختم ظاہر کیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔ مطلب گینڈے جیسا دکھتا ہوگا۔“
”نہیں، بھینسے جیسے دکھتے ہیں۔ اصل میں کالے بھی ہیں نا۔“

”دیری گڈ۔“ حمزہ کی تھوڑی بہت تسل ہوئی۔
”تعلیم؟“

”واجبی۔“ ٹیپو نے فوراً جواب دیا۔
”اوہ۔۔۔۔۔۔ دیری دیری گڈ۔“ حمزہ کے سینے سے سکون کی سانس خارج ہوئی۔

”دکرتا کیا ہے؟“
”خوب کھاتے ہیں اور ڈکار مارتے ہیں۔“

”اچھا۔ یہ خوبی تو میرے اندر بھی موجود ہے۔“
”لیکن آپ نے رشتہ نہیں بھجوا یا۔“ ٹیپو نے یاد دلایا۔

”رشتہ کیسے بھجواؤں۔ ایک تو ڈگری مکمل نہیں ہے پھر وہ میکانیکی تلواریں لگ رہی ہے سر پر۔“ حمزہ نے افسوس سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”اور میری نانی اور اپنی دادی کو بھول گئے؟“
”ٹیپو نے ایک اور اہم نکتہ یاد دلایا۔“

”انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ اچھا پھوڑ ساری

ہائیں۔ یہ بتا کام دھندلا کر بتا رہا ہے یہ چوہدری۔“
”کام دام، کچھ نہیں کرتے۔ زمین اور پھر گاؤں جا کر سدھر منہ کرو، ان ہی کی زمینیں پھر بھینسوں کا ہاڑہ بھی لانا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔ تو بھینسوں کا ہاڑہ اپنا ہے، جس بھینسے کا۔ ٹھیک ہے پھر تیار ہوں میں۔“ دونوں نے

خشنے کے لیے۔ تو بھی ذرا اپنا دام باغ چالو کر لے۔“
”دونوں۔۔۔۔۔۔ مطلب میری نانی اور اپنی دادی؟“

”نہیں۔“
”چوہدری محمد ابرار اور محترمہ آنسو ہلک چڑ

عرف میکی۔“

ہلے ہلے ہلے

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا، سارے

کمروں کے دروازے بند تھے۔
پھر بھی احتیاطاً انہوں نے محکم پھر کر ہر طرف کا

جائزہ لیا۔ ہاتھ روم خالی تھا۔ برآمدے میں بھی کوئی نہیں تھا، مطلب میدان صاف ہے۔ ذرا آگے

بڑھ کر صحن کا جائزہ لیا، آدھے صحن میں دھوپ چمک رہی تھی۔ آدھے میں سایہ آچکا تھا۔

کھڑی میں وقت دیکھا۔ آدھا گھنٹہ ہے نہ پانچ سے زیادہ۔ آگے بڑھے، رخ باد رچی خانے کی

جانب تھا۔
باد رچی خانے میں پہنچ کر چوکی اٹھا کر سامنے

رکھی اور اس پر چڑھ کر اوپر والی الماری کا پٹ واک کیا۔
نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہاتھ مار مار کر ٹٹولا

شروع کیا۔ دائے ناکامی کچھ ہاتھ نہ آ سکا۔
ایک کے بعد ایک الماری کی تلاش اور ایک

کے بعد ایک ناکامی۔ ہانپ کا پٹ گئے، پیٹ پانی کی مانند بہنے لگا۔

سب الماریاں خالی پڑی تھیں۔
”اب یہاں کون جھانڈو پھیر رہا ہے۔“

بڑبڑاہٹ میں جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔ وقت ہاتھ سے پھسلا جا رہا تھا۔ کھڑی میں وقت دیکھا، صرف

”کیا ہو گیا ہے۔ کیوں شور مچا رہا ہے۔“
 ”شور ہم نے کھڑا کیا، تم نے آکر کھایا ہے۔“
 شاہانہ خاتون کو دیکھ کر حاکم حسین کا غصہ گتے سر سے
 سے غود کر آیا۔

”اب جب کہ دادی انھیں بچی تھیں تو اس کی
 ڈیوٹی ختم تھی۔ سب ختم کر کے ہاتھ مہاڑنا باہر کو
 بڑھال جاتے جاتے پلٹ کر دادی کو مٹا طلب کیا۔“
 ”دادی! سارے سالوں کے پیکٹ، والیس،
 جینی اور چاول اس بالٹی میں رکھے ہوئے ہیں۔“

ہاتھ سے ایک کونے میں بڑی بالٹی کی طرف اشارہ
 کیا جس کے اوپر آٹا گوندھنے والا سلا والا دھرا تھا۔
 ”اور شیپو، صابن، سرف وغیرہ یہ رہے۔“

ہاتھ سے زمین کی طرف اشارہ کیا جہاں تمام چیزیں
 رکھ کر کچن کی صفائی کا کپڑا بڑی صفائی سے ان پر ڈال
 رکھا تھا۔ دادی نے صدقے ہوتی نظروں سے پوتے
 کو دیکھا۔

دوسری طرف حاکم حسین کا بس نہیں چل رہا تھا
 کہ اپنی نصف بہتر اور پوتے دونوں کو الٹا ٹانگ
 دیں۔ حمزہ جا چکا تھا۔

شاہانہ خاتون ایک ہاتھ کمر پر لٹکائے دوسرا
 ٹھوڑی پر رکھے میاں کی جانب گھومیں۔
 ”حاکم حسین! عمر گزر گئی، قبر میں پاؤں لٹکائے
 بیٹھے ہو، اب تو باز آ جاؤ اپنی حرکتوں سے۔“

”ہاں، میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، تم تو
 آب حیات کی کرا آئی ہو۔ ساری دنیا کو قبر میں اتار کر
 راج کرنا ان کی قبروں پر، سازشی بڑھیا!“ وہ جکتے جھکتے
 باہر کو بڑھے پر شاہانہ خاتون کو اشارت کر دائیں۔

”ہائے میرے اللہ! عورتوں کے نصیب میں
 سکون آ جاتا ہے اس عمر میں، پر میرے مقدر میں سکھ
 کہاں۔ یہ بڑے میاں جب تک زندہ ہیں نہ خود
 سکون سے رہیں گے نہ کسی دوسرے کو سکون کا سانس
 لینے دیں گے۔“

وہ بولتی رہیں، بولتی رہیں۔ بات نصیبوں،
 لعنتوں، ملامتوں اور حاکم حسین سے ہوتی ہوئی اب

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“
 ”میری ساری یادیں آ کر سر پر سوار ہو جائے گی۔“

حاکم حسین کے ماں باپ تک آپہنچی تھی۔

”ارے اللہ ان سے پوچھے گا، یہ سارے زمانے کا کارہ انسان میرے ہی سے مار کر چلے گئے۔ ساری زندگی ہوگئی اس کو بھگتے۔“

جب تقریر ان کے ماں باپ تک پہنچی تب وہ میٹ کا کنڈا کر اکر بس باہر نکلنے کوئی تھے، بغل میں سواری رنگ کا تھیاد بار کھا تھا۔ گیٹ کو کھولتے ان کے ہاتھ تھم سے گئے، اگلے قدموں واپس ہوئے (بات ماں باپ تک ان کی موجودگی میں ہی آپہنچی تھی، سو جواب دینا واجب ہو گیا تھا)۔

”اللہ تو تمہارے اماں، باوا سے پوچھے گا۔ جو یہ پانچ فٹ دس انچ کی بلا (انگلی سے شاہانہ خاتون کی طرف اشارہ کیا) میرے ساتھ باندھ گئے۔ ساری زندگی ہوگئی میرا خون چوستے، اس کے کلیجے میں اب تک ٹھنڈ نہیں پڑی۔“

”ارے بس کر جاؤ میاں! سب جانتی ہوں۔ کس بات کی تکلیف ہے تمہیں۔ ارے، وہ تو آج بھی تمہیں گھاس نہیں ڈالتی (انگلی اٹھا کر اوپر والے پورشن کی طرف اشارہ کیا)۔ تم ہی پتا نہیں کون کون سے ارمان سینے سے لگائے بیٹھے ہو۔“ دونوں جانب سے برابر کی گولہ باری جاری تھی۔ حمزہ کے فائنل سمسٹر کے پیپر چل رہے تھے، وہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ پارہا تھا۔

”یار! یہ دادا جکیوں نہیں رہے۔ آج کچھ ہاتھ نہیں لگا مگر پہلے سے تو کچھ نہ کچھ اپنی زمیں میں چھپا کر رکھائی ہوگا نا۔“ اس نے سوچتے ہوئے کتاب زور سے بند کی اور اٹھ کر باہر محن میں چلا آیا۔

”بس.....“ محن میں آکر وہ ادنیٰ آواز سے بولا۔ مرہبان مرخ دادا اور پہلوان نما دادی، دونوں کی زبانوں کو ایک ساتھ بریک لگی۔

”دادی! مجھے لگ رہا ہے، آپ کا بی بی لی شوٹ کر رہا ہے۔ آپ رکیں۔ میں بی بی اپریس لے کر آتا ہوں۔“

”اور دادا! آپ نے بالکل کہیں نہیں جانا، میں

آپ کو گلو کوڑ بنا کر دیتا ہوں۔ ذرا دادی کافی لی تھک کر لوں پہلے۔“

وہ بی بی اپریس لینے اندر آیا اور اس کے بازو آنے تک حسب توقع دادا فرو چکر ہو چکے تھے۔

حاکم حسین ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، بھی مشکل سے اور بچی بھی مشکل سے۔

ہر دو، تین سال بعد کوئی نہ کوئی بیماری یا شدید جملہ کرتی کہ جان کے لالے پڑ جاتے۔ خیر زندگی تھی، اس لیے جان بچتی رہی۔

رشیدہ، ان کی بیوہ خالہ کی قیمتی بیٹی تھی، کھر ان کے ساتھ بل کر جوان ہوئی۔ انیسیتھی لگاؤ تھا یا پھر.....

جو کچھ بھی تھا، وہ اپنی شریک حیات کے طبع پر رشیدہ ہی کو دیکھتے تھے مگر یہاں پر خالہ اڑ گئیں، کسی صورت بیٹی کا رشتہ دینے کو تیار نہ ہوئیں۔

نہ پڑھا لکھا، نہ کوئی ہنر سیکھا، سارا سارا دل آوارہ گردیاں اور باپ کی محنت سے بنائی جائیداد آوارہ دوستوں پر اڑانا۔ یہ شخص وہ جملہ خصوصیات جن کی بنا پر حاکم حسین کو رشیدہ کا رشتہ نہ مل سکا۔

رشیدہ کو اس کی ماں نے بیاہ دیا، گاؤں کے کسی بڑے چوہدری کے بیٹے کے ساتھ۔ یہ قصہ بھی تمام ہوا۔ اس کے دو ماہ بعد ادھی، لمبی چوڑی، بے تحاشا

خوب صورت شاہانہ خاتون حاکم حسین کی دلہن بن کر ان کی زندگی میں آ گئیں۔

شاہانہ اور حاکم کا کوئی جوڑ نہ تھا، حاکم کے باپ کے پیسے نے شاہانہ کے باپ کی آنکھوں پر پانی باندھ دی۔ سو یہ شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔

اس شادی کے دو، تین ماہ بعد رشیدہ کی ماں خالق حقیقی سے جا ملیں۔

ایک ماہ اور تمام ہوا۔ رشیدہ کی بیٹی سیکھنے دو سال کی تھی اور شاہانہ کا رجب (حمزہ کا باپ) تقریباً ڈیڑھ سال کا جب

رشیدہ بیوہ ہو کر واپس آ گئی۔ میکے کے نام پر

خالہ، خالو کا آسرا تھا۔

خالہ، خالو نے ولداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ شاہانہ کو بھی بظاہر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس واقعے کے کوئی چارہ ماہ بعد شاہانہ نے گنبد کو جنم دیا۔ پر معاملات تب خراب ہوئے جب حاکم حسین نے رشیدہ سے عقد ثانی کی بات چھیڑ دی۔

شاہانہ نے تو وہ ہنگامہ کیا کہ الامان الحفیظ۔ اس قدر فساد برپا ہوا کہ حاکم حسین کا گھر ٹوٹنے پر آ گیا۔ گور رشیدہ نے شروع سے آخر تک بھی حاکم حسین کی رتی برابر بھی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ اس کے باوجود شاہانہ کی نظر میں وہ برابر کی مجرم ٹھہریں۔ شاہانہ ان کو بزدلاشت کرنے کو تیار نہ تھیں۔ دوسری طرف جائیداد کم ہوتی جا رہی تھی حاکم حسین کی آوارہ گردیاں زیادہ۔

سوا حاکم حسین کے باپ نے ایک بروقت اور فوری فیصلہ کیا۔ اوپر والا پورشن ہوا کر رشیدہ اور اس کی بیٹی سیکینہ کو ادھر منتقل کر دیا۔ بیٹے کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے یہ بڑا سارا گھر بہو کے نام کر دیا اور بہو کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے اوپر کا پورشن رشیدہ اور سیکینہ کے نام کر دیا۔

چار، پانچ سالوں کے اندر اندر ساس، سر دونوں گزر چکے۔ حاکم حسین نے دکائیں، پلاٹ سب اللے تللوں میں اڑا دیا۔

آخر میں گھر بھی بیچنے کو تیار بیٹھے تھے جب پتا چلا کہ گھر تو شاہانہ کے نام ہے۔ اور تب سے شروع ہوئے حاکم حسین کے نمے دن۔

ساس، سر کے انتقال کے بعد اوپر والوں اور نیچے والوں کا رابطہ بس اس قدر رہ گیا کہ گھٹ سے، میزبانی کی طرف جاتے آنا سامنا ہو گیا اور بس۔ رشیدہ نے سیکینہ کو بیاہ دیا، دونوں ماں بیٹی دونوں کے دوپٹے ٹانگنے کا کام کرتی تھیں۔ سیکینہ کو رشیدہ نے اپنے سرال میں اچھی جگہ بیاہا تھا۔ مجاہد اچھا شوہر تھا تو اس سے کئی زیادہ اچھا داماد ثابت ہوا۔

کہانی میں ٹوئسٹ جب آیا جب گمینہ کی شادی اور رجب کے باہر جانے کے لیے مہر کی ضرورت پڑی۔ شاہانہ نے گھر بیچنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی تو یہ عقدہ کھلا کہ وہ نہ صرف رشیدہ کو اس گھر سے بے دخل نہیں کر سکتیں بلکہ گھر بیچنے کی صورت میں آدمی رقم کی حق دار بھی رشیدہ اور سیکینہ ہوں گی۔

یہ جبران کے حواسوں پر بجلی بن کر گری بھی ورنہ وہ تو انتظار میں تھیں کہ سیکینہ شادی کے بعد ماں کو ساتھ لے جائے اور وہ گھر کی بلا شرکت غیرے مالک ہوں گی۔

رشیدہ تک بھی خبر پہنچ گئی۔ وہ تو اس قدر سیانی نکلیں کہ بیٹی، داماد کو بلا کر اپنے ساتھ ہی رکھ لیا کہ کہیں قبضہ نہ ہاتھ سے نکل جائے۔

اس کے بعد تو شاہانہ خاتون نے زبان کے وہ، وہ جو ہر دکھائے کہ کسی طرح تنگ آ کر یہ خود ہی جان چھوڑ دیں مگر سلام ہے رشیدہ کی ثابت قدمی کو، وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

الٹا بیٹی کے سرالیوں کی فوجیں بلا بلا کر دنوں گھر میں رکھیں۔ شاہانہ خاتون کے سینے پر سانپ لٹھکتے رہتے جن کا زہر وہ زبان کے راستے۔ باہر نکالتیں۔ کبھی رشیدہ چپ کر جاتیں، کبھی مقابلے پر آتیں تو اگلے پچھلے سارے حساب برابر کر دیتیں۔

ایک مرتبہ تو بات اتنی بڑھ گئی کہ ایک دوسرے کے گلے پکڑ لیے۔ بڑی مشکلوں سے محلے داروں نے بچ بچاؤ کرایا۔

رجب کی شادی کر کے شاہانہ خاتون نے اسے باہر بھجوا دیا۔ گمینہ بھی بیاہی گئی، رجب سال کے سال چکر لگاتا۔

ماں باپ کو عمرہ کروایا، بیوی بیچے (حزو) کا بھی بہت خیال رکھتا۔ بہن کی بھی جس حد تک ممکن ہوتا وہ کرنے کی کوشش کرتا۔ (گمینہ کے میاں کی آٹا چکی تھی، حالات بس گزارے لائق ہی تھے)۔

بڑوں کی رنجشوں اور عداوتوں کے باوجود بچوں کے درمیان جانے کیسے اتنا پیار اور دوستی ہو گئی تھی۔

متجسس سا آگے بڑھا تو سامنے عی دادی کی خوشی کی وجہ نظر آگئی۔
ایک نئی گھوڑا ٹوٹیک واشنگ مشین لٹکارے مار رہی تھی۔

”السلام علیکم!“ اس نے بآواز بلند سلام کیا۔
”وعلیکم السلام! جیتا رہ میرا بچہ۔“ دادی چپکے ہوئے بولیں۔

”اکیلا ہی آیا ہے؟“

”نہیں، پاک فوج کے دستے سلامی دیتے ہوئے ساتھ ساتھ آئے ہیں، باہر دروازے پر کھڑے ہیں۔“

”میں نے تجھے پلبر لانے کا کہا تھا۔“ شاہانہ خاتون اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔
”اوہ۔“ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”بھول گیا۔“
”چل جا، میرا بچہ! بھاگ کر جا، کسی پلبر کو پکڑ لا۔“
”پلبر کوئی گلیوں میں کد کڑے لگا رہے ہوں گے کہ میں جاؤں اور گردن سے پکڑ کر لے آؤں۔“

”ٹھیک ہے، میں خود جاتی ہوں، تو اور تیرا یہ ناکارہ دادا دونوں چوڑیاں پہن کر کھر بیٹھے رہو۔“ وہ کچھ پریشان ہوا۔

”یہ اتنی ایمر جنسی میں پلبر کی کیا ضرورت پڑی آپ کو۔“
”یہ مشین سیٹ کروانی ہے۔“ پیار سے مشین پر ہاتھ پھیرا۔

”یہ تو خاصی مہنگی لگ رہی ہے۔ اتنے پیسے کہاں سے آئے۔“

”ارے بڑھیا جو خزانہ ساری عمر سے جمع کر رہی ہے، اسی میں سے نکال کر لائی ہے۔“
جواب دادا کی طرف سے آیا۔

”بس مجھے چار پیسے دیتے تکلیف ہوتی ہے، باقی ہر جگہ اللے تلے کریں گی۔“ دادا تو جلتے توے، بیٹھے تھے جب سے مشین آئی تھی۔

”ہاں، تم تو چاہتے ہو، جو جمع جتنا ہے تم، لگا دوں تاکہ سارے زمانے میں لو اب بنے پھرے

سکینہ کی نور، مگینہ کی مہک اور رجب کا حمزہ باغ میں گھنٹوں کھیلتے۔ شاہانہ خاتون دیکھ لیتیں تو نور کو ڈانٹ ڈپٹ کر اوپر بھیج دیتیں لیکن ان کی دوستی ختم نہ کروا سکیں۔

مہک آٹھ سال کی تھی جب مگینہ کا میاں باہر جانے کو رتول رہا تھا۔ وہ باہر چلا گیا۔ دو سال بعد بیوی اور جی کو بھی بلوا لیا۔

اس کے دو سال بعد رجب تابوت میں بند ہو کر گھر آیا۔ کام کے دوران ہی دل بند ہو گیا۔ قصہ تمام۔
بہو کو اس کے ماں باپ لے گئے، حمزہ کو ادھر ہی چھوڑ دیا۔ باپ قدرت نے چھین لیا، ماں دنیا نے۔

حمزہ کو دادی کی صورت ماں مل گئی۔ دادی کو حمزہ میں رجب دکھتا۔ گھر کا کمانے والا منوں مٹی تلے جا سویا۔ شاہانہ نے بڑی کوشش کی کہ اوپر والے کسی طرح گھر خالی کر دیں تو وہ کرائے پر چڑھا کر گزر بسر کی کوئی سہیل کریں۔

مگر رشیدہ خاتون نے جم کر مقابلہ کیا۔ اوپر کا حصہ ہاتھ سے نکلنے نہ دیا۔ مگینہ نے خرچ باندھ دیا۔ ہر ماہ اچھی رقم بھجوانے لگی۔ اس کے میاں کا کام اچھا چل رہا تھا۔

پھر چار سال بعد وہ مہک جو باہر جا کر میکس ہو چکی تھی پاکستان کا چکر ضرور لگاتی۔ ایک غیر رسمی غیر اعلیٰ نسبت حمزہ اور میکس کی شروع سے ٹھہرائی جا چکی تھی۔

اب حمزہ اور میکس کے درمیان نور بھی تھی، اس کا تو کسی کو علم ہی نہ تھا اور نور تو اصل میں حمزہ اور میکس کے درمیان بھی ہی نہیں۔ یہ تو میکس بھی جو حمزہ اور نور کے درمیان تھی۔

اور اب.....

چوہدری محمد امجد بھی۔

☆☆☆

حمزہ گھر میں داخل ہوا تو دادا کی زبان انکارے اٹھ رہی تھی اور دادی خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔

رہو۔ ارے میاں! میری بیٹی ہے جو اتنے عرصے سے پیچھے رہی ہے ورنہ قانون مر رہے ہوتے۔“
 ”میری بھی بیٹی ہے وہ۔“ حاکم حسین ایک بار پھر سینہ بان کر میدان میں اترا اسی چاہتے تھے کہ حمزہ درمیان میں کود پڑا۔

”میری بیٹی نہیں ہے۔ میری پھوپھو ہیں۔“
 اب آپ دونوں ذرا خیر سگالی کا مظاہرہ کریں۔“
 ”ارے چو لیے میں کئی خیر سگالی، ہٹو، میں خود دھوٹ کر لاتی ہوں پلیسبر۔“

”پلیسبر میں لے کر آتا ہوں، چائے بناؤ تم دو بندوں کی۔“ حاکم حسین بولے۔
 ”دو پلیسبروں کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایک۔“

”اتق محرت! دوسرا میں ہوں۔“ وہ کہہ کر دووازہ کراس کر گئے۔

”دادی! اپنی مشین ٹھیک ٹھاک تو چل رہی تھی، یہ اتنا غرچا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“
 ”تجے نہیں بتانا یہ مشین کیا جادو کرتی ہے، اس لیے تو اس بات میں کر رہا ہے۔“
 اس میں تم میلے کپڑے ڈالتے ہیں، ساتھ میں صرف ڈالتے ہیں، خود پانی میں کپڑے دھوتی ہے پھر گھگھاتی ہے پھر خشک کر دیتی ہے۔ تا کیما؟“

انہوں نے ایسے حمزہ کی طرف دیکھا جیسے یہ مشین ان کی اپنی ایجاد ہو۔

”دادی! یہ کپڑے یہ کر کے الماری میں رکھیں۔“
 ”جی ہاں! ہم پھر کر مشین کا جائزہ لے رہا تھا۔“
 ”مشین ہے تیری بیوی نہیں ہے۔“ وہ مزہ ہانک رہے تھے۔

”لوہہ بھجھا اچھا۔۔۔۔۔۔“

دوسری طرف حاکم حسین نے لا کے کو ابھی طرح سکھایا جا رہا تھا۔

”دیکھ بارہ سو ماگنا، چار پ پڑی لی فاصل کر دی کی۔“
 ”کیا نہ کہیں چا چائی اد چار ماگنوں،“

پندرہ سو پڑن کر لیں۔ ساڑھے سات سو آپ کے، ساڑھے سات سو میرے۔“

”نہیں بھئی، بڑی چالاک ہیں بڑی بی۔ پتا لگ جائے گا ان کو۔ بس جیسا میں نے سمجھایا ہے دیا ہی کرتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ لا کے نے سر ہلادیا۔

”اچھا، ایک بات اور سن۔“ وہ متوجہ ہوا۔

”کوئی معمولی سا نقص چھوڑ دینا، تیرا بھی روزگار لگا رہے گا اور میرا بھی۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“

جتنی دیر پلیسبر مشین سیٹ کرتا رہا، حمزہ کمرے میں بند پڑحالی کرتا رہا۔ یوں ہی پانی پینے کے لیے باہر نکلا تو چونک گیا۔

گھوم پھر کر آگے پیچھے سے اچھی طرح لا کے کا جائزہ لیا۔

”کیا ہو گیا ہے۔ کیوں پاگلوں کی طرح کی حرکتیں کر رہا ہے۔“ دادا سے زیادہ دیر برداشت نہ ہوا تو بول اٹھے۔

”لا کے کا بھی کام ختم ہوا، ہاتھ بھانڈا اٹھ کھڑا ہوا۔“

”شرٹ تو بڑی زبردست ہوئی ہوئی ہے۔“

حمزہ اسے کھڑے ہوئے ہوا۔

”یہ شرٹ۔۔۔۔۔۔“ اس نے اپنی شرٹ کو دیکھا۔

”یہ تو اپنے چاچائی نے۔۔۔۔۔۔“ بات ابھی اس کے منہ میں ہی تھی کہ عالم حسین نے تیز تیز بولنا شروع کر دیا۔

”ارے بھئی، کام ختم ہو گیا۔ آہا، ہسے دے دو آ کر۔“

ساتھ ہی ساتھ پلیسبر کو کچھ اشارے بھی کرنے لگے جو لا کے کی سمجھ میں تو نہ آئے البتہ حمزہ کی سمجھ میں

ابھی طرح آ گئے۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا، ہمد میں لپکی گیا حاکم حسین سے جواب ملنی کرنے۔

”دادا! یہ میری شرٹ اس پلیسبر تک کیسے پہنچی؟“

”پل جٹ یہاں سے، آرام کر لے دے“

مجھے۔ بازار میں ہزاروں چیزیں ملتی ہیں ایک طرح کی۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

”آپ کو اچھی طرح معلوم ہے، یہ شرٹ پھوپھو نے بیجی تھی میرے لیے۔ اس کا ادھر کا ایک بن نوٹ گیا تھا، میں نے جو دوسرا بن لگایا تھا، وہ بالکل مختلف تھا۔ وہی اس پلیٹبر کی شرٹ پر لگا ہوا تھا۔ یہ سوئی صدمیری ہی شرٹ تھی۔“

”ہاں تھی، تیری ہی شرٹ۔ جا پولیس بلا لے جا کر۔“ انہوں نے لیٹ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ مطلب، اب دفع ہو جا۔

”ایسے نہیں جاؤں گا میں۔ میری بہت سی چیزیں گاہے بگاہے غائب ہوتی رہی ہیں۔ سب کا حساب چاہیے مجھے۔“ اس نے دادا کو دھمکانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے بیٹا، پوری رات ادھر ہی لیٹا رہ حساب۔“ تھوڑی ہی دیر میں کمرہ ان کے خزانوں سے گونج رہا تھا۔

☆☆☆☆

مزہ، دادی اور دادا، منگی کو لینے ایئر پورٹ جا رہے تھے۔ کسی میں سب بیٹہ چکے تو مزہ کو یاد آیا موبائل تو اندر ہی رہ گیا ہے۔

”ایک منٹ میں ذرا موبائل لے آؤں اندر سے۔“

وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، نور سے لکراتے نکراتے ہوا۔

کالی بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے وہ غالباً صفائی کرنے نیچے آئی تھی۔ شاہانہ خاتون نے گیٹ سے لے کر بیڑیوں تک کی صفائی اوپر والوں کے ذمے لگائی ہوئی تھی، جو نور ہی کرتی تھی۔

آج کتنے دن بعد وہ نظر آئی تھی۔

سیاہ چادر کے پاس لے میں مقیم اس کا بیٹا چہرہ بڑی بڑی آنکھیں، ایسی کھنسی سیاہ نکلیں، ٹھوڑی پر قدرے موج سائل۔

”چوہدری ابرار، تجھے تو میں اپنی محبت پر قبضہ

کرنے نہیں دوں گا۔“ دل ہی دل میں اس نے فکرم آستینیں چڑھائے بھینسوں کے باڑے میں چھپنے چوہدری ابرار کے مقابل محسوس کیا۔

”تم کیوں چھپتی پھر رہی ہو مجھ سے؟“ مزہ نے لگا ہوں میں اس کا چہرہ قید کرتے ہوئے سوال کیا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے چھپنے کی۔“ اس نے لگا ہیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر نور کی نظریں جھکالیں۔

”منگنی مبارک ہو۔“ مزہ کا لہجہ کھٹکا ہوا۔ ایک لمبے کی بات تھی، وہ واپس اپنی جون میں پلائی۔ چہرہ سرخ ہوا، آنکھوں سے طعنے چھانکا۔

”تمہیں بھی شادی مبارک ہو۔“ مزہ نے ہانکا سا قہقہہ لگایا۔

”اچھا، شادی ہوگئی میری۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ لہجہ میں ہانکا سا مسخرہ کود کر آیا۔

”میری بھی منگنی ہوگئی اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ اسی کے لہجہ میں جواب دوٹوایا۔

”وہ تمہارا بھینسا..... ادھ سوری، میرا مطلب ہے منگیتر۔ کب ملو آؤ گی اس سے؟“

”ملو آؤں گی جب آئے گا۔ فی الحال تم اپنی ہونے والی بیوی کو لینے جاؤ، لیٹ ہو رہے ہو۔“

باہر کیسی والا ہارن پر ہارن دے رہا تھا۔

”میری ہونے والی بیوی تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

نور نے حیرت سے اس کی خوش کمائی ملاحظہ کی۔

”تم کس دنیا میں جی رہے ہو مزہ؟ میری نسبت ملے ہو چکی ہے۔ تمہاری شادی تقریباً متوقع ہے، ایسے میں کس آس پر تم امید کے بجائے ہاتھ میں تھما رہے ہو۔“ اس کا گارنڈ چمک گیا۔

ہارن کی آواز کان پھاڑنے لگی تھی۔

”مزہ جو کہتا ہے، وہ کر کے دکھاتا ہے۔“

سینہ تان کر بولا۔ ”تمہارا ادھ اور میری وہ۔“

چیمسی دلوں کی۔ بس ”تمہیں“ میرا ساتھ دیتا ہے۔

تمہیں پر سارا زور تھا۔

نور خاموشی سے واپس پلٹ گئی بغیر کوئی جواب دے۔

☆☆☆

”اے میکی! تو جب سے آئی ہے یہ دسترخوان کے ڈیزائن والا اسکارف کیوں باندھے پھر رہی ہے۔“
شاہانہ خاتون کو میکی کا یہ پردہ خاصا کھٹک رہا تھا۔
”کیا ہے نانی! اچھا نہیں لگ رہا کیا؟“ میکی
چڑھ گئی تھی۔ ”آج تین دن ہو گئے ہیں، آپ نے،
نانا نے، حمزہ نے پوچھ پوچھ کر عاجز کر دیا ہے۔“
”ایک دہ بھی تو ہے۔“ ہاتھ سے اوپر کی طرف
اشارہ کیا۔ ”اتنا بڑا خیمہ چڑھا کر پھرتی ہے، اس پر تو
استراض نہیں ہوتا آپ کو۔“

”وہ جو خیمہ چڑھا کر پھرتی ہے نا، اس کے
اندر بھی انسانوں والا جلیہ ہوتا ہے۔ تیری طرح نہیں
کہ اوپر سے سر ڈھک کر پھر رہی ہے، نیچے یہ مردوں
والی بنیان (اس کی ڈھیلی ڈھالی لی شرٹ پر چوٹ
کی) اور پینٹ چڑھا کر پھر رہی ہے۔“
اس کا اسکارف گھر میں سب ہی کو کھٹک رہا تھا
پر مجبوری یہ تھی کہ وہ یہ اسکارف اتار نہیں سکتی تھی۔
”اچھا سن، تیری ماں کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی
تھی، شادی کی شانگ شروع کر دے۔ کپڑا،
لو، جوتا، جو لینا ہے، لے لے۔“

میکی نے بے زاری سے سر جھٹکا۔
”اور مگینہ بتا رہی تھی تو نے کوئی ڈگری وغیرہ لی
ہے یا ہرے۔“

”جی نانی! میر کنگ کا کورس کیا ہے۔“
جب ہی حمزہ اندر داخل ہوا۔
”ہائے لیڈیز! کیا ہو رہا ہے؟“

”تمہارا انتظار ہو رہا تھا، کہاں غائب رہتے ہو
سارا سارا دن۔ میں گھر میں بیٹھ بیٹھ کر بور ہو گئی ہوں۔“
”جی.....“ حمزہ نے حیرت سے اس کی شکل
دیکھی۔ ”تین دن پورے نہیں ہوئے، چھپیں آئے
ہوئے اور تمہارا پورے دن کا پیریل بھی شروع ہو گیا۔
اسے مریے میں تو محسوس بھی نہیں اترتی۔“

مکھنکو درمیان میں تھی کہ حاکم حسین بھی چلے
آئے۔

”نانا، نانی! آپ لوگ ہی کہیں مگھونے کا
پروگرام بنالیں۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ بنالیتے ہیں سیر ویر کا
پروگرام بھی۔“ نانا بولے۔

”اچھا میکی! وہ، تو حمزہ کو تو بتا۔ کاہے کا کورس
کیا ہے تو نے؟“

”مہیر کنگ کا۔“ میکی نے دہرایا۔
”مہیر کنگ مطلب بال وال کاٹنے کا۔“ حاکم
حسین نے سوال کیا۔

”جی..... نانا۔“

”اوہ، ہائے۔“ شاہانہ ناک پر ہاتھ رکھ کر گویا
ہوئیں۔ ”میکی! تجھے اور کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ملا تھا
جو نانیوں والی ڈگری لے ڈالی۔“ وہ جتنا حیران
ہو تھیں کم تھا۔

”اچھا میکی! بات سن۔ خالی بال کاٹتی ہے یا
شیو وغیرہ بھی کرتی ہے۔“ حاکم حسین نے تو اپنے
حساب سے پوچھا تھا پر حمزہ کے چھت پھاڑ قبہبہوں
نے درود پوار ہلا دیے۔

☆☆☆

”ٹیپو، ادنیپو!“ باغ میں بیٹھا حمزہ چائے کا مختصر
بیٹھا تھا۔ ابھی تک ٹیپو چائے لے کر نہیں آیا تھا۔

مجبوراً خود بچھواڑے آ کر آواز دینا پڑی۔ ٹیپو
نے تو آواز نہیں سنی، کسی کام سے گیلری میں آئی نور
کے کان کھڑے ہوئے۔

”کیا بات ہے؟ ٹیپو نہیں ہے گھر پر۔“ نور نے بتایا۔
”تو ظالمو! شام کی چائے تو بھجوا دو۔ کب سے
انتظار کر رہا ہوں۔“

”اچھا، تو وہ جو ٹیپو کو شام کی چائے کا دورہ روز
پڑتا ہے، اس کے پیچھے یہ کہانی ہے۔“

”ہاں، تمہیں تو جیسے پتا ہی نہیں ہے۔“ وہ
مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس فضول بات کی سزا کے طور پر آج بغیر

چائے کے گزرا کر دو۔" وہ جا چکی تھی، اپنی خوشبو پیچھے چھوڑ کے۔

ہو ہو ہو

شاہانہ خاتون ٹریک کھولے اللہ جانے کیا الم غلم، نکال نکال کر ڈھیر کیے جا رہی تھیں۔ حنزہ یاس بیٹھا موبائل پر مصروف تھا، تب ہی میکی وہاں چلی آئی۔ "کیا چل رہا ہے یہاں؟" وہ اٹھرائی لیتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"تیری شادی کے لیے جوڑے تھے کچھ۔" بولتے بولتے اچانک ہی میکی پران کی نگاہ پڑی تو ایسی زوردار چیخ ماری کہ حنزہ کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔

جلدی سے موبائل اٹھا کر دادی کا چہرہ دیکھا جو عجیب و غریب سا ہورہا تھا۔ ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو میکی کو دیکھ کر اس کی بھی چیخ چلی۔ نکلتے نکلتے رو گئی۔

نانی کی چیخ سن کر میکی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا پر تیر کمان سے نکل چکا تھا، اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سو پاؤں پسا کر آرام سے بیٹھ گئی، ویسے بھی وہ تنگ آگئی تھی اس اسکارف والے ڈرامے سے۔

"میکی! تیرے بال کہاں گئے؟" شاہانہ خاتون کی صدے سے چور آواز حلق سے برآمد ہوئی اور حنزہ کی تو آواز بھی حلق کے اندر ہی گھٹ گئی۔ کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہا۔

نظر میکی کے بالوں سے خالی سر پر تھی، جہاں تقریباً آدھا آدھا بال کے قریب بال سرکنڈوں کی طرح کھڑے تھے۔

"میکی! تجھے کینسر ڈیٹرنس تو نہیں ہو گیا۔ اسی میں جھرجھاتے ہیں نا بال۔"

اب وہ صدے سے کھل کر رونے والے فیز میں آنے والی تھیں لیکن میکی نے اس کی نوبت نہیں آنے دی۔

"نہیں نانی! بس شرط ہار گئی تھی دوستوں سے۔ انہوں نے شرط ہی منج کروانے کی رکھی تھی، سو کروانی

پڑی۔ ماما کا تو آپ سے بھی زیادہ برا حال تھا۔ نئی دن تک کھانا نہیں کھایا انہوں نے۔" اہلکات کے اختتام پر خود ہی قہقہہ مار کر ہنس دی۔ "تو نے شرط کے پیچھے ٹنڈ کر والی۔ اب صدے کی جگہ حیرت نے لے لی تھی (کیا جڑی مان کی نو اسی۔ ایسا تو نہ بھی دیکھا نہ سنا)۔ حنزہ نے لاشعوری طور پر اپنے کئے ہالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"شرط کے پیچھے نہیں نانی ادوستی کے پیچھے۔" وہ آرام سے گویا ہوئی۔

"میکی! تجھے اپنے ہونے والے شوہر کا بھی خیال نہ آیا۔" شاہانہ خاتون ایک کے بعد ایک جھگڑے سے گزر رہی تھیں۔

ہائے شادی، بچی دلہن، لوگوں کی باتیں۔ کیا کیا کچھ نہ نظروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

"اپنے ہونے والے شوہر ہی کے کہنے پر تو کیا ہے یہ۔" اس نے سکون سے کہتے حنزہ کا سکون برباد کیا۔

شاہانہ خاتون نے حنزہ کی طرف دیکھا گویا کہ رہی ہوں۔

"حنزہ..... تُو.....؟"

"میں نے کب تمہیں ٹنڈ کروانے کا کہا۔" وہ بے چارہ بوکھلائی تو سمجھا۔

"میں تمہاری نہیں، اپنے ہونے والے شوہر کی بات کر رہی ہوں۔"

اس نے حنزہ اور شاہانہ دونوں کی سماعتوں پر ایک ساتھ بم پھوڑا۔

☆ ☆ ☆
"دادی کیا ہے، اب بس بھی کر دیں۔ آپ نے تو ایسے خود کو روگ لگا لیا ہے، جیسے میری نہیں آپ کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔" جیسے جیسے وہ

"ہائے روگ کیسے نہ لگاؤں۔" جیسے جیسے وہ

تھے تیری شادی کے۔" انہوں نے پھر سے ہچک پھک کر رونا شروع کر دیا۔

چاہتی تھیں کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
 ”میاں کہو، مجازی خدا کہو..... کوئی اور اچھا سا
 افلا استعمال کر لو نا۔“
 ”کیا میں باہر چلا جاؤں؟“ حمزہ نے انٹری
 دی۔

حاکم حسین اور شاہانہ نے ایک دوسرے کو دیکھا
 اور جھینپ کر مسکرا دیے۔

☆☆☆☆

ٹیپو چائے لے کر آیا تھا۔ وہ دونوں بارش میں
 بیٹھے تھے۔

”حمزہ بھائی! وہ آڈیو سنوائیں نا۔“
 ”یہ لے۔“ حمزہ نے ریکارڈنگ چلائی۔

میکس کی گفتگو، اتفاقاً یا اراداً حمزہ نے اس دن
 ریکارڈ کر لی تھی۔ اب وہ دونوں روز بیٹھ کر چائے
 کے ساتھ یہ ریکارڈنگ سنتے تھے۔

”اب کی بار آخری بار ہے۔ میں آخری مرتبہ
 پاکستان آئی ہوں۔ شادی میں اپنی مرضی سے اپنے
 برطانوی نژاد مسلمان دوست ابراہام سے کروں گی۔
 ماما، بابا کو یہ بات واپس جا کر بتاؤں گی، پہلے آپ
 لوگوں کو بتانا چاہتی تھی اور پلیز، مجھے جذباتی طور پر
 بلیک میل کرنے کی کوشش مت کیجیے گا جو کہ آپ
 پاکستانیوں کی عادت ہوتی ہے۔“
 ریکارڈنگ ختم ہو گئی تھی۔

حمزہ اور ٹیپو نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر
 ہاتھ مارا۔

”ایک بار اور سنیں بھائی؟ بڑا مزہ آتا ہے۔“
 ”کل سنیں گے، ورنہ بور ہونا شروع ہو جائیں
 گے۔“

”اچھا ٹیپو! تو بتا، تیرا وہ بھینسا جیل سے باہر آیا
 یا نہیں۔“

”افو، حمزہ بھائی! میں آپ کو کتنی بار بتاؤں
 گا۔ ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا اب اس بھینسے سے۔ ابو
 نے رشتہ ختم کر دیا ہے۔“

”بس یار! بار بار سننے میں مزہ آتا ہے۔“

آج میکس کو داپس سدھارے بھی ہفتہ ہونے کو
 آ رہا تھا۔ دادی نے جو خود کو بستر سے لگایا تھا تو حمزہ کی
 لاکھ تسلی و تسکینی کے باوجود وہ سنبھل کر نہ دے رہی تھیں۔
 ”تو میں نے کیا میکس کی خاطر جوگ لے لیا
 ہے۔ کر دیجیے گا نا میری شادی، پورے کر لیجیے گا
 اپنے سارے ارمان۔“

”میں نے تو میکس کو ہی سوچا تھا نا ہمیشہ، تیری
 دلہن۔“

”ذرا اس گنجی کو میرے ساتھ رکھ کر سوچیں، خود
 ہی اپنی سوچ پر غصہ آئے گا آپ کو۔ اس غم میں، میری
 اتنی اچھی نوکری کی خوشی بھی سبکی بریٹ نہیں کر سکے ہم
 لوگ۔ چلیں انھیں، اچھی سی چائے پاؤں آپ کو۔“
 ان کے وجود میں کوئی جھنجھٹ نہ ہوئی۔

تب ہی حاکم حسین اندر آئے۔
 ”اب بس کر دو نا بیگم! زندگی سے سارے
 رنگ ہی ختم کر دیئے ہیں تمہاری خاموشی نے۔“

شاہانہ خاتون تو ایک طرف حمزہ نے بھی حیرت
 سے دادا کو دیکھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں بھی
 دادا کو ایسے اپنائیت سے بات کرتے نہیں سنا تھا وہ
 بھی دادی سے۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بجا۔

”چلو، آؤ، اٹھو۔ آج کا کھانا باہر کھائیں
 گے۔ بچے کی خوشی تو نہ خراب کرو۔“

شاہانہ خاتون اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پینسٹھ سالہ
 زندگی میں کبھی ایسے جملے نہیں سنے تھے میاں کے منہ
 سے۔ حیرت سے منہ کھل گیا۔

”تو پھر کہاں جائیں گے ہم لوگ؟“ حمزہ
 جوش سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے بتایا تو ہے، باہر کھائیں گے۔“ وہ
 بولے۔

”وہی تو پوچھ رہا ہوں باہر کہاں؟“

”باہر کھن میں اور کہاں جائیں گے۔ پیسے
 کہاں ہوتے ہیں میرے پاس۔“

اتنے دنوں بعد شاہانہ خاتون کھل کر ہنسی تھیں۔
 ”تم بھی نا حاکم حسین! ابھی وہ کچھ کہنا ہی

”آپ کی قسمت ابھی تھی جو راستے خود بخود
ہموار ہوتے چلے گئے۔ آپ کا اس میں کوئی کمال
نہیں ہے۔“

”یعنی کہ تم اب بھی نہیں مانو گی۔“

”ہرگز نہیں۔“

”دو سال ہو گئے ہیں شادی کو۔ یا رابا تو

مان جاؤ میری کرامت۔“

”پیس سال گزر جائیں گے تب بھی آپ کی کسی

کرامت کا عمل دخل نہیں مانوں گی اس سب میں۔“

”چلو، پھر میں مان لیتا ہوں۔“

”کیا.....؟“ نور کے ہاتھ پل بھر کر کے۔

”یہ تمہاری تہجد کی لمبی لمبی دعاؤں کا اثر تھا، جو

حالات ہمارے حق میں سازگار ہوتے گئے۔“

”کون سی دعائیں؟“ وہ انجان بن گئی۔

”تمہیں غالباً معلوم نہیں ہے۔ تمہارے گھر

میں، میرا ایک منبر بھی رہتا ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”منبر کو کیا معلوم دعائیں کس چیز کے

لیے تھیں۔“

”منبر کو اتنا تو معلوم ہی ہوگا کہ اس کے پیچھے

میں پاس ہونے کے لیے تو کم از کم آپا اتنی لمبی لمبی

دعا نہیں کر سکتی۔“

”منبر کی تو ابھی خبر لیتی ہوں جا کر۔“

”منبر کی خبر بعد میں لیتا۔ پہلے چلو ذرا دادی

دادا کی خبر لے آئیں۔“

”چلیں۔“ دونوں آگے پیچھے باہر آئے۔

”چاندنی رات اور من چاہے ہم سفر کا ساتھ۔“

”کیا زندقہ میں اس سے بڑھ کر بھی کسی چیز

کی طلب ہو سکتی ہے، دونوں نے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔

”اچھا تو پھر نہیں، انہیں پولیس ایسی جگہ سے
م گرفتار کر کے لے گئی تھی جس کا نام بھی ہم شریف لوگوں
کے لیے گناہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد تو یہ تو یہ
تو یہ۔۔۔ پھر ابو نے یہ رشتہ ختم کر دیا۔ بس بات ختم۔“
”ارے ایسے ہی بات ختم۔ آخری حصہ باقی
ہے، وہ بھی بول جلدی سے۔“

”بیلا آتنی نے گاؤں میں ہر طرف آیا کے
غلاف ایسی ہم چلائی ہے کہ اب گاؤں کا کم از کم کوئی
گھر آپا کا ہاتھ مانگنے کی کوشش نہیں کرے گا اور شہر
والوں کو یہ کوشش ہم کرنے نہیں دیں گے۔“ حمزہ نے
ٹیپ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”اور آپ کی بات کا بھی آخری حصہ باقی
ہے، جلدی سے بتائیں تاکہ میں واپس جاؤں۔“

”دادا اور دادی ایک جان دو قالب بن چکے
ہیں۔ ہر طرح کا لڑائی جھگڑا ختم ہو چکا ہے۔ میں تنخواہ

دادی کے ہاتھ پر رکھتا ہوں، وہ سب سے پہلے دادا کو
مینے کا خرچ دیتی ہیں۔ بھی دادا کہہ دیں کہ ابھی تو پچھلے

ماہ کے بھی میسے باقی ہیں تو دادی ناراض ہو جاتی ہیں۔
زیر دستی تھامتی ہیں پیسے اور ساتھ میں کہتی ہیں، ہمارے

بیٹے کی کمائی ہے۔ ہمارا حق ہے اس پر۔“

”یعنی کہ پپی اینڈ۔“ ٹیپ ہاتھ کھڑا ہوا۔
”پپی اینڈ ابھی کہاں ہوا، وہ تو ہوتا باقی ہے۔“

”تو آپ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔
بھجوائیں نارشتہ۔“

”ابھی نہیں۔ ذرا مناسب وقت آنے دو۔ دادی
جب اپنے منہ سے بات کریں گی میری شادی کی

تب۔“

”اوکے، میں چلا۔“ ٹیپ ہاتھ ہلاتا اپنے پورشن
کی سمت بڑھ گیا۔

☆☆☆

”میں کہتا تھا نا جو میں کہتا ہوں، وہ کر کے
دکھاتا ہوں۔“

وہ بیڈ پر لیٹا کنٹی پر سر نکالے نور کو کپڑے سے
کرتا دیکھ رہا تھا۔



انکسپریس

ہدی اپنی آؤی کار میں بیٹھی گاڑی تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے لوگوں کی گالیاں سننے کا نوویکیشن کی تقریب میں پہنچتی ہے۔ ہدی بے حد امیر باپ کی بے حد غریبی، بے حد فیشن اسٹیل اور کافی حد تک فضول لڑکی ہے جسے خود نمائی کا شوق ہے۔

اس کا کلاس فیلو لائم اس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ اس کی دولت پر طنز کرتا ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ مجھے بد نصیب سمجھنے کے باوجود جو تم چاہتے ہو کہ میری جگہ تم ہوتے۔

کا نوویکیشن میں وہ تصویریں کھینچتی ہے، ڈگری لیتی ہے۔ جب وہ نوویاں اچھا ل کر تصویر کھینچتا ہے ہوتے ہیں تو ہدی لڑکھڑاتی ہے اور نیچے گر جاتی ہے۔ تین سے چار بار اس کے ساتھ کیجا ہوتا ہے، وہ اچانک بے ہوش ہو جاتی ہے۔ آخری بار بورا بورا جانے پر وہ بے ہوش ہوتی ہے اور سولہ گھنٹے بعد ہوش آتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کے پاس ہوتے ہیں اور وہاں اسے علم ہوتا ہے کہ وہ کینسر جیسے مرضی میں مبتلا ہے اور اس کے پاس فقط سات مہینے باقی ہیں، وہ اپنا علاج کروانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا اندر مردہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے پاپا اسے پرائیویٹ جیٹ میں واپس لاتے ہیں اور

مکمل ناول

PakiBooks.Site



انکالپت

ہدی اپنی آؤی کار میں بیٹھی گاڑی تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے لوگوں کی گالیاں سننے کا نوویشن کی تقریب میں پہنچتی ہے۔ ہدی بے حد امیر باپ کی بے حد غریبی، بے حد فیشن ایبل اور کافی حد تک فصول لڑکی ہے جسے خود نمائی کا شوق ہے۔

اس کا کلاس فیلو لائم اس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاؤ کرتا ہے۔ اس کی دولت پر طنز کرتا ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ مجھے بد نصیب سمجھنے کے باوجود جو تم چاہتے ہو کہ میری جگہ تم ہوتے۔

کانوویشن میں وہ تصویریں کھینچواتی ہے، ڈگری لیتی ہے۔ جب وہ ٹویہاں اچھا ل کر تصویر کھینچتا ہے ہوتے ہیں تو ہدی لڑکھڑاتی ہے اور نیچے گر جاتی ہے۔ تین سے چار بار اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے، وہ اچانک بے ہوش ہو جاتی ہے۔ آخری بار یورابورا جانے پر وہ بے ہوش ہوتی ہے اور سولہ گھنٹے بعد ہوش آتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کے پاس ہوتے ہیں اور وہاں اسے علم ہوتا ہے کہ وہ کینسر جیسے مرض میں مبتلا ہے اور اس کے پاس فقط سات مہینے باقی ہیں تو وہ اپنا علاج کروانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا اندر مردہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے پاپا اسے پرائیویٹ جیٹ میں واپس لاتے ہیں وہ

مکمل ناول

PakiBooks.Site



بے حد کم ہمت ہو چکی ہے اور اس کا وزن تیزی سے گر رہا ہے۔

ایک روز اسے اپنے کمرے میں ایک بچی دکھائی دیتی ہے جو اسے پھول دیتی ہے۔ اس بچی کا نام شیلے ہے۔ وہی بچی بعد میں اسے ہسپتال میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں اسے علم ہوتا ہے کہ شیلے چھ سال کی بچی تھی جو تیم خانے سے اٹھارہ سال پہلے اپنے کینسر کے علاج کے لیے آئی تھی۔ وہاں اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچی اکثر کینسر کے مریضوں کو دکھائی دیتی ہے اور لوگ اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ مگر آ کر وہ پھر سے ڈپریشن ہو جاتی ہے اور تب ہی اسے فرشتہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ فرشتہ اسے دیسا کی کہانی سناتا ہے، دیسا نے کوڑھ کی بیماری ہوئی۔

دیسا پاپے کی بے تحاشا لاڈلی، بے حد ذہین، کسی حد تک بدتمیز، سارا وقت اچھل کود، لڑائی جھگڑاؤں اور لوگوں کو کائنات میں اپنا وقت گزارتی ہے۔

اس کے والد اس سے وعدہ لیتے ہیں کہ وہ نیچے گھاٹی میں کبھی نہیں جائے گی۔ گھاٹی میں کوڑھ کے مریض رہتے ہیں جس کی

کو کوڑھ ہوتا ہے، اس کے گھر والے اسے وہاں چھوڑ آتے ہیں تاکہ دوسرے محفوظ رہ سکیں۔

پاپ بچی گھاٹی کی چوٹی پر بیٹھتے ہوتے ہیں اور والد اسے کہتے ہیں کہ وہ کاٹنا چھوڑ دے، تب ہی دور سے گھنٹیوں کی

آواز آتی ہے اور پاپ دیسا کو چادر میں چھپا لیتا ہے کیونکہ کوڑھی خیروں میں گھنٹیاں باندھتے ہیں اور اس کوڑھی بوڑھی سے

کہتا ہے کہ وہ اس علاقے سے دور ہے۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا تب بوڑھی کہتی ہے کہ اس کے والد بھی اس سے بے

پتاویہ کر گئے تھے۔

ایک روز خرطوم اسی کوڑھی بڑھیا کو پتھر مارتا ہے۔ دیسا اسے بچانے کی کوشش کرتی ہے اور خرطوم کو مارتی ہے جو ابادہ

اسے کوڑھی ہو جانے کی بددعا دیتا ہے۔

دورین کی شادی میں دیسا بہت جج سنور کر آئی ہے۔ سب کی نظریں اسی پر مرکوز ہیں تب ہی ایک دانا عورت کی نظر

اس پر پڑتی ہے۔ وہ اس کی کلائی سے کپڑا ہٹاتی ہے۔ کلائی پر سفید دھبہ دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ دیسا کو کوڑھ ہو چکا ہے۔

اب آگے پڑھیے۔

دوسری اور آخری قسط

دیسا نے ابدا کچھ بچھا کرتی ایک گہری سانس لی۔

دانا عورت کی آواز، وہاں موجود ہر ذی روح

کی سماعت تک پہنچ چکی تھی۔ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہرا

ہوتا دولہا تک چونک کر سیدھا ہو چکا تھا۔ جتنے لوگ

اس کے قریب کھڑے تھے، اس کی سہیلیاں، شادی

میں شریک دوسری لڑکیاں، عورتیں اور کچھ بچے، دو

بچیاں تو اس کے لباس کے کونوں کے ساتھ کھیل رہی

تھیں، وہ تک بدک کر پیچھے ہٹ چکی تھیں۔

ایک لمحہ لگا..... اور وہ پھر دنیا میں اکیلی رہ گئی۔

اس نے اپنی دودھیا کلائی سے ریشم سر کاٹا اور

اسے اوپر تک سر کاٹی چلی گئی۔ وہ ان دھبوں کو دیکھنا

چاہتی تھی، جو کھڑے کھڑے اسے نامراد بنا گئے

تھے۔ وہ چند دن پہلے بھی انہیں دیکھ چکی تھی لیکن وہ فکر

مند نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو بھول بھی گئی تھی کہ اس کے

جسم پر کہیں کوئی نشان موجود ہے..... ایک کے بعد

اس نے دوسرے بازو سے ریشم سر کاٹا..... سب اسے

دیکھ رہے تھے۔

”بد بخت! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ دوں گی،

میری دیسا کو تو نے کوڑھی کہا۔“ کہیں بہت پیچھے

سے ماں بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ ماں نے اس عورت

کے منہ پر ہاتھ کا پنجا ایسے مارا تھا جیسے اس کی کھال

ادھیڑ لے گئی۔ عورت تکلف سے بلبلا اٹھی، لیکن ماں

نے اپنی گرفت ڈھیل نہیں کی تھی۔ وہ بار بار کہتی تھی۔

”میں تیرا منہ نوچ لوں گی، میری دیسا کو

کوڑھی کہہ۔

”میرا دست تو پٹنے کے بجائے اپنی بد بختی اور لاد
کات نورج پاگل عورت۔ اس پر خدا کی پھٹکار پڑ
چکی ہے۔“

سائنس لیختی دیرسا، دل دھڑکاؤ دیرسا۔ اس
نے تکلیف کا ایسا گھوٹ بھرا کہ اس کی روح بلبلا
اٹھی۔

”خدا کی پھٹکار۔“ وہ زریب بڑبڑایا۔
”میں کرکڑی میاں، کھڑی ٹکڑی روٹی، گرنے لگی
ٹھکی سارے کے لیے کوئی ٹھیک بڑھا تھا۔ گرنے

سے جسے کیا کوشش میں ہاتھ روٹنے کے علاوہ
نکریا۔ آگ نے اس کے ریشم پر اپنی پنہاری
چھوڑی اور بجھ گئی، ریشم چکا گیا۔ وہ ساری کی ساری
جل گئی۔

”اس پر خدا کی لعنت پڑ چکی ہے۔ لٹتی ہے
یہ۔“ دیرسانے یہ لفظ بہت بار سنے تھے۔ آج جتنا بار
اپنے لیے سنے تھے۔

”بد نصیب عورت! کیسی اولاد پیدا کی ہے تو
نے جس نے خدا کے عذاب کو دعوت دی ہے۔
کوڑھی ہو چکی ہے یہ فرشتے اس پر لعنت بھیج رہے

ہیں۔ خدا سے فداقت کا ڈھیر بڑا چکا ہے۔ دُور ہو جاؤ
سب اس سے، کہیں تم بھی خدا کے عذاب کے مستحق
نہ ٹھہرائے جاؤ۔ اس پر بھیجی جانے والی لعنت کے

چھینے ہم پر بھی نہ پڑ جائیں۔ اس کے پاؤں جسم،
گندی روح کا خیاں نہ ہم سب کی جانوں پر بھی نہ
آجائے۔“

جو پہلے ہی اس سے دُور ہو چکی تھیں، وہ منہ پر
ہاتھ رکھ کر اور دُور ہونے لگی تھیں۔ خولہ اور دورین۔
وہ سسک رہی تھیں اور منہ ڈھانپ رہی تھیں۔ اس

نے گردن کھما کر دیکھا، وہ اس سے دُور بہت دُور،
پرتی جا رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایک دم سے نم ہو
گئیں۔ وہ بھی روئی نہیں تھی۔ لیکن۔ لیکن اب
اس کا پیچھا کہ وہ اتنا روئے کہ سارے جہاں کو

اپنے آنسوؤں میں ڈبو رہا ہے۔

”توبہ توبہ! کچھ ٹوبہ اسے۔ یہ لڑکی تم پر
عذاب لانے والی ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا
سکتیں۔ مجھے یہ شہر اس بد بختی کی جہد سے بڑا ہونا

دکھائی دے رہا ہے۔ اس سیاہ کار کے گناہ کا عذاب
بہت جلد اس شہر پر کالی آنکھیں بن کر، ہر جان
پر بھاری پڑنے والا ہے۔ سب مل کر توبہ کرو۔ اگر تم

نے توبہ نہ کی تو ایک ایک کر کے تم سب کوڑھی ہو جاؤ
گے۔ اپنے گناہوں کے لیے روؤ، گڑگڑاؤ اور
کوڑھ سے بڑا مانگو۔ اس کے گناہ کا خدائی قہر ہم

سب کے سروں پر منڈلانے لگا ہے۔ اے خدا

ہمیں اپنی پتا دیرسا رکھ۔ اے خدا۔“
ماں اپنے ہوش کھو رہی تھی۔ بچوں کے ساتھ
کھینچا اس کا بھائی، وہ اپنا کھیل چھوڑ کر ماں کا پلو کھینچ

”ماں! وہاری دیرسا کوڑھی ہو گئی، ماں؟ ماں؟
کیا ہاری دیرسا۔ ماں؟“

سفید ریشم ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ ماں سے
جواب نہ پا کر وہ اس کی طرف آیا تھا۔
”دیرسا۔ دیرسا۔“ وہ رونے لگا تھا۔ اس

کا ہاتھ کھینچ کر رہا تھا۔
اس نے اپنا کوڑھی ہاتھ بھائی سے الگ کیا۔ وہ
اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے گال بوچھا چاہتی تھی۔

جھک کر اس کا منہ چومنا چاہتی تھی۔ لیکن اب وہ یہ نہیں
کر سکتی تھی کیونکہ اب تو وہ کوڑھی ہو چکی تھی کیونکہ
..... کیونکہ۔ اب وہ صرف دیرسا نہیں رہی تھی۔

”دیرسا۔ بولو نا۔ والد کی جان، بولو
نا۔“ وہ سسک رہا تھا۔

والد کی جان۔ اب ان کی جان لینے والی
تھی۔
”دیرسا۔ میری پیاری دیرسا۔“ اس کا

رونا کتنی جلدی ہتھکیوں میں بدل چکا تھا۔ بے چارہ
کوڑھ سے کیسا خوف زدہ تھا۔

”ہاں..... میں کوڑھی ہو چکی ہوں۔“ سارا شہر جو کبھی اس کی جرأت کا گواہ رہا تھا، اس وقت اس کی ”بزدلی“ کا گواہ ہوا تھا۔ اس کی کپکپاتی کم زور آواز نے اس کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چٹان حوصلے مسمار ہونے لگے تھے۔

”دبسا..... دبسا.....“ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو دبسا ہے۔ وہ کوڑھی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ اس کی بہن ہے۔ والد کی لاڈلی ہے۔ حسن کی دیوی ہے۔ وادی کا پرندہ ہے۔ زمین کا پھول ہے..... وہ کیسے..... وہ کیسے..... لیکن اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ اس کے نام کی تکرار کے جا رہا تھا۔ پھر وہ اس سے لپٹ گیا۔ وہ چھوٹا تھا لیکن کوڑھ اور کوڑھی کے نصیب سے اچھی طرح سے واقف تھا۔

وہ رو رہا تھا کہ شاید یہ نصیب بدل جائے۔ اس کی دبسا کوڑھی نہ رہے۔ دونوں بازوؤں سے اسے تھام کر وہ یہ تسلی کر رہا تھا کہ اس کی دبسا کہیں جانے والی نہیں..... کہیں نہیں..... گھاٹیوں پر خدا کا قہر برے، آسمان کی بجلی گرے۔ اس کی دبسا..... اس کی دبسا..... وہاں کیوں جائے..... زمین دلدل ہو، اور گھاٹیاں اس میں غرق ہوں، اس کی دبسا..... اس کی دبسا۔

دبسانے اسے خود سے الگ کیا اور کہا کہ وہ ماں کو سہارا دے اور گھر لے جائے۔ لیکن اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ وہ پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ پھیلی سے اپنی آنکھیں رگڑتا جاتا تھا شدت سے ہچکیاں بھر رہا تھا..... اس نے ماں کو سہارا دے کر کھڑا کرنے کے بجائے شادی کے گھر سے دور بھاگ جانا چاہا..... والد کے پاس۔

”بابا..... ہماری دبسا..... وہ..... ہماری دبسا.....“ شہر کی گلیوں میں بھاگتے، باپ کو پکارتے، دبسا پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر دیتے، وہ اپنے نم پردہائی چٹا سر پٹ بھاگتا جا رہا تھا۔

اس رات، سارے شہر نے ”ہماری دبسا، ہماری دبسا“ کی پکار سنی تھی۔ اس رات پورا آسمان گواہ بنا تھا کہ جب وہ زمین والوں پر گرتا ہے تو کیسا حشر برپا ہوتا ہے۔ اس رات زمین نے اپنی جڑیں کھوکھلی کر کے جانا کہ جب وہ خود کو تنگ کرتی ہے تو زمین والوں پر کیا گزرتی ہے۔

شادی کی تقریب میں یونانی حسن کی دیوی..... دبسا..... کھڑے کھڑے کوڑھی ہو چکی تھی۔ ☆☆☆

”اسے کوڑھ نہیں ہے۔ اس عورت کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ والد کے لہجے میں ایسی تندی اور سختی تھی کہ شہر کے معززین نے سہم کر پہلو بدلے تھے۔ وہ خائف ضرور ہوئے تھے لیکن ارادے کے پکے تھے۔

وہ سب مل کر والد کو یہ یاد دلانے آئے تھے کہ جلد سے جلد دبسا کو گھر اور شہر سے نکال دیا جائے۔ ہوائی جلدی نہیں پھیلتی، جتنی جلدی یہ بیماری پھیلتی ہے۔ اس لیے وہ ”بیماری“ کو اس کی اصل جگہ روانہ کریں۔ ”ہم اندھے تو نہیں ہیں۔“ ایک نے تنفر سے کہا۔ وہ اس انسان کی کم عقلی پر حیران ہوا تھا۔

”اندھے ہو یا بہرے، میں نے کہہ دیا ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، میری دبسا کا نام لیا تو میں زبانیں کاٹ لوں گا۔“

”کس کس کی زبان کاٹو گے؟ کب تک کاٹو گے؟ تمہیں لگتا ہے کہ تم اس کا کوڑھ چھپا کر رکھ لو گے؟ یہ ناسور ہم یہاں اپنی بستیوں میں پھیلنے دیں گے؟ کس لیے؟ سارے شہر میں وبا پھیل جائے گی۔ تم چاہتے ہو کہ سارا شہر کوڑھی ہو کر مرے۔“

”اسے یہ بیماری نہیں ہے تو وبا کیسے پھیلے گی.....“ وہ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہے تھے۔

”تم کسے دھوکا دے رہے ہو؟ خود کو یا ہمیں؟ ٹھیک ہے تو بلاؤ پھر دبسا کو..... ہم خود دیکھ لیتے ہیں۔“

اس کے حسن کے کن کا تھا، اس کے گناہ کے گناہوں
 دے رہا تھا۔ اس کی شرارتوں سے منہ مڑا تھا۔ وہ
 اس کی دھوکے سے لیر مفلوج ہو لے گا تھا۔ وہ
 اسے قتل و شہر کی دیوی کا لقب دیتے تھے۔ وہ
 اسے گناہوں کی پٹلی کہہ رہے تھے۔ لایاں اس کی
 چراگت پر لگا رہیں۔ وہ لایاں اس کے سامنے
 بچ کر ادا کر رہی ہیں۔

ایک لڑکا..... اور سب قسم ہو گیا.....
 دنیا کی کوئی طاقت اس کے کام نہیں آگئی
 تھی۔ جب باپ کا اختیار، ماں کا پیار ہی کسی کام کا
 نہیں رہا تھا، تو باقی دنیا کی کیا حیثیت تھی؟ اسے کوئی
 نہیں بچا سکتا تھا تو پھر کون بچا سکتا تھا؟ اصل طاقت
 در کون تھا؟ کس کے پاس تھا ہر جان کی تقدیر کا
 اختیار؟

☆☆☆

والد اتار دئے تھے کہ وہ ان کی طرف دیکھتی
 تھی تو اسے اپنے گناہ کا رہونے کا یقین ہو جاتا
 تھا۔ وہ جو والد کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی، ان کے لیے
 انکار دہن بن چکی تھی۔ گھر کی ایسی حالت تھی جیسے وہاں
 ایک ساتھ کئی لوگ مر چکے ہوں۔ ان کی منتیں مل
 پڑی ہوں اور کوئی دفنانے کی ہمت نہ کرتا ہو۔
 ”میں آج رات تمہیں یہاں سے لے کر کل
 جاؤں گا۔ ہم کہیں اور جا کر رہیں گے۔“ اس کے
 ہاتھ چومتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے۔
 ”اور ماں؟“

”تمہاری ماں کمزور نہیں ہے، وہ اکیلی رہ سکتی
 ہے۔ ہم ویرانوں میں رہ لیں گے ویسا! لیکن یہاں
 نہیں رہیں گے۔“

”ویرانوں میں ہی رہنا ہے تو..... تو.....
 والد..... مجھے وہیں جانے دیں جہاں.....“
 ”تمہیں اپنے باپ کی جان کی قسم ہے ویسا!
 تمہیں میری قسم ہے میری آنکھوں کے نور.....“
 روتے روتے ہلکان ہو چکے تھے۔
 ”یہ نہ کہنا، کبھی نہ کہنا۔ میں کیسے سہوں گا۔ ہم

بڑا دے رہے تھے۔
 ”میں کوئی اپنے شہر کی حدود میں کبھی نہیں
 دے گا۔ اپنے لیے زندگی کو بھڑا نہ بناؤ۔“ کہہ رہے وہ
 کرو۔ لہجہ..... لہجہ..... لہجہ.....
 لے لی اس بے لوث سچ دی تو تمہارا دل کیوں ٹھہرا رہا
 رہا ہے۔ یاد رکھو کہ خدا اپنے بندوں سے بہت پیار
 کرتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی بے بدلتی پہنچتا ہے تو وہ
 انسان اسی بدلتی کا شق ہوتا ہے۔ کڑھ ہی.....
 بدلتی کی نشانی ہے۔ تمہیں اپنے بد بخت انسان سے
 دل نہیں لگانا چاہیے۔ تو یہ کرو..... خدا سے اپنے
 گناہوں کی معافی مانگو..... معافی مانگو کہ وہ تمہیں
 معاف کر دے جو ایسی گناہ کا رہی کہ باپ بنے۔“
 ”یہ اس بند کرو اپنی، میں تمہارا منہ توڑ دوں
 گا۔“ وہ چلا اٹھے تھے۔ گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر ان
 پر پھینکے گئے تھے۔

وہ اوٹ میں کھڑی، سب دیکھ اور سن رہی تھی۔
 والد دیوانے ہو چکے تھے۔ ماں کی کل رات سے عجیب
 حالت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بحرِ مراد سے اپنی
 سانسوں کی ڈور ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ گھر میں دو پیار،
 والد اور والدہ اور ایک روکی، ویسا موجود تھے۔ لیکن ان
 پیاروں کی پیار پر ہی کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔
 یہ وہ پیاری تھی، جس کی حیات گرنے والوں کو
 بھی بد بخت سمجھا جاتا ہے۔ ایسی دلہیز بھی پار نہیں کی
 جاسکتی۔ جہاں کوئی کوڑھی رہتا ہو۔ اس کی سہیلیاں
 تک نہیں آتی تھیں۔ آس پاس کے مسائے اپنا گھر
 بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جب تک ویسا گھائیوں
 میں نہیں چلی جاتی تھی، وہ اپنے گھروں میں واپس
 آنے والے نہیں تھے۔

کل سورج غروب ہوا تھا تو سب کچھ لٹک تھا،
 آج کا سورج طلوع ہونے سے پہلے سب کچھ ختم ہو
 چکا تھا۔ اس کی خوش قسمتی، بد بختی میں بدل چکی تھی۔
 اس کا حسن کریمہ ہو چکا تھا..... نام ”کوڑھی“ اور
 وجود.....

رات کے تین پہر ہی بیتے تھے کہ سارا شہر جو

یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں تمہارے لیے کوڑھی کا لفظ نہیں سن سکتا۔ میرا جی چاہتا ہے میں اپنے کانوں میں سیسہ انڈیل لوں۔ اپنے باپ پر رحم کرو دیسا! ضد نہ کرنا، بس میں جو کہوں وہ کر لیتا۔“

”آپ خود کو بلکان کر رہے ہیں والد! مجھے اب اس زمین پر نہیں پناہ نہیں ملے گی۔“

”پھر میں تمہارے لیے آسمانوں میں پناہ ڈھونڈ لوں گا۔“ باپ کی ایسی بات نے دیسا کا دل کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

”میرے ساتھ رہ کر آپ بھی اس بیماری سے نہیں بچ سکیں گے۔“

”تمہارا باپ اس بیماری سے ڈرے گا؟ جو خوف تھا وہ تو پورا ہو گیا۔ اب اس بیماری سے کیا ڈرنا دیسا۔“

”پھر اس بیماری کے نصیب سے بھی نہ ڈریں والد! میں لعنت کی مستحق تھی، مجھے لعنت مل گئی۔ میں جہاں بھی جاؤں گی، میرے ساتھ یہی ہو گا۔ مجھے بد بخت کہا جائے گا، خدائی عذاب کا طوق سمجھا جائے گا۔ مجھے پتھر مارے جائیں گے۔ میری پیشانی دیکھیں، اس پر روشن چاند گرہن کھا چکا ہے۔“

میری آنکھیں دیکھیں، یہ اپنا نصیب پڑھ چکی ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ لوگ خدا سے محبت کرنا تو چھوڑ سکتے ہیں لیکن کوڑھی سے نفرت کرنا نہیں۔ جسے خدا دھک مارے، اسے دنیا بھی ضرور ہی دھکارتی ہے۔ ضد نہ کریں۔ اپنے حصے کی بد بختی مجھے بھگت لینے دیں۔“

”خدا میری دیسا پر لعنت کیسے بھیج سکتا ہے۔“ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

”اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بڑھ کر آپ کے آنسو نہیں پونچھے تھے، ان کے ہاتھ کی پشت اتنا ہند ماتھا۔ اس نے دنیا کو خود سے دور کرنے کی غلطی اپنے باپ سے کی تھی۔ اس نے ان سے غلطی نہ کر لیا تھا۔“

”دروازہ کھول لعتی کے باپ۔۔۔۔۔ دروازہ کھول۔۔۔۔۔“ گھر کے باہر شور اٹھا تھا۔ شام گہری تھی، رات ہونے ہی والی تھی۔ ماں بے چاری نے گھر میں روشنی بھی نہیں کی تھی۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر اپنے شوہر کے آنسو ہی پونچھ دیتی، روشنی کا انتظام کیسے کرتی۔ اس کا تو بس یہی جی چاہتا تھا کہ بستر پر پڑے پڑے مر جائے۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کرے تو دوبارہ کھول نہ سکے۔۔۔۔۔

”کیا لینے آئے ہو یہاں۔۔۔۔۔؟“ وہ دروازے کے سوراخوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ وہاں ایک عالم کھڑا تھا۔

”بہت سن لی ہے ہم نے تمہاری۔ نکالو اسے باہر اور خود بھی نکلو۔“ فتح ہو جاؤ یہاں سے۔ اپنی بد نصیبی میں ہمیں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔ شہر پر عذاب آنے لگا ہے۔ ہم نے اپنے رب کی حکم عدولی کی ہے۔ شہر میں آگ لگنا شروع ہو چکی ہے، صید کا گھر شعلوں سے بھڑک رہا ہے۔ ہم نے ایک سیاہ کار کو پناہ دے رکھی ہے۔ سارا شہر جل کر راکھ ہو جائے گا۔ جس سے خدا بے زار ہو چکا ہو، ہم اس سے لگاؤ نہیں رکھ سکتے۔ پاگل انسان، اپنی دوسری آل اولاد کے بارے میں سوچ۔ تو چاہتا ہے کہ ان سب پر بھی عذاب آئے۔“

”اپنی مصیبتوں کا الزام تم میری بیٹی پر کیسے لگا سکتے ہو کم عقلو۔۔۔۔۔“ والد سکے۔

”دروازہ کھول دو، ورنہ ہم تو ڈریں گے۔ تمہارا بہت لحاظ کیا ہے ہم نے۔ رات تک ہم پر نجانے کتنی اور مصیبتیں آچکی ہوں گی۔ ہم خدا کو اور ناراض نہیں کر سکتے۔“

”باپ کے دل پر وار کر کے تم خدا کو راضی نہیں کر سکتے۔ تو ڈرو دروازہ۔ میں اسے کھول کر اپنی بیٹی کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔۔۔۔۔“ وہ لپک کر دیسا کے قریب آئے۔

دروازے پر دھکے مارے جانے لگے تھے۔ بستر سے نکل کر کئی پڑتی ماں یہ منظر دیکھ کر پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسے رونے کے سوا کوئی چارہ بچا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اتنی بے بس تھی کہ خود کو جھوٹی تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔ والد جلدی جلدی چند ضروری چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ وہ اسے اپنے ساتھ شہر سے باہر لے جانا چاہتے تھے۔

”ہم جھپٹی دیوار کو دگر نکل جائیں گے۔“ وہ اس کا ہاتھ کھینچ رہے تھے۔ وہ دیوار کی طرح بھی نہ بٹنے کے لیے کھڑی تھی۔

”نہیں والد! یہ ہجرت ہمیں اس نہیں آئے گی۔ مجھے بھی وہی بھگتنا ہو گا، جو شہر کے دوسرے کوڑھی بھگت رہے ہیں۔“

”اپنی زبان کاٹ لو دیسا! میرے سامنے خود کو کوڑھی نہ کہو۔“

اس نے اپنے باپ کی بے پناہ محبت کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ اس شدت کی محبت اس کے باپ کی ہے تو۔۔۔ تو۔۔۔ خدا اس سے کیسے نفرت کر سکتا ہے۔۔۔ وہ کیسے اسے دھتکار سکتا ہے۔۔۔

شدت غم سے کانپتے والد کے وجود میں الاؤ دہک رہے تھے۔ رات ہی رات میں، نہ جانے کسے ان کی ساری داڑھی سفید ہو چکی تھی۔ سیاہ پال تھے بھی تو وہ ردپوش ہو چکے تھے۔ ماں کی حالت پر حشر پاتا تھا۔ ایک ہی رات میں، جھوٹے بھائی نے بڑھاپے کی چال سیکھ لی تھی۔ گھر کی سانس، باس دینے لگی تھی۔

گھر کے دروازے پر پتھر پڑ رہے تھے۔ باپ نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ اسے جھپٹی دیوار تک لے جانا چاہتے تھے۔ وہ اسے ساری دنیا سے چھپا لیتا چاہتے تھے۔ تنگ ہو چکی زمین سے بلند کر کے، وہ اسے کھلے آسمان پر اٹھا لے جانا چاہتے تھے۔ کہ۔۔۔ کہ دیسا نے اپنا ہاتھ ان سے آزاد کر دیا۔ اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

”میں جاری ہوں۔ والد کے گھر پر پتھر نہ برسائیں۔“ چونکٹ کے درمیان میں کھڑے ہو کر اس نے اطمینان سے کہا۔

”تمہارا باپ انہی چمچوں کی نیکیاں کھتا ہے۔“ کسی نے خیر یہ کہا۔

”وہ نا سمجھ ہیں، آپ جیسے سمجھنا چاہتے ہیں کیا مقابلہ نہ کر لیں، میری بہت ساری کوئی عذاب نہیں آئے گا۔ لعنت کا فیصلہ نہیں ہے، اس طوق کا عذاب بھگتنے میں جاری ہو چکا ہے۔ کوڑھی ہو چکی ہوں اور کوڑھی بن کر رہنے کے لیے بھی تیار ہوں۔“

بد بخت دیسا۔

لعنتی دیسا۔

نا پاک دیسا۔

☆☆☆

بد بخت۔۔۔ لعنتی۔۔۔ ناپاک۔

ہڈی نے زیر لب یہ نام دہرائے تھے زمین پر اترا کر چلتے ہوئے اسے بھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اسی زمین پر کسی کو ذلت سے ٹھیکر گیا ہے اس کے حصے میں جتنا سکھ آیا ہے، اس سے کتنی زیادہ ماضی کے انسان کے حصے میں عذاب آیا ہے۔

وہ چپٹی ہوئی آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ بکھرا تھا۔ اسے لفظ لعنت سے سخت نفرت تھی۔ اسکول میں اس کی کھانسی لڑائی ایسی ایک لفظ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ ٹرائل کلاس بڑھ گئی تھی کہ اسے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی کھانسی فیو کے گھر پہنچ گئی تھی۔ شام کو کھیتے کے لیے وہ پارک آئی تو اس نے مار مار کر اس کا حشر خراب کر دیا تھا۔ وہ پڑا اسکول کا بورڈ، اس بچی کے والدین، سب جڑا ہے کہ وہ اتنی تنگ دہندہ کیوں ہو رہی ہے۔ گھر کے اسے اتنا بھڑکا دیا ہے۔

لعنت۔۔۔ کبھی بار شیطان پر بھیجی گئی تھی۔ اس لفظ کا مستحق قرار پایا تھا۔ انسان اپنے لیے اس لفظ کے طوق پر بلبلا اٹھتا ہے۔

”انہوں نے دیسا کو کھنسی کہا؟“ وہ زور سے پوچھ رہی تھی۔

تھے۔ ایک ایک کر کے اس نے ان سب لوگوں کو جو اس کی بیماری کا سن کر پریشان ہوئے تھے، کال کی، ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اسے خدا کے عذاب کی گالی دینے سے باز رہے تھے۔

رات اسی طرح گزر گئی..... نئے دن کا سورج اس نے جھیل کے کنارے سے ابھرتے ہوئے دیکھا۔ وہ جاگ گئی تھی..... نیند سے بیدار ہو چکی تھی۔

غفلت خوبی نہیں، اور جاہلیت نیکی نہیں۔ یقین کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہوں تو، بے یقینی کی دلدل میں گرنا ضروری نہیں۔ ہر چیز، ہر کیفیت نے اپنے معنی بدل دیے تھے۔ وہ پھول جو شیلے نے دیے تھے، وہ پھول جو فرشتے کے ہاتھ میں رہے تھے، وہ اس نے بہت محبت سے تھام کر اپنے سینے سے لگا لیے تھے۔ زندگی کسی بیماری، معذروں، تکلیف، مصیبت، پریشانی، روگ پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ تب ہی تو یہ شروع ہوتی ہے۔ انسان کو کوئی چیز مٹی سے سونا، سونے سے ہیرا، اور ہیرے سے کوہ نور نہیں بناتی جتنی جلدی تکلیف بناتی ہے۔

”اگر کوئی بیماری لعنت رہی ہے، تو کیا کبھی کوئی بیماری نعمت بھی رہی ہے؟“ وہ فرشتے سے پوچھ رہی تھی۔

”بیماری ہر حال میں نعمت ہوتی ہے۔ ہر کیفیت اور ہر احساس میں۔ وہ کتنی ہی معمولی، بے ضرر اور مختصر دورانیے کی کیوں نہ ہو۔ تکلیف ہر حال میں نفع ہے۔ گناہ گار کو ہوتو بھی، مومن کو ہوتو بھی، یہ ہر حال میں اللہ کی رحمت کا ذریعہ ہے۔ اللہ کی رحمت کے سب سے زیادہ قریب ”بیمار“ ہوتا ہے۔ وہ جسمانی بیمار ہو، ذہنی، روحانی، جذباتی یا دینی..... وہ اللہ کی محبت اور توجہ کا سب سے زیادہ مستحق قرار پاتا ہے۔ بیمار..... اللہ کی لعنت نہیں اللہ کی رحمتوں کے سایے میں رہتا ہے۔

☆☆☆

”مادی چیزیں ہاتھ سے نکل جائیں تو دوبارہ

ہاں..... کیونکہ سب کا ماننا تھا کہ یہ بیماری

لعنت ہے.....“ کیا کوئی بیماری اپنے ساتھ لعنت بھی لاسکتی ہے؟“ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”کوڑھ لائی تھی..... لعنت، ملامت، تہمت، دھکار..... انسانوں کی نفرت کا عذاب..... ذلت، تنہائی اور بدنامی.....“

اس کی آنکھیں اتنی نم ہو گئیں کہ فرشتہ ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے آج تک کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ وہ کتنی لعنتوں سے محفوظ رہی ہے۔ کتنی رحمتیں ہیں جو اس زمانے کے انسان کے لیے رحمتوں میں بدل دی گئی ہیں۔ کاٹنا چھینے پر بلبلانے والے انسان نے کبھی جاننا ہی نہیں چاہا کہ کتنے ہی کانٹے اس کی راہ سے پہلے ہی چن لیے گئے ہیں۔

شیشے کی کرچیوں کا ڈھیر سمیٹا جا چکا تھا۔ ماما، پاپا اس کے پاگل پن سے پریشان تھے۔ وہ ان کے پاس گئی اور اس نے باری باری دونوں کے ہاتھ چومے۔ وہ بھی ان کی محبت، ان کی فکر، ان کی موجودگی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ یہ بھی جان ہی نہیں پاتی تھی کہ انسان پر سب سے پہلا اور عظیم احسان ماں باپ کی صورت میں کیا گیا ہے۔ باپ کی شفقت اور ماں کی محبت، کسی نعمت کو ان دو نعمتوں کے برابر کا درجہ نہیں دیا گیا۔

”تم اپنے ساتھ کیا کرنے جا رہی تھیں پڑی؟“ ماما رو رہی تھیں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو پونچھنے لگی تھی۔

”میں کم عقل ہوں اور جلد باز بھی.....؟“ وہ مسکراتی تھی۔

فون لے کر اس نے اپنی فرینڈز کو کالز کرنا شروع کر دی تھیں۔ وہ سب اس کی بیماری کا سن کر ہما کی چلی آئی تھیں۔ وہ اس کے لیے خوش آمدیدی لائی تھیں، لعنت نہیں۔ پھر وہ اپنے کلاس فیلوز اور لائٹ سے بات کرنے لگی، جن کے ہاتھ پتھروں سے خالی

ماصل کی پانکھی اس لیکن صرف ایک چمچ ایسا ہے۔
 وہ ہمارے جی ماصل نہیں کی پانکھی۔۔۔۔۔ اور وہ
 ہے "زندگی"۔ (اسٹیو جانز)
 اس نے سیدہ ایشلی احوالی شرت پائی تھی۔
 جبر اور کیڑا اس شور۔ ہال میں کر کے اس نے اوپن
 پر کی بنائی تھی۔ ماما اس کے ساتھ آتا تھا، تھیں لیکن
 اس نے کہا کہ وہ اپنی چلی جائے گی۔ کسی سے
 آتے ہوئے، اس نے پھولوں کی دکان سے پھول
 کے لیے پھول بھی لیے تھے۔ شاید تو اسے نہیں ملے
 کی، لیکن شاید بھی بہت سی چھپاں ہا کھل میں داخل
 تھیں۔

"میں ٹریڈنٹ شروع کروانا چاہتی ہوں۔"
 بچوں سے ملنے کے بعد وہ ڈاکٹر کے پاس آئی تھی۔
 ڈاکٹر خوش تھا اور جبر ان بھی۔
 "میں پوچھ سکتا ہوں کہ کس چیز نے تمہارے
 ارادے (ہٹ دھری) کو اپنا تک سے بدل دیا؟"
 بندہ ڈاکٹر ہی کیوں نہ ہو، فطرت سے مجبور ہو کر طنز کر
 لی جاتا ہے۔ وہ اس کا ہ انارو یہ نہیں بھولا تھا۔
 "بہت ساری ایسی چیزوں نے جن کے
 احساس سے تو میں واقف ہوں لیکن نام سے نہیں۔
 مجھے ایسی بیماری ہوئی ہے جس کی دوا اور علاج،
 دلوں موجود ہیں۔ یہ بھی نعمتوں میں سے ایک نعمت
 ہے۔ مجھے ناشکری نہیں کرنا چاہیے۔ امت کرنی
 چاہیے۔"

ڈاکٹر کی آنکھیں حیرت سے داؤدی تھیں۔
 "تم نے بہت گہری بات کہہ دی ہے۔"
 (کہاں سے پڑھ کر آرہی ہو؟)

"اگر یہ زندگی مجھے اس لیے دی گئی ہے کہ میں
 اس بیماری سے لاؤں تو میں ضرور لاؤں گی۔ اگر
 پتا اس میرے ہاتھ میں دی گئی ہے کہ میں اس سے
 ہار جاؤں، پتا اسے جیت جانے دوں تو میں۔۔۔۔۔ تو میں
 پتا اس میں "کلاست" لینا پسند نہیں کروں گی۔"
 کل کرسی الٹ کر چالے والی لڑکی، آج کرسی
 پر ٹیسی ہار اور جیت کی ہاتھیں کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کو اگلی

بات کرنے کے لیے الفاظ "تو پھر تمہارے لئے نہیں تھا۔"
 "تم میں آئے والی یہ بیماری ان لوگوں سے ملتی ہے۔"
 اس نے تہہ بہہ اگلی۔

"تو پھر تمہارے لئے نہیں تھا۔" ڈاکٹر انہیں تارہوں میں
 لافٹ ایک (پائیں جو بالی عمارت کریں)۔ اس نے
 ہاتھ کاٹکا ہانپا اور اسے ہوا میں اٹا۔ "مجھے کہہ دو
 بھییں۔۔۔۔۔ میں چاہوں تو پہلے راولپنڈی سے
 تاک آؤں کر سکتی ہوں۔ ویسے کیا مجھے پینے کے لیے
 ہاکنک کا روپ دیے جائیں گے۔۔۔۔۔ میں ٹک کرے
 کے لیے لکلی دانت، وغیرہ، وغیرہ؟" ڈاکٹر کا تہہ
 ہے ساختہ تھا۔

"دیئے تو نہیں جاتے، لیکن تمہارے لیے نکھار
 لیں گے۔ اگر تم ان کے لیے براڈ براڈ کی رٹ نہ
 اکاؤ تو۔۔۔۔۔ ڈاکٹر بھی اسے انسانہ فالو کرتا رہا
 تھا۔۔۔۔۔ یقیناً۔۔۔۔۔"

"آپ کی شادی ہو چکی ہے؟" اس کے ساتھ
 ٹیٹ کے لیے آتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔
 "ہاں۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ ڈاکٹر نے ہا قاعدہ آور ہماری
 تھی۔" ایک عدد موٹی سی بیوی کا شوہر ہوں
 ہیں۔ میرے خوابوں میں تو جینی لوہیز آیا کر کرتی تھی
 لیکن حقیقت میں مجھے موٹی لوہیز مل گئی۔"
 اس نے بے ساختہ تہہ بہہ لگایا تھا۔ وہ ہنس رہی
 تھی۔ ڈاکٹر نے رک کر اسے دیکھا اور اس کے
 شانے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا تم ٹریڈنٹ کے دوران بھی ایسے ہی ہنس
 سکتی ہو؟"

وہ ایک لمبے کے لیے سنجیدہ ہوئی تھی۔ "کیا
 ٹریڈنٹ کے دوران بھی آپ ایسے ہی لطفے سنا سکتے
 ہیں؟ ویسے کیا آپ کی موٹی لوہیز، میڈسٹری کو کیز بہت
 کھاتی ہے؟"

"وہ میرا سر کھاتی ہے۔۔۔۔۔ وہ بھی ممکن لگائے
 انہیں، دیکھو اسی لیے تو کھتا ہو گیا ہوں۔" سر جھکا کر
 اپنے منہ جاسر دکھایا۔ اس کی بے ساختہ ہنسی نے بہت
 سے لوگوں کو اسے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سراٹھ کی جنگ لڑ رہے ہوں، لیکن وہ تو زندگی کی قی
جنگ لڑ رہا ہے۔ اس جنگ میں وہ ایک ایک کر کے
اپنی سب چیزیں قربان کر رہا ہے۔ ہاتھ دھو رہا
ہو رہا ہے۔

جب آپ اس لیے پریشان ہوں کہ آپ
بھڑے ہیں، سوئے یا نہ تے ہیں۔ آپ اپنی
نیت میں کامیاب نہیں ہو سکے، اچھی جاہ نہیں
حاصل کر سکے۔ اچھے پتے ہیں اور جوتوں اور کھوپرات
سے محروم ہیں۔ غربت کی چنگی میں پتے پتے تھک کر
چور ہو چکے ہیں، اس وقت اس شخص کے بارے میں
ضرور سوچنے کا جو اپنی سب سے قیمتی شے "زندگی"
سے قربان کر دینے کا ہے۔

میں نے وہ کھا ہے کہ لوگ کام کی زیادتی
پر شکایت کرتے ہیں۔ شکر گزار ہوں کہ آپ کا
جنم اس قافلے ہے کہ آپ کام کر سکتے ہیں۔ اپنی
تندرستی کی قدر کریں۔ زندگی جس قدر خوب صورت
سے نہیں آگے کی چیز ہے۔ یہ روحانی ہے۔ داری کا نام
ہے اس پر بھی متوجہ رہیں۔ ہر اس میں شکر گزار ہوں
جو تکلیف سے مبرا تر رہ رہا ہے۔ حتیٰ کہ ان دنوں میں
بھی جب آپ قہر، بھڑکائی، لسی پاری میں مبتلا
ہوئے ہیں جو جان لیوا نہیں ہے۔ شکر گزار
ہوں۔ شکر گزار ہوں اور بس شکر گزار ہوں۔"
(ہولی پھر کے خط سے)

"الحمد للہ۔ میں کینسر کی جگ جیتنے کے لیے
تیار ہوں۔"

جس دن وہ ہاسپٹل میں داخل ہوئی اسی دن
اس نے اپنی بیماری کی خبر کو آفیشل کر دیا تھا۔
خبر پھر سے جنگ کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔
جو لڑکی پچیس فیٹن دیکھ کر کوئی رتی بھی، وہ لڑکی
اب ہاسپٹل کے بینہ پر ہوئی۔ اس تصور نے کچھ لوگوں
کو دہلا کر رکھ دیا تھا اور کچھ کو۔ ظاہر ہے سکون
لے رہا تھا۔ اس کی شہرت نے لاکھوں لوگوں کو
اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہی دشمن اب وقت کے

بدلتے ہوئے ہوئے تھے۔ اس کے گرد کے پائلٹ اسکول
سے لالہ نہیں تھے۔

نیزہ جھٹل، پرنٹ میڈیا سوشل میڈیا سائنس
دعوت اس سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس
تھے۔ اسے لائیو لے جانا چاہتے تھے۔ کچھ
چاہتے تھے۔ کینسر کے لیے کام کرنے والے
اور این جی او ایڈ سے کچھ خیراتی کاموں کے لیے
کرتے چاہتے تھے۔ وہ لالہ اس کے باہل پہنچ
تھے، اس کی تربیت کو پکا کر کرتے چاہتے تھے۔
اس کی یہ لڑائی کوئی شہرت نہ چاہتے تھے۔ وہ
گھٹے، سرے کو اس کے ساتھ دھڑپا چاہتے تھے۔
ہر چیز کے لیے تھی۔ اب ہر چیز کی قیمت گنتی تھی۔
"کینسر" کی بھی۔

چند کینسر این جی او ایڈ کے علاوہ، باقی سب
صرف اپنے بزنس اور فائدے کے لیے آئے۔ کورے
تھے۔ وہ اس بدلتی دنیا کے رنگوں کو دیکھ کر پریشان
ہو رہی تھی۔ زمانہ قدیم میں جو پتھر کوڑھیلوں کو پتھر
کرتے تھے، زمانہ جدید میں بھی ویسے ہی پتھر
پتھر موجود تھے۔

"آپ اپنے احساسات، کیفیات، تکلیف اور
جو کچھ بھی آپ محسوس کرتی ہیں وہ ہمارے لیے کچھ
سکتی ہیں؟" این جی او کا نمائندہ اس سے پوچھ
رہا تھا۔

"کس لیے۔۔۔ کوئی اپنی یہ لڑائی یا تکلیف کو
یادگار کیوں بنائے گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں سوشل میڈیا
پر بہت ایسیوری ہوں لیکن اب میری دھڑکی ان
سب چیزوں میں مفر ہو چکی ہے۔ میں زندگی کا ایک
ایک لمحہ جیتنا چاہتی ہوں، تصویریں سچ سچ کر پوسٹ
کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔"

"آپ سمجھی نہیں مس پٹی! ہماری این جی او
نان پرافٹ ادارہ ہے۔ ہمیں شہرت چاہیے، نہ
بزنس۔ دنیا میں لاکھوں لوگ اس بیماری سے لڑ رہے
ہیں۔ اس بیماری کے لیے دوا اور دعا سے زیادہ
چیز کی سب زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہے امید۔"

والے صرف امید لکھیں، مانگنے والے صرف اسے
 مانگیں۔ دنیا کے ہر رنگ کو امید کے رنگ میں لپیٹ
 دیا جاتا چاہیے۔ اس دنیا کو اس دنیا کے ہر انسان
 کو اس وقت جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت
 ہے۔ وہ صرف "امید" ہے۔

"ٹھیک ہے..... میں لکھوں گی....." وہ کہہ
 رہی تھی۔ فرشتے کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیں..... وہ
 واقعی میں مسکرا رہا تھا۔

برہم برہم

مس فائسٹر تین مہینے سے ہاسپٹل میں تھی۔ اس
 دوران وہ تین بار چھٹی کی درخواست کر چکی تھی اور
 تینوں بار ڈاکٹر نے اسے پہلا دیا تھا۔ اس کے پاس
 پانچویں کی کئی کئی گھنٹوں کے پاس درخواستوں
 کا بڑا پلٹا تھا۔ اس نے درخواستیں دیکھی تھیں کہ
 اسے پانچویں گھنٹے کے لیے ہاسپٹل سے باہر جانے دیا
 جائے۔

اس نے پانچویں کو ان لیا گیا تھا۔ اور اب وہ خوشی
 کر رہی تھی۔ بے فکرانہ روشنی، آسمان، گھاس، پھولوں
 پودوں، دوستوں، کلاس، فیلو، پرنسپل، سر سے
 نئے جوتے، گارڈ، مادے اسے ایک نیا جوتہ دے گا۔
 جس سے وہ اپنی دیرینہ سہیلی تھی کہ اس کی آنکھیں
 جھپک رہی تھیں۔

"کف ملتا ہے۔ کف ملتا ہے۔ وقف ملتا ہے۔ وقف ملتا ہے۔
 ہاں۔ آج کل کو مسٹر برکھن کو اتنا دیر لگا کہ وہ اسے
 قدرتی بال اسکیم، روزی، کف، پتھر، ہم جی، جی، سر پر
 ان کا جو کچھ سنو، کف کرتے۔ کف حیرت انگیز بات
 ہے۔ اور یہ بات مجھے آج معلوم ہوئی ہے۔"

اس نے دنگ لکھ کر دیکھا۔ اس نے اسے اسے
 اس کے کہنا کو جواب دیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں
 رہی تھیں۔ اس کی پوری ہستی گواہی کہ آج وہ صحیح
 سچوں میں مسکرا رہی ہے۔ اس نے آج جانتا تھا کہ
 زندگی کے ایک ایک لمحے کی کیا قیمت ہوتی ہے۔
 زندگی بے کلام کے کاسوں اور باتوں میں وقت اور
 فاصلہ بردار کرنے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو بے وقوفی ہے۔

پھولے، روحانی منازل طے کرتے، اعلیٰ منزل
 حاصل کرنے کا نام ہے۔

لوڈ۔ نیم کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھو
 علی پر دو قدم چلتے، تین قدم اٹھتے، پانچ قدم چلتے
 پانچ قدم بگڑ گئے، کوڑے پھانگتے، وہ "جی" کہتی
 تھی۔ ہر دو لمبے کی ایک کوڑا چال ہوتی ہے۔ اس کی
 چال کا کوڑا "خوشی" تھا۔ آواز کی اور بے فکر تھی۔
 اس سے یونیورسٹی آئی تھی۔ سبکی اس نے
 دوستوں کو بلا لیا تھا۔ اس کے کلاس فیلو اس سے
 زیادہ تر یونیورسٹی میں اینڈ اس اسٹڈی کر رہے تھے
 ایسے ان سب سے ملتا تھا، چونکہ چھٹی ایک ہی
 تھی۔

اسٹاپ پر اتر کر وہ یونیورسٹی تک پیدل چلا
 رک کر اس نے اپنے لیے آس کریم کی گول
 دکانوں کی صفہ اسکرین میں اس نے اپنا کس دنگ
 تھا۔ سیٹ کرنے کے لیے بال نہیں تھے۔ اس پر
 اس ہاتھ ڈال کر اس نے لب گھوڑ نکالا اور اسے
 یونیورسٹی پر لگانے لگی۔ دوبارہ ہاتھ ڈالا تو گھڑ بگڑا
 گئے۔ "ماتے رکھے ہوں گے۔" اس نے آنکھوں پر
 دنگ لیے۔ گردن کو دائیں بائیں گھما کر نوڈ
 دیکھا۔ شپ کی بوڑھی ماٹن باہر نکلی اور گئے
 گئے۔ تیرہ پھولوں میں سے ایک پھول توڑ کر اسے
 نوا۔

"جیت ویل سون..... ایسے ہی مسکرا
 رہو۔" شپ نے تھک کر کہا۔

جانی پھول۔ عورت کی مسکراہٹ
 شپ نے پرکھی۔ تینوں چیزوں نے اسے لا لیا کہ
 وہ پھول اس نے ناک کے قریب کر لیا تھا۔
 چھٹی تھی وہ اب جانتا تھا کہ زندگی کی خوشیوں، بل کا
 خوشی کی طرح ہوتی ہے۔ اور ان دونوں کی خوشی
 کائنات کے کونے کونے سے آتی ہے۔

لائم وغیرہ یونیورسٹی کے لان میں مٹا
 پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان تک آتے
 آتے اسے کئی بار ہائے ریلو کرنے، چال چال

لئے لئے اس نے کچھ کر لی۔

”جی چاہتا ہے کہ ایسی ہی ایک بڑی سی یونیورسٹی بنواؤں اور اس پر ہڈی نام لکھ کر دنیا والوں کو گفٹ کر دوں۔“ اس نے یونیورسٹی کی عمارت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور اطراف میں نظر دوڑا رہی تھی۔

”تم ہم غریبوں کو ایک ایک گھر گفٹ کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟ یقیناً جانو میں اپنے بیوی بچوں کی پیشانیوں تک پر تمہارا نام کھدوا دوں گا..... یہ بڑے بڑے حروف میں ہڈی.....“ لائیم کی بات پر بے ساختہ قہقہہ پڑا تھا۔

”بڑے بے غیرت ہو.....“ اس نے منہ ہٹا کر کہا۔

”ہاں..... بہت بڑا والا بے غیرت ہوں.....
اب تو کمر لے گا نا؟“ وہ چنے لگی۔

”چلو یونورشی دیکھتے ہیں سر پرو فیسرز سے ملاتے ہیں۔ آج مجھے لائبریری بھی دیکھنی ہے۔“ وہ کھڑی ہوئی۔

”کیوں لاہوری کو شرمندہ کرتا ہے؟“ وہ سب ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔ وہ ان کے آگے چل رہی تھی۔

”نہیں..... خود کو..... میں بھی اپنی ایک بک لکھ رہی ہوں.....“ اس نے فخر سے بتایا تھا۔

آئی۔ مجھے تو شرم سے ڈوب مرنے لگا ہے۔"

”اپنے کولڈ میڈلز کا پسند اپنا کر قبول کرو۔ ان
تین تینوں میں، میں نے چہ بکس بڑھی ہیں۔“ چلتے
چلتے وہ ایڑی کے بل کھوم کر ہٹانے لگی تھی۔ یہ اتنا بڑا
کارنامہ تھا کہ اس کا ماننا تھا کہ اسے لڑائی دی جانی
چاہیے۔

”پوری“ ”چھ“۔ یعنی اتنا بڑھ لیا تم نے؟ کیوں
اپنے دماغ بے چارے پر اتنا بوجھ والا ڈیرا جس
کام کا وہ عادی نہیں ہے، وہ کام اس سے (بروز)

ہا پہنچے ہاتھوں کے پاس رکنا پڑا تھا۔ وہ اس ہڈی سے
تسلل کر رہے تھے جو بہت امیر، فیشن ایبل اور مشہور
نئی دوا اس ہڈی سے مل رہے تھے جو بیمار تھی اور جسے
معالفہ اور بے شمار مسکراہٹوں کی ضرورت تھی۔

”جہیں ایسے گھٹیا کپڑے پہن کر یونورسٹی جاتا ہے چاہیے تھا۔“ لائٹ نے اس کے عجیب و غریب کی طرف اشارہ کیا۔ ”رہ کھنے والے کیا کہیں گے، اتنی غریب ہو گئی ہے کہ ہسکی پٹی جینز پہننے پر مجبور ہے۔“

اس نے قہقہہ لگایا۔ وہ آتے ہی کمر کے بل
س پرڈھیر ہو گئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے، اب ہی تو میں امیر ہوئی ہوں۔
میرے پاس پورے چوبیس کھنٹے ہیں.....“

جیو تک آئی ہوں۔ دوائیاں لاکھ کرا آئی ہوں۔

کو آٹھ مار کر، ہاسٹل کو ۵۵ بائے بائے کہہ آئی۔
 دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ باقی بچے پورے بائیس

”کیسا؟“ وہ ہاتھ اٹھا کر دلو لیتا چادر سی تھی۔
”گلتا ہے تم نے“ ”ان خانم“ مودودی دیکھ لی

جہاں جس کے پاس بہت ناوقت ہوتا ہے، وہاں

”فی الحال تو تم سب مجھ سے زیادہ امیر ہو
س پروردہ بچیاں کی کمرخت نکل رہی تھی۔

”تم ان نشانہ بینوں میں کرتی کیا رہی ہو۔ میں
نسا، قمیص بک پہنیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کر

اس کا اس فیاد ہو چکا تھا۔
اس نے تہہ لگا کر "خجڑوں کا بیڑا" لگا دیا۔

کیوں کروا دیا؟ کہے کہے نہیں ترپا ہو گا وہ موصوم۔ کہنا ہو گا اچھا بھلا فیشن میں کب رہا تھا۔ یہ کہاں لگا دیا مجھے۔

”سٹ اپ اتم ہیٹھ مجھ سے جیلس رہے ہو۔“
”اب میں تم سے حد درجہ متاثر ہو رہا ہوں۔“ لائٹ نے سچیرگی سے کہا۔ ”تم حیران کن ہو۔ بلکہ بہت خاص ہو۔“ وہ واقعی میں بہت حیران تھا۔ وہاں موجود ہر شخص حیران تھا..... وہ ہڈی نہیں مٹی، جسے وہ جانتے تھے۔ اپنے سے وقت میں، وہ ان سے زیادہ بے دار لگنے لگی تھی۔ اس کی چال، اس کا انداز، دنیا کو دیکھنے والی اس کی نظر، سب میں انقلاب برپا ہو چکا تھا۔

اس کے چہرے پر موصومانہ خوشی تھی۔ جس یونیورسٹی میں وہ پورے چار سال تک پڑھتی رہی تھی، اس یونیورسٹی کو وہ آج ایسے دیکھ رہی تھی جیسے یہاں پہلی بار آئی ہو۔ یونیورسٹی کی چال چلنے والی اس کا دل ہشاش بشاش کر دیا تھا۔ زندگی اور دنیا کی رونق انسان کے دم سے ہے۔ آواز سے، پکار سے، شور سے، تہمتوں، کچھ فکر، زیادہ بے فکری اور جوش و خروش سے۔

وہ اپنی کلاس کی طرف جا رہی تھی کہ اسے کوریڈور میں اپنے جیسی لڑکیاں نظر آئیں۔ ایک کے سر پر کپ تھی، دوسری کا بغیر بالوں کا سر نمایاں تھا۔ وہ پہلے بھی یہ جان ہی نہیں پاتی تھی کہ زندگی کے ساتھ ساتھ موت بھی چلتی ہے۔ تندرستی کے ساتھ ساتھ بیماری۔ پھر اپنی بیماری پر اس نے ایک دم سے زندگی کو روک کیوں لیا تھا؟ جو روح پیدا کر دی گئی ہے، اس پر بھی ”فل اسٹاپ“ نہیں لگتا۔ یہ جہاں یا وہ جہاں، سفر جاری رہتا ہے..... جاری رہتا ہے.....

کیسی بھی مشکلیں آئیں، تکلیفیں ملیں، رنج و غم کا جوار بھانا پھونے، اس جہاں میں، اس زندگی پر کبھی ”فل اسٹاپ“ نہ لگنے دیں۔ چلتے رہیں، سفر جاری رکھیں، بس چلتے رہیں۔
ہر دوسرے سے ملنے کے بعد ان سب نے لچ

کہا تھا۔ شام کو وہ ایک چھوٹا سا تھیر شو دیکھنے کے لیے چلے گئے تھے۔ ان کا دس لوگوں کا گروپ کئی کئی گھنٹے رہا تھا۔ انہیں سچ کہاں کرنا ہے، کال کہاں ہے، کون سا شو دیکھنا ہے، کس پارک کو دیکھنا ہے۔ وہ بحث کر رہے تھے، جھگڑ رہے تھے، ہنس رہے تھے، ایک دوسرے کو ملنے دے رہے تھے اور فحاشا کر رہے تھے۔

بھئی بس میں بیٹھے، کبھی فٹ پاتھ پر کھڑے کبھی ریٹیلورنٹ میں میزوں کے گرد کھڑے کبھی بیٹھے، وہ سب ہڈی اور ہڈی کی کچھ پرانی طرح مریضہ فیز تصوریں کو تشدد کا نشانہ بھی بنا رہے تھے۔ وہ اسے، اس کی کچھ ایسی حرکتیں یاد دار رہے تھے، یونیورسٹی میں داخلہ رہی تھیں۔ وہ چل پھر کر، اس کا انداز اپنا کر، اس کی نظریں اتار رہے تھے۔ فیس فیس اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔

”ایک بار تم ایسا ڈریس پہن کر یونیورسٹی آؤ تھیں کہ میں چپکے سے تمہاری تصویر لیے بغیر نکل سکا تھا۔“

”اتنی اچھی لگ رہی تھی میں؟“ اپنی تعریف سن کر اسے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

”اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ فیس نہیں رک رو رہی تھی۔ سوچا کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں، تو تم نے وہ تصویر ادھر ادھر ہارٹ دی۔“

”تم سب بہت کہنے ہو.....“ اس نے منہ لیا۔ وہ سب کافی لی رہے تھے۔ دل پر بھاری بھر پور کر انہوں نے کچھ مہنگی والی میشریاں منگوا دیں۔ ہڈی آج بھی انہیں مہنگی ہی پڑنے والی تھی..... اف یہ مہنگائی..... اف یہ ان کی غربت..... کسی جوکر سے کم تم بھی نہیں رہیں.....

میں سر یا، آنکھوں میں سیسہ۔ چال میڈوڈ، انداز کٹیٹی بھری۔ پتا نہیں تم امیر لوگ ایسی دلیات چیزیں کہاں سے سیکھ لیتے ہو۔ دنیا کو جوتی کی نوک پر رکھنا اور انسان کو انسان نہ سمجھنا۔ دولت تو بڑی نعمت ہے۔“

”ہاں! ایسا ہی ہے۔“ ہڈی نے لائم سے اتفاق کر لیا۔ وہ ایسی ہی تھی، لیکن وہ اکیلی تو ایسی نہیں تھی۔ آدمی دنیا اس جیسی تھی۔ شوائف اور وہیات۔ مقرر اور بدو مانغ۔ جب میں ساری دنیا کی اتھارنی رکھ کر پوزیشن اور اسٹیشن کی دوڑ میں دوڑنے والے۔

اس کی دوستوں نے کہا کہ وہ اسے ڈراپ کر دیں گی لیکن وہ نہیں مانی تھی۔ شام چھ بجے تک وہ ان سب کے ساتھ رہی پھر وہ ان سے الگ ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی روٹ پر، بار بار بسیں بدل رہی تھی۔ چڑھتی، اترتی تھی، چلتی تھی، اٹھتی بس میں بیٹھ جاتی تھی۔ وہ دنیا کے بہت سارے مناظر کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتا جاتا ہی تھی۔ تاکہ وہ واپس جائے تو اس کے پاس یاد کرنے کے لیے بہت کچھ ہو۔

رات ہوئی تو اس نے ایک جگہ سے ڈنر کیا، دوسری جگہ سے کافی پی، تیسری جگہ سے جوس اور چوتھی جگہ بیٹھ کر وہ یہ سوچتی رہی کہ یہاں سے کیا کھائے۔ ویٹر کی گھوریاں کھانے کے بعد وہ پانی پی کر اٹھ گئی۔ راہ گیر، بسوں میں بیٹھے مسافر، ریسٹورنٹس کے ویٹرز، کوئی کی میز پر بیٹھی سرخ بالوں والی آنٹی، وٹڈ وٹا پنک کرنی مایوس صورت لڑکی، فون پر گرل فرینڈ سے بک جھک کر بات لڑکا۔ اس نے ہر منظر، ہر انسان، ہر احساس کو دل کی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اسے سب بہت اچھا لگتا تھا۔

ابھی رات کے نو بجے تھے۔ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ چلتے چلتے اسے مسجد دکھائی دی۔ پھر اس کی نظر چرچ پر پڑی۔ مسجد کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چرچ کا بھی۔ وہ چوٹی تھی۔ یہ بات آج اس کے علم میں آئی تھی کہ عبادت گاہوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اس نے مسجد کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ وہ مسجد کو اندر سے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اللہ کہاں رہتا ہے۔

”اپنے بندے کے دل میں۔“ فرشتے نے کہا تھا۔

”وہ کیسے ملتا ہے.....؟“ اس نے بے ساختہ

☆ ☆ ☆
وہ مسجد کو اندر سے دیکھنے کی نیت سے آئی تھی بس..... لیکن وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکی۔ ایک دم سے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ یہ اچانک ہی ہوا تھا کہ صبح سے اب تک وہ ہشاش بشاش رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس نے مسجد کے اندر قدم رکھا تھا، اس کی ساری تنہائی اور پوری تکلیف اس پر آشکار ہوئی تھی۔ اس کا دل پھٹنے لگا تھا۔ اس کا دل جا رہا تھا کہ وہ پیشانی کے بل گر جائے..... روئے..... خود کو خود دے۔

”کہو اللہ.....“ فرشتے نے کہا تھا۔
وہ چوک گئی۔ چلتے چلتے رک گئی۔

”اللہ.....“ اسے یہ نام اجنبی لگتا تھا۔ کیونکہ اس نام سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نام کو نیکار نے کی توبیت ہی نہیں آئی تھی۔ نام سے جان کر بھی نہیں جانتی تھی کہ ”اللہ“ کون ہے۔ نام سن کر، کہہ کر بھی، وہ اس نام سے اجنبی رہی تھی۔ ماننے بغیر یا جاننے بغیر ”اللہ“ پکارنا ایسے ہی ہے جیسے کسی سبق کا رٹا لگانا۔ ٹھیک ہے، اللہ رٹے پر بھی نمبر دے دیتا ہے، لیکن جس نے تیاری کی ہو، جان لگ دی ہو، دل لٹا دیا ہو..... اس کی تو کیا ہی بات ہے۔

”اتنی بار کہو کہ تمہیں اس کے سوا سب لفظ بھول جائیں۔ سارا جہاں بھول جائے، یاد رہے تو بس یہ لفظ ”اللہ“۔ اللہ رحمان ہے اور یہ لفظ شفا..... دل کا دکھی، جان کا روگی، نفس سے عاجز، درد سے یسیرا، کسی بھی بیماری سے بیمار، کوئی بھی، کیسا بھی، صرف اس ایک لفظ کا ورد کرتا رہے تو شفا پائے گا۔

شفا کے نام پر وہ کانپ اٹھی تھی۔ دیوار کا سہارا لے کر ہانپنے لگی تھی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ سارا جہاں دکھائی دینا بند ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو ستون سے سر لٹا کر بیٹھے ہوئے پایا۔ آنکھوں کو بے تحاشا بھیکتے اور دل و جان کو صرف ایک نام کا ورد کرتے۔

اللہ.....
وہ اپنا نام تک بھول گئی..... اس نے ایک لمحے
کے لیے بھی خود کو، خود میں نہیں پایا تھا۔
وہ سب سنتا ہے، لیکن اسے خاص طور پر سنتا
ہے، جو صرف اسے پکارتا ہے۔ وہ سب کے پاس
ہے لیکن اس کے پاس خاص طور پر ہے جو اس کی
تلاش میں ہے۔ وہ سب کو دے رہا ہے، لیکن اسے
خاص دے رہا ہے جو پورے یقین سے مانگ رہا
ہے۔ سب بیمار ہیں اور سب پریشان حال ہیں، اس
کا رحم سب کی تلاش میں ہے، لیکن یہ رحم اس پر خاص
طور پر سایہ فگن ہے، جو پر امید ہے، اور یقین رکھتا ہے
کہ اس کا رب اس سے غافل نہیں ہے.....
یقین..... صرف یقین..... اللہ کو اپنے بندے سے
صرف یہ ”یقین“ چاہیے۔“

آنسو آہستہ آہستہ اس کے گالوں پر پھسلنے لگے
تھے۔ ٹریسٹ کے تین مہینے اس نے ہر طرح کے صبر
کا مظاہرہ کیا تھا۔ دن کی روشنی کو اس نے اپنے آنسو
نہیں دکھائے تھے۔ اب تک وہ ہمت باندھ کر بیٹھی
رہی تھی، آج ہمت کی ساری پونلیاں اس نے یہاں
کھول دی تھیں..... وہ سسکنے لگی تھی۔
”میں بہت تکلیف میں ہوں۔“ پھوٹ
پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے کہہ دیا تھا۔

رب اور بندے کا رشتہ..... یہ ازل سے ہے۔
اور ابد تک رہے گا۔ یہی باقی ہے..... باقی سب فانی
ہے..... ساری دنیا اکٹھی کر کے بیٹھ جائیں، اپنے دکھ
بتائیں، روئیں، چلائیں، دہائیاں دیں، اطمینان
نہیں ملے گا۔ ایک آنسو اپنے رب کے سامنے
بہا دیں خدا کا کرم، فضل، رحم، اور اطمینان..... سب
نی تو مل جائے گا۔

وہ رات بھر مسجد میں رہی تھی۔ فجر کے بعد مسجد
سے نکلی تھی۔ سڑک پر دھیمی چال چلتے ہوئے وہ کسی
ایسی کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس کا سر چکرایا تھا اور
خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی وہ کمری تھی.....
ان چوبیس گھنٹوں میں وہ ڈاکٹر ز کو ساتھ ساتھ

اپ ڈیٹ کرتی رہی تھی۔ فون اس کے پاس تھا۔ اس
سے کچھ دیر پہلے اس کی بات ہوئی تھی۔ اس کا بیان
ہو رہا تھا لیکن اس نے زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں
سمجھا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ وہ بھی کہ زیادہ روئے کی
وجہ سے ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔
شاید نیند نہ لنے کی وجہ سے۔

یہ نیند کی ہی قسم تھی۔ دنیا کے جہوم سے پرست،
وہ سڑک پر ڈھیر کی طرح پڑی تھی۔
”اس کے اللہ“ کے گھر کے دروازے، اس
کے پیچھے ابھی بھی کھلے ہوئے تھے۔ ایسے ہی چپے
آسمان کے دروازے کھلے تھے۔ ایک طرف عبادت
کے لیے جایا جاتا ہے، اور دوسری طرف حساب
انعام کے لیے ”بلایا“ جاتا ہے۔ خدا کا گھر اور خدا کا
آسمان..... وہ ان دونوں کے درمیان تھی۔

☆☆☆
وہ ان سب کے درمیان کھڑی تھی۔
”تم، ابھی نکلو گی یہاں سے۔“ اسے ہاتھ نہیں
لگایا گیا تھا، درخت کی شاخ سے دھکیلا گیا تھا کہ ابھی
نکلو، دفع ہو جاؤ۔
والد جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے تھے
دبیسانے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ پھر اپنے پورے
خاندان پر نظر دوڑائی۔ وہاں بچا ہی کون تھا جو اسے
زندہ دکھائی دیتا۔

”ایک بار آپ نے مجھے اپنی قسم دی تھی۔“
باپ کے پاس آئی تھی۔
”آج میں آپ کو اپنی قسم دیتی ہوں۔ میری قسم
ہے آپ کو والد! کبھی گھائیوں کی طرف مت آجیے
گا۔“ اس نے ایک آخری بار باپ کا ہاتھ پکڑ کر
آنکھوں سے لگانا چاہا اور لگایا۔
انہوں نے جھٹک کر اپنا ہاتھ اس سے الگ
کیا۔

”ایسے نہ کہو دبیسا۔“
”نہ میرا حال پوچھئے، نہ اپنا حال بتانے۔ نہ
میری صورت دیکھئے، نہ اپنی صورت دکھانے۔ میں

نہ کو اپنی قسم دیتی ہوں والد!“

والدہ کی آنکھوں سے جواشک رواں تھے۔ ہاتھ
بہا کر اس نے آخری بار وہ آنسو بھی پونچھ دیے۔
”آپ سن رہے ہیں والد؟“ وہ پوچھ رہی

تھی۔
”اب میں زندہ کیسے رہوں گا دیسا؟“ وہ بھی
پوچھ رہے تھے۔

”میرا غم مت کیجیے گا۔ اپنی بیٹی کو یاد رکھیے گا
لیکن دیسا کو بھول جائیے گا۔ کچھ عرصے کل رات دیسا
برگئی اور آج اس کا جنازہ جا رہا ہے۔ اگر آپ میرے
غم میں مر گئے، تو میں خدا کے سامنے شرمندہ ہوں
گی۔ کیا آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہیں گے؟“

”تمہارا باپ ناکارہ اور نالائق ہے۔ وہ
تمہیں..... وہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔“

”اس وقت آپ بادشاہ بھی ہوتے، آپ کے
اختیار میں کل جہاں کی طاقتیں بھی ہوتیں، تب بھی
آپ مجھے تکلیف سے نہیں بچا سکتے تھے۔ یہ بیماری
صرف مجھے ہی نہیں ہوئی، اس بیماری پر آپ اکیلے ہی
شرمندہ نہیں ہوئے۔“

”خدا نے میری دیسا کے ساتھ ایسا
کیوں.....“

”اس نے اپنی میلی آنکھیں رگڑی۔

”خدا.....“ وہ کہہ کر کتنی ہی دیر تک خاموش
رہی تھی۔ ”یہ سوال تو ابھی مجھے اس سے کرنا ہے۔“

گھر میں پتھر گرنے لگے تھے کہ جلدی نکلو
یہاں سے۔ والد غصے سے پاگل ہو گئے تھے۔ وہ گھر
کی چیزیں اٹھا اٹھا کر شہر والوں پر پھینکنے لگے تھے۔
اس نے لک کر والد کے ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں
باندھ دیا۔ پھر وہ انہیں اندر لے گئی اور دروازہ بند کر
دیا۔ یاں رو رو کر دیوانی ہو چکی تھی۔ وہ ایسے بھگتی
بھرتی تھی جیسے بیٹائی کھو بیٹھی ہو۔ بہن بھائی انجکیوں
سے دور ہے تھے۔

گھر کے دروازے کے باہر ”انسانوں“ کا
اڑدھام کھڑا تھا۔ سارا گھر اس نے دیکھے بغیر پار کر لیا

تھا، لیکن جب وہ دہلیز پار کرنے لگی تو پلٹ کر ایک نظر
اپنے گھر کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ دروازے کی
چوکھٹ پر سر ٹکا کر، گردن کو ذرا سا خم دے کر اس نے
آخری نظارے کی چوری کی تھی۔

اس گھر میں اب وہ دوبارہ کبھی نہیں آ سکے گی۔
اس باپ، اس ماں سے وہ کبھی نہیں مل سکے گی۔
چھوٹے بہن بھائیوں کا منہ نہیں چوم سکے گی۔ اس کی
لعنت کے پتھر اس کے خاندان والوں پر نہ پڑیں، وہ
ان سب کا نام تک بھول جائے گی۔ اپنے گناہوں کا
کفارہ دینے وہ جا رہی تھی، اس کفارے میں وہ اپنے
خاندان والوں کو شریک نہیں کرے گی۔

وہ باہر نکلی تو سب پیچھے بیٹھے گئے۔ جو ایک بار
ماں کے بد بخت کہنے پر رو دی تھی، وہ لوگوں کی بد بختی
بھری گالیاں سن کر بھی خاموش تھی۔ اس کی سہیلیاں
دور چوہاروں پر کھڑی تھیں۔ ان کی ماؤں نے ان
کے ہاتھ سختی سے پکڑ رکھے تھے کہ وہ دیسا سے لپٹ
نہ جائیں۔ پھر انہوں نے اپنی بیٹیوں کے چہروں پر
چادریں سنبھال دیں..... سب توبہ توبہ کر رہے تھے.....

ابھی تک بس اسی نے توبہ نہیں کی تھی۔ وہ شہر
کے دروازے سے باہر آ گئی تھی۔ گھائیوں کی طرف
آتے ہوئے اسے پشت پر پہلا پتھر پڑا تھا۔ وہ پلٹی تو
دوسرا پتھر عین پیشانی پر پڑا تھا۔ تیسرے کا کونا آنکھ
میں لگا تھا۔ چوتھے پتھر سے اس کی ناک سے خون
نکلنے لگا تھا۔ خرطوم اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ مٹیوں
میں پتھر بھر کر کھڑا تھا، اور تاک تاک کر اس کی طرف
اچھال رہا تھا۔

”دیسا چڑیل..... میں نے کہا تھا نا تو کوڑھی
ہو گی تو میں تجھے پتھر ماروں گا.....“

ناک پر ہاتھ رکھ کر وہ خون روکنے کی کوشش کر
رہی تھی۔ کچھ دور شہر کے لوگ کھڑے دیکھ رہے
تھے۔ والد شاید گھر کے اندر مر چکے ہوں گے۔ والدہ
اپنے سمیت سب کی قبریں کھود رہی ہوں گی۔ اسے
پہلے پتھر پر اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی پیشانی پر
پڑنے والے پتھر سے ہوئی تھی..... وہ پیٹھ پیچھے کے

وہ حق دار نہیں تھے۔ بچی موت..... تو وہ اس نعمت کے انتظار میں آنکھیں بچھا کر رکھتے تھے۔

اس کے حسن کو کھین لگ چکا تھا۔ وہ مری نہیں تھی اور زندہ بھی نہیں رہی تھی۔ دن کی روشنی میں وہ اپنے جسم پر پڑنے والے داغ دیکھتی رہتی تھی۔ اپنا جسم، اپنے ہاتھ پاؤں۔ پانی میں اپنا عکس دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی تھی۔ اس نے اپنے حسن پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ پھر بھی..... اس کا حسن خاک ہو رہا تھا۔

کوڑھیوں کو عبادت کی اجازت نہیں تھی۔ وہ بد بخت اور لعنتی تھے۔ خدا کی طرف سے دھتکارے ہوئے۔ وہ اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ وہ بھیک مانگتے تھے تو اپنے گناہ کے نام پر جس کی وجہ سے انہیں کوڑھ نصیب ہوا تھا۔ خدا کے نام پر نہیں۔

اگلے دن صبح، والد پاگلوں کی طرح گھائیوں سے کچھ دور دبسا دبسا چلاتے، بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔

”میں نے تمہاری دی قسم نہیں توڑی دبسا! میں گھائیوں سے بہت دور کھڑا ہوں۔ تم نے کہا تھا میں تمہاری صورت نہ دیکھوں، اپنے باپ کو اپنی آواز سنا دو۔ دبسا..... تمہارا باپ مر جائے گا.....“

”اپنے باپ سے تو مل لو دبسا.....“ اسے وہاں دیکھ کر ہر آنکھ رو دیتی تھی۔ ضعیفہ کچھ زیادہ ہی آب دیدہ تھی۔

”آج مل لیا تو وہ ہر روز یہاں آیا کریں گے۔ وہ یہیں رہ جائیں گے۔ لوگوں کے طعنے ان کا سینہ چھلنی کرتے ہوں گے۔ میرا گناہ، ان کی سزا بن چکا ہے۔ گھائیوں کو میں ان کے لیے جہنم نہیں بنے دوں گی۔“ اس نے کیلی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا تھا۔ والد کی آواز کی گونج اسے تکلیف دے رہی تھی۔ دنیا جہان کے پہاڑ اس نے اپنے سینے پر رکھ لیے تھے۔ باپ کی آواز کا کٹاؤ وہ سہہ نہیں پار رہی تھی۔ وہ سرنگ میں اتنی دور چلی گئی تھی کہ اسے والد کی آواز

سے ذرا دور محکم مٹی تھیں۔ شاید ان لوگوں تک شہر کے لوگوں کا شور پہنچ چکا تھا۔ یا پھر ان کی بیماری زدہ حس نے انہیں بتا دیا تھا کہ ایک اور بد بخت، نامراد ہو کر ان کے ساتھ رہنے کے لیے آچکا ہے۔

خوف دل پر حاوی تھا، سہم سے سانس تنگ تھی۔ پتھر کی ڈھلان پر جبک کر کھڑی وہ پتھر ہو چکی تھی۔ وہ ان سب کے غلیظ پیر دیکھ رہی تھی۔ بد بودار لبادے، زخم خوردہ کھالیں۔

”یا خدایا..... دبسا.....“ ضعیفہ نے جیسے اپنا سینہ پیٹ لیا تھا۔ اس پر کبکی مری تھی۔

اس نے سر اٹھایا۔ آگے پیچھے کھڑے کوڑھیوں کو دیکھا۔

”ہاں دبسا..... لعنتی دبسا.....“ سر کو پتھر سے ٹکرا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆☆☆

شہر والوں نے اسے نکال دیا، وہ شہر سے نکل گئی۔ وہ اسے بھول گئے، وہ بھی انہیں بھول گئی۔ اس کا ذکر، قصہ کہانی بن گیا۔ اس کا نام ناپاک کہلایا۔ اس کا انجام عبرت ناک قرار پایا۔ یہ زمانہ..... یہ لوگ..... یہ وقت کی چال..... یہ اوپر والے کا کھیل.....

وہ تاریک غار نما سرنگ میں ضعیفہ کے ٹھکانے میں بیڑی رہتی تھی۔ ساری دنیا اس کے لیے خاک ہو چکی تھی۔ اس نے خدا سے یہ سوال بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ وہ بالکل خاموش ہو چکی تھی۔ اس کے شہر اور آس پاس کے شہروں کے کوڑھی ان ہی گھائیوں میں رہتے تھے۔ یہ کوڑھیوں کا چھوٹا سا شہر تھا۔ اگر کہا جائے کہ زندہ تو ہاں وہ یہاں زندہ رہتے تھے۔

زندگی پر تو تندرست انسانوں کا حق تھا اور وہ کوڑھی تھے، اس لیے موت پر اپنا پورا حق جما کر، اس کے انتظار میں کھڑیاں، وہ یہیں کھنٹے تھے۔ زندگی پر ان کا بس اتنا ہی حق تھا کہ وہ بھیک مانگتے تھے اور دوئیں تو ایک لقمہ کھا لیتے تھے۔ دوا تھی نہیں، شفا کے

دبیسا نے چونک کر اسے دیکھا۔ "وہ خدا ہے
ہمیں کوڑھ دے کر شفا دینا بھول گیا ہے۔" اس نے
خفی سے کہا۔

"چھوڑو! سراٹھا کر اپنے پرندے کو دیکھو۔ کیا
خوب صورت اور جوشیلا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ تمہارا
فرشتہ ہے۔ تمہیں خدا کا پیغام دینا چاہتا ہے۔
ہمارے پاس خوش ہونے کے کتنے عمدہ وہانے ہیں
دبیسا! یہ پرندہ ہر روز تمہارے سر پر آکر مڑلاتا
ہے۔ کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو سکتے کہ یہ تمہارا
دیوانہ ہے۔ جہاں انسان ہمیں دیکھتے ہی پتھر مارنے
لگتے ہیں، یہ تمہیں دیکھتے ہی دیوانہ وار اپنے پر
پھڑپھڑانے لگتا ہے۔ تم تو ابھی بھی بہت خوش قسمت ہو،
مجھے دیکھو، میرا سایہ پڑتے ہی حشرات تک بھاگ
جاتے ہیں۔" اس نے اتنا کہہ کر قہقہہ لگایا۔

اس نے سراٹھا کر پرندے کو دیکھا۔ وہ جانتی
تھی کہ یہ وہی پرندہ ہے جس کے پیچھے وہ گھرتے باہر
کی طرف بھاگی تھی۔ سب کہتے تھے کہ وہ دبیساکا
پرندہ ہے۔

"تمہیں کیسے پتا کہ یہ میرا ہی پرندہ ہے؟"
آج اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

"جو جس کا ہوتا ہے وہ دکھائی دے جاتا ہے۔
جیسے یہ زمین ہماری نہیں ہے لیکن ذرا سراٹھا کر دیکھو،
وہ آسمان ہمارا ہے۔ اپنی چیز، اپنی طرف بچتی ہے
دبیسا! کیا تمہیں آسمان اپنی طرف نہیں کھینچتا؟"

دبیسا نے سراٹھا کر دیکھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ
اوپر دیکھتی رہی تھی۔ پھر پرندہ اس کی نظر کی سمت میں
اڑنے لگا تھا۔

"کیا تمہیں آسمان اپنی طرف نہیں کھینچتا؟"
پرندہ بھی یہی پوچھ رہا تھا۔

"خدا اس بندے پر لعنت کیسے بھیج سکتا ہے،
جس کا وہ واحد "خالق" ہو؟" وہ زریب بڑبڑاتی
تھی۔ سوال سے ہی سہی، اس نے خدا سے کلام کرنا
شروع کر دیا تھا۔ پرندے نے ہوا میں جوش سے
ترجمی اڑان بھری۔ وہ خوش تھا۔ اس کے سر کے لہجے

سنائی دینا بند ہو گئی تھی۔
"دبیسا نے کہا ہے کہ اگر آپ دوبارہ یہاں
آئے تو وہ سمندر میں کود کر اپنی جان دے دے گی۔"
ضعیف نے دبیساکا پیغام والد تک پہنچا دیا تھا۔
"اس نے کہا ہے کہ وہ اپنی زبان کی ایسی پکی
ہے، کہ آپ کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دی تو وہ
کود جائے گی۔"

"میری جان لے لی اس نے..... اب اپنی
جان لے کر کیا کرے گی۔" والد زریب بڑبڑائے۔
انہوں نے آس پاس پڑے پتھر چٹنا شروع کر دیے
تھے کہ اگر ان کی دبیسایہاں سے گزرے، اور کوئی
اسے پتھر مارنا چاہے تو کسی کو اسے مارنے کے لیے
پتھر نہ ملیں۔

انہوں نے زریب دبسا، دبیساکا تکرار
شروع کر دی تھی، نہ کرتے تو سانس کیسے لیتے۔

☆☆☆

"دیکھو تمہارا پرندہ آیا ہے۔"
ضعیف نے دبیساکو پرندے کی طرف متوجہ کرنا
چاہا تھا۔ چادر کو منہ تک اوڑھ کر وہ پتھر ملی زمین پر
پچھی خشک گھاس پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں
مردوں کی طرح اندر کودھن چکی تھیں۔ جسم کی کھال کا
وہ حال ہو چکا تھا کہ اسے دیکھ کر کھن آتی تھی۔
"تمہارا پرندہ تم سے ملنا چاہتا ہے....." اس
نے پھر کہا۔

"تم ہر روز میرا سر کیوں کھاتی ہو؟ کیا اس جہنم
میں بھی مجھے سکون نہیں ملے گا۔"

"سکون انسان کے اندر ہوتا ہے دبیسا! اگر
اسے اندر سے سکون نہ ملے تو کہیں سے نہیں ملتا۔
ٹھیک ہے ہم پر خدا کی لعنت پڑ چکی ہے، لیکن اس
کے باوجود، جیسے کوئی میرے اندر کہتا ہے کہ روئے
زمین پر موجود سب انسانوں میں، میں خدا کی رحمت
کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ میری روح سے
صدائیں اٹھتی ہیں کہ خدا ہم پر کسی بھی دوسرے
انسان سے زیادہ مہربان ہے۔"

انہی کے نیچے۔۔۔ وہ سفید تھا۔ حضرت نوح
کے بیسے پرندے کی طرح، جو کبھی سے زندگی کی نوید
پلنے لگا تھا اور چونچ میں سبزہ لیے، بامراد واپس پلٹا
تھا۔

اس کا پرندہ۔۔۔ وہ بھی بامراد واپس پلٹنے والا
تھا۔

☆☆☆

دنیا کے ہر انسان کا، پوری زمین پر پورا حق تھا
لیکن ان جیسے بیماروں کا صرف اس تاریک، نوکیلے،
بدبودار حصے پر حق تھا۔ رزق حلال پر بھی ان کا حق
نہیں رہا تھا کیونکہ انہیں کوئی کام کیوں دے گا؟ وہ
ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ سکتے تھے۔۔۔ انہیں خیرات
نہیں دی جائے گی، ان کی امداد نہیں کی جائے گی،
کیونکہ وہ خدا کی طرف سے پھٹکارے گئے تھے۔

وہ بازار میں خرید و فروخت نہیں کر سکتے تھے۔
انہیں کوڑا کرکٹ میں سے چیزیں چھنی پڑتی تھیں۔
وہ کسی صحت مند انسان کا راستہ نہیں کاٹیں گے۔ ہوا
کے مخالف سمت چلیں گے۔ مخصوص کپڑے پہنیں
گے، گھنٹیوں کا شور کیے بغیر نہیں چلیں گے، خدا پر اپنا
حق نہیں جتائیں گے، اسے پکارنے کی جرات نہیں
کریں گے۔ بد بخت۔

وہ ضعیف تھا اور بھوک سے مجبور ہو کر سرائے کی
طرف گیا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر سے اس کے ہاتھ کچھ
نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں کیسے وہ ایک بچے سے ٹکرا گیا
تھا۔ بچہ اس کے جسم کے نیچے دب گیا تھا۔ بچے کی
چینوں سے سارا شہر لرز اٹھا تھا۔ اسے بچے کی جان
اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر
بچے سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک کوزھی ہی تو
چاہتا تھا کہ اب اس کے بعد کوئی اور کوزھی نہ ہو۔

جب وہ لوٹا تھا تو زخموں سے چور اور لہو لہان
تھا۔ سب سے بری حالت اس کی آنکھ کی تھی، جو پتھر
کی ضرب سے پھوڑ دی گئی تھی۔ ضبط کے سب سمندر
پانی مٹنے کے باوجود وہ درد سے بلہا رہا تھا۔ گھائیاں
اس کی کراہوں سے گونج رہی تھیں۔

باقی سب چکے چکے اپنے آنسو صاف کر رہے
تھے۔ دوا ان کے پاس کہاں ہوتی تھی۔ ان کے پاس
تو ”دعا“ بھی نہیں رہی تھی۔ دیسا اونچی گھائی پر بیٹھی
سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ بوڑھے کا
واویلا چپ چاپ سنتی رہی تھی۔ یہ تو ہر روز کا معمول
تھا، کوئی نہ کوئی ایسے ہی بلہاتا ہوا واپس آتا تھا۔ وہ
تکلیف کے سمندر میں غرق تھے، ان کے پانیوں میں
پتھر پڑتے ہی رجتے تھے۔ وہ کراہتے، روتے،
بلہاتے ہی رجتے تھے۔

بہت دیر بعد وہ نیچے اتری تھی۔ بوڑھے کی
حالت دیکھ کر اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔
”کیا ہوا؟“ وہ گھٹنوں کے بل، پتھر ملی زمین
پر بوڑھے کے بستر کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ایک گندی
سی پٹی اس نے اپنی آنکھ پر لپیٹ لی تھی۔ لیکن خون تھا
کہہ رکھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تکلیف تھی کہ بے
چارے کو کسی بل چین نہیں تھا۔

”میں نے پوچھا کیا ہوا؟“ وہ پوری قوت سے
چلائی تھی۔ وہ سب جانتی تھی کیا ہوا ہوگا لیکن پھر بھی
پوچھ رہی تھی۔

”تم اندھی تو نہیں ہو۔ نظر نہیں آ رہا کیا۔۔۔“
ضعیف کو اس کے چلانے پر غصہ آ گیا تھا۔

”آپ نے وہی پتھر اٹھا کر ان کے سروں پر
کیوں نہیں دے مارا؟“ وہ بھڑک اٹھی تھی۔ غصے کی
زیادتی سے کانپنے لگی تھی۔

سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ بھلا
ایسی بات بھی وہاں کوئی کرتا تھا۔

”دوبارہ یہاں کوئی پتھر کھا کر واپس نہیں آئے
گا۔۔۔ سن لیں سب۔۔۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر لٹکا کر
کہا۔

پرندہ پوری شدت سے اپنے پر پھڑپھڑانے لگا
تھا۔ زمانے گزر گئے تھے، برائی دیسا اب زندہ ہوئی
تھی۔ پرندہ گھائیاں سے نکل کر شہر کی طرف جا رہا
تھا۔ دیسا نے پرندے کو شہر کی طرف جاتے
ہوئے دیکھا تو دمک رہ گئی۔ وہ اس طرف نہیں جاتا

کیوں دیا؟

وہ نکلی سے ہنس دی۔ ”ذہانت، عقل و شعور
جراثیم..... یہ سب خواب تھے جو میں نے بھی دیکھے
تھے۔“

بدلتی پھر اڑا تھا۔ دور آسمان پر پرندوں کے غول
کے غول کسی ایک جگہ کی طرف چنے چلے آ رہے
تھے۔ وہ اتنے زیادہ تھے کہ سارے آسمان پر چھا گئے
تھے۔ بدلتی بھی اسی طرف گیا تھا۔
”جاؤ اپنے بدلتی کے پیچھے.....“ ضعیف نے ہنس
کر کہا۔

”نکل جاؤ اس کے ساتھ آوارہ گردی
کرنے۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اس طرف کوئی
جانور مر گیا تھا، جس کے گرد پرندوں کے غول کے
غول منڈلا رہے تھے۔ قدم قدم وہ اس طرف جا رہی
تھی۔ پہلے وہ بلند پر چڑھی، پھر ڈھلان اترنے لگی
تھی۔ کچھ پرندے زمین پر اتر رہے تھے، کچھ ہوا میں
دائروں میں چکرار رہے تھے۔ سارا واویلا نیچے
ڈھلان پر چھا تھا۔ بدلتی اسے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ
اس کی طرف چلی گئی تھی..... اور ڈھلان اترتے اترتے
ایک دم رک گئی۔

جس کی آنکھ پھوڑی گئی تھی، وہ زندگی سے منہ
موڑ کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند چکا تھا۔

وہ گہرا سانس کھینچ کر بوڑھے کے قریب آئی۔
جو جیتے جی مرا تھا، اب وہ واقعی میں مر چکا تھا۔ بھلا
ایک کوڑھی کے مرنے پر پرندوں کی آمد کا کیا مقصد
تھا۔ اتنا واویلا کس لیے؟ زمین جو اس کی سانسوں پر
تک تھی، اب اس کے مردہ وجود پر بھی تک رہے
گی۔ چپ چاپ کھڑی وہ کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی
رہی۔

اس کی آنکھیں بند تھیں، سر ایک طرف ڈھلکا
ہوا تھا، اس کے زخموں سے خون رستا رہا تھا، لیکن اب
اس کے انہی زخموں سے سکون برس رہا تھا۔ ابدی
سکون دنیا میں اس وقت کہیں تھا، تو وہ بوڑھے کے
مردہ چہرے پر تھا۔ وہ اتنا خوش دکھائی دیتا تھا، جتنا

یہ سوال، اس نے آنے والے ہر دن خود سے
کیا تھا۔ غار کے دہانے پر بیٹھ کر، سر تک کی تاریکیوں
میں بھٹک کر، سمندر کی ہوا کے تھپڑے کھا کر، دھوپ
کی ٹپس سہہ کر، رات کی تنہائی اور دن کی سختیاں جھیل
کر۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، یہ سوال اس کے
اندر چٹکاری سے آگ بٹاتا جا رہا تھا۔ ساری دنیا نے
اسے چھوڑ دیا لیکن خدا نے کیوں چھوڑا..... دنیا سے
اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، لیکن خدا تو اس کا تھا۔

دن کے پہرے، رات کے پہرے، اس نے اپنی
پوری ہستی اس سوال میں ڈھال دی تھی۔ اسے کوڑھ
سے شفا نہ ملے لیکن اس سوال کا جواب مل جائے۔
جس خدا نے اسے اپنا بندہ بنایا..... پھر اس نے اسے
لعنتی کیوں بنا دیا؟

اسے پتھروں سے سر جوڑ کر بیٹھنے کی عادت پڑ
چکی تھی۔ سر کے پیچھے زخم بن چکے تھے۔ نہ وہ عادت
چھوڑ رہی تھی، نہ زخم مندمل ہو رہے تھے۔ ان کے زخم
ویسے بھی مندمل نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس دن بھی وہ
ایک تنگ منہ والے غار کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی
کہ اس کا پرندہ اس کے شانے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس
نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”تم بھی بالکل مجھ پر مئے ہو۔ ہر وقت آوارہ
گردی کرتے رہتے ہو۔“

”پر تم تو یہاں پتھروں سے سر جوڑ کر بیٹھی رہتی
ہو۔“ ضعیف نے مذاقاً کہا۔

اس نے انگلی سے اپنا سر ٹھوکا۔ ”یہاں.....
یہاں سے میں پتا نہیں کہاں کہاں پہنچ جاتی ہوں۔“
”تو پھر تمہارے پرندے کو بھی ویسا کہنا
چاہیے.....“

وہ ذرا سا چوکی۔ ”مجھے اس کے اشارے پسند
ہیں، یہ اچھے راستے دکھاتا ہے۔ میرا خیال ہے
اسے ”بدلتی“ کہنا چاہیے.....“
”بدلتی..... اچھا نام ہے..... راستہ دکھانے
والا۔ واہ تمہاری ذہانت ادٹ آئی ہے۔“

ساری دنیا مل کر بھی اسے نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کی موت کی ایک ایک نشانی گواہی دے رہی تھی کہ اسے دنیا سے رہائی نہیں ملی،

”اسے خدا مل گیا ہے۔“

کھڑے کھڑے دیسا نے آس پاس نظر دوڑائی۔ اس روشنی پر جو بوڑھے کے مردہ وجود پر بڑھ رہی تھی۔ اس زمین پر جو ابھی بھی دلدل نہیں بنی تھی۔ اس ہوا پر جو ایک زندہ کوڑھی اور مردہ کوڑھی پر ہمیشہ کی طرح مہربان تھی۔ اگر خدا انہیں چھوڑ چکا تھا، تو اس نے ان کی ہوا کیوں نہیں چھین لی؟ ان کی روشنی؟ اگر وہ ایسے ہی بد بخت تھے تو ان کے بد بخت دل آسمان کی طرف کیوں کھینچے تھے؟ اگر وہ ایسے ہی ناپاک تھے، تو ان کے ناپاک دلوں سے ”خدا“ کا نام مٹ کیوں نہیں گیا تھا؟ شیطان پر جب لعنت بھیجی گئی تھی تو اسے تو یہی توفیق سے ہی خارج کر دیا گیا تھا، ان پر لعنت بھیجی گئی تھی تو بھی..... تو بھی..... وہ گھٹنوں کے بل جھک کر بوڑھے کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا مردہ ہاتھ تھام لیا۔

”اگر خدا نے واقعی ہمیں چھوڑ دیا ہے، تو اس نے ہم کوڑھیوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے لیے رحم سے کیوں بھر دیا ہے۔ اس نے ہمیں ایک دوسرے کا سہارا کیوں بنا دیا ہے۔ ہماری ناپاک روجوں کو اس نے، رحم کی پاکیزگی سے کیوں نوازا ہے؟“ وہ سسکنے لگی تھی۔ بوڑھے کی موت پر نہیں، اپنے سوال کی زندگی پر۔

اسے تمام سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ زمین پر بھی ہر شے، آسمان تک بلند ہر شے نے اسے جواب دے دیا تھا۔

”خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا..... بلکہ اس نے ہمیں اپنے قریب کر لیا ہے۔“ وہ بھاگ کر گھائیوں میں داہن آئی اور اس نے چلا کر کہا۔ وہ سب اپنے اپنے گھکانوں پر کھڑے اسے حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

”ہماری زبانیں ناپاک ہیں، نہ ہماری روجیں

غلیظ ہیں۔ ہم لعنتی ہیں نہ بد بختی ہمارا مقدر ہے..... یہ ان انسانوں.....“ اس نے شہر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ان انسانوں کی ہٹائی قصہ کہانیاں ہیں۔ یہ ان کی اور ہماری آزمائش ہے۔ وہ اپنی آزمائش میں تالاق رہے، ہم اپنی آزمائش میں صابر رہے۔ دیکھو سورج کو، جو ہماری رات کو صبح میں بدلتا ہے۔ اس ہوا کو محسوس کرو، جو ہمارے زخموں کو سہلاتی ہے اور نیند..... ہماری آنکھوں سے نیند جدا نہیں ہوئی..... اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ”نیند“ ہمارے نبیوں نے ہمیں سکھایا کہ اللہ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی ”نیند“ ہے۔ خدا نے ہم سے کچھ نہیں چھینا..... جو کیا..... اس زمین کے انسانوں نے کیا۔“

”لیکن اس نے ہماری تندرستی چھین کر اسے بیماری میں بدل دیا۔“

وہ بھاگ کر ضعیفہ کے پاس آئی تھی۔ ”یاد کرو، تم نے مجھے خدا کی مرضی زمین پر لانے کے لیے کہا تھا۔ پھر یہ بات تم خود ہی بھول گئیں۔ خدا کے حکم سے یہ بات تمہارے منہ سے نکلی تھی۔ یہ خدائی اشارہ ہے..... یہ سب خدائی اشارے ہیں۔ اس آسمان کا خدا کل بھی ہمارا تھا اور آج بھی ہمارا ہے۔“ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ وہی دیسا بن چکی تھی جو والد کے ہاتھ پاندھا کرتی تھی اور جو والد کو ناامیدی سے ڈرایا کرتی تھی۔

”آؤ سب مل کر اپنے رب کو پکاریں کیونکہ وہ یہی چاہتا ہے۔ اپنی چاہت کے لیے اس نے ہمیں چنا ہے۔ ہمیں دنیا سے الگ کر کے، ہماری روجوں کو رحم سے بھر کر، ہمیں تکلیف سے گزار کر، ہمیں خاک سے نور کر کے، ہمیں بدتر سے بلند کر کے، ہمیں کوڑھ سے اپنے قریب کر کے..... وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے پکاریں..... ہمارے رب نے ہمیں چنا ہے۔ ہمیں اس کے انتخاب پر شکر ادا کرنا ہے۔“

سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اتنی خوش تھی کہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔

”آؤ اسے ایسے پکاریں کہ اس کی مرضی،
ہمارے لیے معجزہ بن جائے۔ کوڑھ کو شفا اور ہمیں
ہمارا ”خدا“ مل جائے۔“

☆☆☆

”امید یقین میں اور یقین معجزوں میں بدلتے
ہیں ہڈی!“ فرشتہ کہہ رہا تھا۔

”اللہ نے میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کیا؟“
ہوش میں آنے کے بعد اس نے پہلا سوال کیا تھا۔

وہ مسجد جا چکی تھی۔ تین دن کو ماں میں رہنے کے
بعد وہ ہوش میں آئی تھی۔ تین ہفتے..... وہ اس اور

اُس زندگی کے درمیان رہی تھی۔ اور ایک دن اللہ
سے قریب رہنے کے بعد، وہ اس سے دس قدم دور ہو

چکی تھی۔ تکلیف ملتی ہے تو پہلا سوال ”کیوں“
ہوتا ہے۔ ”میں ہی کیوں“ ”مجھ پر ہی کیوں؟“

”تم اتنی آسائشوں میں پیدا ہوئیں۔ تمہیں
دنیا جہاں کی نعمتیں، راحتیں میسر رہیں۔ تم پوری طرح

سے تندرست رہیں، تب تم نے اللہ سے سوال کیا کہ
اس نے تمہیں اتنا کچھ کس لیے دیا؟ اور کیوں؟ جو

انسان ناشکری کرتا ہے، براوہ نہیں ہے، براوہ ہے جو
کبھی شکر گزار ہی نہیں ہوا۔“

”کیا تکلیفیں زندگی کی قیمت ہیں؟“ وہ سسکتے
ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس کی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔

”کیا راحتیں زندگی کی حقیقت ہیں؟“ وہ بھی
پوچھ رہا تھا۔

وہ شکایتی انداز سے فرشتے کو دیکھ رہی تھی۔
”کیا انسان تکلیف پر رو بھی نہیں سکتا۔“

”رونے اور دادیلے میں فرق ہوتا ہے۔“
”میں کبھی مذہبی نہیں رہی۔ کیا یہ اس کی سزا

ہے..... کیا..... کیا میں کافر اور گناہ گار ہوں؟ یہ اس
سب کی سزا ہے؟“

فرشتے نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تم نے
ایسی خوفناک بات کہاں سے سیکھی؟“

وہ جھجکی تھی۔ ”مسجد میں کچھ لڑکیوں نے مجھے
بچکان لیا تھا۔ ان کی باتیں میں نے سن لی تھیں۔ وہ

کہہ رہی تھیں کہ میں بھٹکی ہوئی ہوں۔ میں کافر اور
گناہ گاہ ہوں۔ اللہ نے مجھے میرے اعمال کی سزا دی
ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر بندہ اپنے رب کی طرف
سیدھی طرح سے نہ آئے تو اسے طوعاً و کرہاً آنا
پڑتا ہے..... اور کینسر مجھے گھسیٹ کر خدا کے پاس
لے آیا ہے۔“

فرشتے نے ایک گہری سانس لی تھی۔ ”طوعاً و
کرہاً..... خوشی سے ورنہ زبردستی..... اس دنیا کے

انسان کی سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ جس کام کا
اسے اختیار ہی نہیں دیا گیا، یہ اسی کام کو

کرتا ہے۔ دوسروں کے اعمال کا حاصل جمع نکال کر
انہیں ان کا انجام بتانے کا۔ وہ جنتی ہیں یا جہنمی،

انہیں یاد دلاتے رہنے کا۔
جن لوگوں نے دیسا کو پتھر مارے، اسے لعنتی

اور سیاہ کار کہا، ان لوگوں کی نسلیں اس صدی میں بھی
زندہ ہیں۔ وہ آج بھی بیماروں کو، ”اعمال کی سزا“ کا

عندہ دے رہی ہیں۔ وہ آج بھی ”تم بھٹکے ہوئے
تھے، تمہیں اپنی طرف بلانے کے لیے اللہ نے یہ

مصیبت نازل کی ہے“ کے پتھر مار رہے ہیں۔ طوعاً و
کرہاً ورنہ گھسیٹ کر..... یہ اس صدی کے انسان

کے کنگر ہیں۔
تم نے اپنے رب کے بارے میں ایسا گمان

کیوں کیا ہڈی؟ حضرت ایوبؑ تیس سال تک بیمار
رہے تھے۔ وہ پہلے سے ہی اللہ کی طرف متوجہ

تھے..... پھر وہ بیمار کیوں ہوئے؟ لاکھوں، کروڑوں
بچے پیدا ہوتے ہی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا

ہو جاتے ہیں۔ کیا اس لیے کہ اللہ ان سے ناراض ہوتا
ہے؟ یا وہ اللہ کی حکم عدولی کرتے ہیں؟

سب سے زیادہ مشکلیں نبیوں، پیغمبروں نے
جھیلی ہیں۔ سیدھا راستہ دکھانے والوں کے راستے

ہمیشہ کھن رہے ہیں۔ تو کیا اللہ ان سے ناراض تھا،
اس لیے ان کے راستے میں مشکلیں رکھ دیں؟ آج

کی اس دنیا میں بھی، جو جتنا سچا، ایمان دار، پاک باز
ہے، وہ اتنی ہی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے..... اس

پالیا تو باقی کیا بچا۔

تم سچی نہیں بند ہو، اور وہ تمہیں تو ذکر ”موتی“ بنا دیتا چاہتا ہے۔

ہر دل جو تکلیف سہتا ہے، وہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ سوچو، عبادت میں افضل عبادت روزہ رکھنا ہے۔ تو کیا تم یہ کہو گی کہ اللہ بھوکا رکھوا کر ثواب کا لالچ دے رہا ہے۔ وہ تمہیں ویسے ہی ثواب کیوں نہیں دے دیتا؟ تم سے کھانا پینا چھڑوا کر اللہ کیا کروانا چاہتا ہے؟

جسم کو بھوکا رکھوا کر، اللہ روح کو غذا دلواتا ہے۔ ایک کی بھوک، پیاس، صبر، برداشت، دوسرے کی روحانی طاقت ہے۔ تم جیسی ماڈرن لڑکی کو میں یہ بھی بتا دوں کہ آج تک دنیا میں، سائنس یا ترقی کے نام پر جتنے بھی معجزے ہوئے ہیں، وہ ”روحانی طاقت“ سے ہوئے ہیں۔ جسمانی طاقت سے کبھی کچھ ظہور پذیر نہیں ہوتا۔

دنیا میں اموات کی تیسری بڑی وجہ، ذہنی امراض، ڈپریشن، بے چینی، مایوسی ہے۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ ہمارے پاس ان سب بیماریوں سے لڑنے کے لیے ہتھیار ہیں نہ طاقت..... ذہن میں جنگیں ہر پاہیں اور انسان یہ جنگیں ہارتا جا رہا ہے، اپنی زندگی سے ہاتھ دھو رہا ہے..... کیونکہ وہ سب سے بڑی طاقت ”روحانی طاقت“ کو بیدار کرنے میں ناکام جا رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ روحانی طاقت صرف روزے سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ سب سے آسان طریقہ ہے اسے حاصل کرنے کا۔

تمہاری کھانے پینے کی طلب کو تو ذکر اللہ تمہیں اتنی بڑی طاقت دے رہا ہے، تم اپنے رب کے معاملات میں شک کیسے کر سکتی ہو۔ وہ بیماری ہو یا کوئی اور تکلیف۔ تم اس پر سوال کیسے اٹھا سکتی ہو؟

”کتنے با علم اور با خبر ہو تم۔“ وہ اس کی ذہانت پر حیران تھی۔

”میں نہیں ہدی اتم..... سارا علم، سب خبریں

لیے کہ ہدی کہ نیکی کا راستہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے ہی ان کا مقام بلند ہوتا ہے۔ کیا تم نے سوچا کہ وہ تمہیں عام سے خاص کرنا چاہتا ہے؟

”مجھے.....؟ کس لیے؟ میں نیک اور اچھی لڑکی نہیں ہوں۔“

”دینے والے کی ”چاہت“۔ اس کی چاہت کہ تمہیں اپنی بندگی کے لیے بنایا، اس کی چاہت کہ تمہیں بلند مقام کے لیے چاہتا ہے۔“

وہ چونک گئی۔ ”اللہ کی چاہت..... میں؟“

”کیوں نہیں..... اللہ کی چاہت، یہی ہے انسان کا اصل نصیب۔ تم نے اپنی بیماری کو اس کی چاہت سے کیوں نہیں دیکھا۔ وہ مت سوچو جو لوگ چاہتے ہیں کہ تم سوچو۔ اپنے رب کو اس گمان کے ساتھ نہ رکھو، جس گمان پر انہوں نے رب کو رکھا ہوا ہے۔ تم گناہ گار ہو، سیاہ کار ہو، نیک ہو، اچھی یا بری جو بھی ہو، اس فیصلے کا اختیار صرف اور صرف اللہ کے پاس رہنے دو۔ وہ اپنے فیصلوں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

مصیبت، تکلیف، پریشانی یا بیماری، اسے اللہ کا قہر یا عذاب سمجھنا چھوڑ دو۔ جب بادلوں کا سینہ شق ہوتا ہے تو آب برستا ہے۔ ہر شے جو ٹوٹتی ہے، وہ ایک نئی صورت میں بدل جاتی ہے۔ کوئلیں، بچے، پھول، درخت، جنگل، سبزہ..... یہ انقلاب جج کی توڑ سے برپا ہوتا ہے۔ زمین کا سینہ شق ہوتا ہے تو جہاں، باغ و بہار ہوتا ہے۔ زمین پر اڑیوں کی ضرب پڑتی ہے تو چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔ ماں پر تکلیف کا باب کھلتا ہے، تو ہی نئی روح کو راستہ ملتا ہے..... نئی روح..... ایک اور انسان..... ایک اور مقام.....

ایمان کے لیے انسان کا سینہ شق کرنا پڑتا ہے۔ جاہلانہ عقیدوں پر ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ پچھلے لوگوں کو اپنے پتھر کے خدا توڑنے پڑے تھے، تب ہی وہ ”واحد ولا شریک“ پر ایمان لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جھوٹے خدائی کے دعوے داروں کو توڑا تو سچائی کو پایا۔ ہدی اکیا انسان گھالے میں رہا؟ ایمان

جہیں دی گئی ہیں..... انسان کو.....“

”مجھے.....؟ ہدیٰ کو؟“ اسے اپنی چوبیس سالہ زندگی یاد آئی۔ ”ایسی غفلت، ایسی جاہلیت۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔ ”ہدیٰ! تم نے علم کی کوئی ایک بات نہیں سیکھی..... کیوں؟“ وہ خود سے ہی شکوہ کر رہی تھی۔ ”تم نے اپنے رب کو کسی ایک بھی خوبی سے نہیں پہچانا..... کیوں؟“ وہ خود پر افسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

”عام طور پر موت کی دھمکی انسان کو اپنی زندگی سے زیادہ باخبر کر دیتی ہے۔“ (پاؤ لو کوئیلا ہو)
”مجھے کینسر کا تھوہ دیا گیا کیونکہ اس کے ذریعے اللہ نے مجھے تبدیل ہونے کا موقعہ دیا۔“ (علی ہنت)
اور اب وہ باخبر ہو چکی تھی..... اس لیے.....
”میں اپنی بیماری کو قبول کرتی ہوں.....“ وہ مضبوط انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”روحانی طاقت اور زندگی کے لیے، اپنے رب کا مقصود پانے، خود کو پوری طرح سے، علم اور یقین کے حوالے کرنے کے لیے..... میں..... میں ہدیٰ! میں اپنی بیماری کو تکلیف نہیں، مصیبت نہیں، سزا نہیں، انعام کی صورت میں قبول کرتی ہوں۔“

فرشتے نے اسے خوشی سے دیکھا۔ ”مجھے خوشی ہے..... یہی میرا کام تھا، تمہیں سمجھانا، راستہ دکھانا۔“
”کیا میں ٹھیک ہو سکتی ہوں؟“ اس نے سب سے اہم سوال پوچھا تھا۔

”شک کرنا چھوڑ دو.....“ اس نے سب سے اہم جواب دیا تھا۔

”میں ٹھیک ہونا چاہتی ہوں..... شفا یاب۔“
”وقت کی مقدار اور کتنی کو بھول جاؤ۔ اپنا حوصلہ پہاڑ بنا لو اور اپنی ہمت آسمان..... خدا سے تجارت شروع کر دو.....“

”تجارت؟“ فرشتہ اسے حیران کر رہا تھا لیکن اس بار کچھ زیادہ ہی حیران کر دیا تھا کہ بے ساختہ اس کا منہ کھل گیا تھا۔

”تمہاری زبان میں ”بزئس“ انویسٹمنٹ

شروع کر دو اللہ کے ساتھ۔ جو دے سکتی ہو، دے دو، پھر اس سے وہ مانگ لو جو اس سے لینا چاہتی ہو۔“
”کہنا عجیب لگ رہا ہے لیکن شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تم مجھے اللہ کے ساتھ بزئس کرنے کے لیے کہہ رہے ہو؟“

”بالکل..... اللہ کو قرضہ حسنہ دو، اللہ معاملات میں بہترین ہے۔ اللہ کے ساتھ بزئس کرنے سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ سب انویسٹ کر دو، سب..... اس کا وعدہ ہے کہ اس کے ساتھ بزئس کرنے والا کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ ایسا بزئس ہزار گنا سے زیادہ منافع میں جاتا ہے اور اللہ کے ہزار گنا کو اپنے حساب کتاب کے ہزار گنا میں نہ گننا۔ اللہ کی کوئی اور وزن کے پیمانے انسان کبھی نہیں بنا سکے گا۔“

وہ ابھی تک ہکا بکا تھی۔ اس نے بے یقینی سے اپنی ٹھوڑی بھی کھجائی تھی۔ اس نے مذہب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، ساری دنیا، پوری مخلوق نے مل ملا کر لفظ ”مذہب“ کو اتنا زیادہ بدنام کر دیا ہے کہ اس کا مطالعہ کرنا، جرم کرنے کے برابر لگتا ہے۔ ہر انسان مذہب سے ایسے دور بھاگ رہا ہے جیسے اس سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا چیز کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

”اچھا..... تو میں کیا انویسٹ کروں؟“ یقین اسے ابھی تجھی نہیں آیا تھا لیکن پھر بھی وہ پوچھ رہی تھی۔

”کچھ بھی..... جو دے سکتی ہو، وہ دے دو تو، بدلے میں تمہیں اس کا منافع مل جائے گا۔“

”اچھا..... کیا میں بے چینی دے سکتی ہوں؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”بالکل..... دے دو..... بدلے میں قرارداد مل جائے گا.....“

”کیا واقعی..... میری بے چینی بھی انویسٹ ہو سکتی ہے؟“

”بالکل ہو سکتی ہے..... اپنی توجہ، اپنی محبت، اپنی شکرگزاری، اپنا صبر، اپنا درد، اپنی تکلیف، سب

دے دو۔ اپنا سب کچھ انویسٹ کر دو۔ کسی چیز کو معمولی نہ سمجھو۔ اللہ ہر چیز سے ڈیل کرتا ہے۔ ہر چیز انویسٹ ہوتی ہے اس کے بزنس میں۔ دھمی دلوں کو دی جانے والی تسلی اور مصحوم دلوں کو دی جانے والی مسکراہٹ تو عام طور پر۔۔۔

”میری بے قراری۔۔۔ میرا غصہ۔۔۔ میرا بے مبراہن بھی؟“

”یہ تو سب سے پہلے۔۔۔ سب سے بڑی انویسٹمنٹ تھی ”مفتی جذموں“ کی ہوئی ہے۔ سب بدلتا تمہارے لفظ بھی، تمہاری خاموشی بھی۔ تم اس کے لیے مبراہن کرنا شروع کر دو۔ تم اس کے لیے تکلیف کو قبول کر لو، تم اس کے لیے اس تکلیف سے نکلنے کا چارہ کرنا شروع کر دو۔ تم اس کے لیے مسکرا دو۔ تم اس کے لیے اپنی بے چینی کا گھاموٹ دو۔ تم اس کے لیے پرسکون ہو جاؤ، تم اس کے لیے ”مبراہن“ سے رہو۔ تم اس کے لیے بے مبراہن چھوڑ دو، تم اس کے لیے امت سے کام لو، تنہائی سے نکل آؤ۔ یہ سب تم اس کے لیے کرتی جاؤ۔ اور پھر وہ تمہارے لیے سب کر دے گا۔“

”کیا اللہ اتنا کچھ۔۔۔“ سوال اچھورا رہ گیا تھا۔ فرشتے نے ”کیا“ سے بات اچھنی تھی۔
”خدا کے اختیار پر بھی ”کیا“ کا سوال نہیں اٹھاتے بدی۔“ ”کیا“ بہت بڑا اعتراض ہے۔ کیا وہ میری مدد کرے گا، کیا وہ مجھے معاف کرے گا۔ کیا وہ مجھے سزا دے گا، کیا وہ۔۔۔ اللہ ہمیشہ موجود رہا ہے، وہ کبھی ”کیا“ نہیں ہوتا۔ اس لفظ کو اپنے دل سے نکال دو۔۔۔ اللہ کی صفات پر ”کیا“ نہیں لگ سکتا۔ وہ تو کن کہتا ہے اور فیکٹوں ہو جاتا ہے۔ کیا (سوال، شک) کو تو پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ کیا (شک) کو شیطان نے بنایا اور انسان کو تھما دیا۔“

بدی کو جیسے سارے جہاں کی دولت مل گئی تھی۔
”کمال ہو گیا۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔ ”کتنی بے وقوف رہی ہوں میں۔“

”ہاں۔۔۔ بہت بڑی فول۔۔۔“ فرشتہ ہر بار

اسے اچھے الفاظ میں تسلی دینے والا نہیں تھا۔ اس کا بھی حق بنتا تھا۔

اس نے بے ساختہ قبضہ لگایا۔ ”ہاں غل۔۔۔“ فول۔۔۔ ”فول نے ماما کے لائے پھولوں میں سے ایک پھول نکال کر پکڑ لیا۔

”میری سکی انویسٹمنٹ۔۔۔“ اس نے کمرے سے باہر قدم بڑھا دیے تھے۔

”یہ آپ کے حصے کا پھول اور خوشبو۔ مجھے اللہ کے باغ میں آپ کے نام سے کھلا ہوا مل، سوچا اللہ کے جہاں میں کھلے ہوئے دوسرے پھول کو دے دیں۔ آپ کو۔۔۔“ دوسرا تھوڑے کمرے میں آئی تھی، جہاں دو بچوں کی اٹھائیس سالہ ماں اینڈرٹ تھی۔ وہ بھی کینسر کے مرض میں مبتلا تھی۔ اس نے ایسے محبت بھرے انداز سے کہا تھا کہ وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

”پھول، پھول کو پھول دے رہا ہے۔“ پھول لیتے ہوئے ہنس کر کہا۔

شوہر نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں دونوں ایسے باتیں کرنے لگیں جیسے ایک ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی ہوں۔ تھوڑا وقت اور گزرا تو دونوں کے پسند و ناگفتہ بہوں سے دیواریں گونجنے لگی تھیں۔ یہ سب ایسے ہی جاری رہتا تو، ہاسپٹل کی چھت گرنے کا خطرہ بڑھ سکتا تھا۔ لڑکیاں جب مل بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں، تو یقیناً جانیں زمین کے پھٹنے تک کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

انسان، کسی دوسرے انسان کو جو سب سے زیادہ قیمتی چیز دے سکتا ہے، وہ اس کا ”وقت“ ہے۔ اللہ کے پاس جو بہترین چیز انویسٹ کر دیا سکتا ہے، وہ دوسرے انسان کو دی جانے والی ”مسکراہٹ“ ہے۔ انسانوں کو دیا جانے والا وقت، ان کے چہروں پر کھائی جانے والی مسکراہٹ اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ دوسروں کی راہ سے بننے والے کانٹے، اللہ کو پھولوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ اب وہ یہ پھول حاصل کرنے والی تھی۔

کھاتے چن کر اپنے لیے گھدستہ بنانے والی تھی۔
☆☆☆

”وہ امریکا کے بہترین ہسپتال میں علاج کروا رہی تھی۔ اس کے پاس دنیا کی کسی چیز کی کمی نہیں تھی، کئی تھی تو بس صحت کی۔ جو چیز وہ لاکھوں کروڑوں لگا کر بھی حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ چیز لاکھوں کروڑوں کو مفت ملی ہوئی تھی۔ بات قدر کی ہوتی ہے۔ بھی وہ بھی ان لاکھوں کروڑوں لوگوں میں شمار ہوتی تھی تب وہ ناقدری تھی۔۔۔۔۔ آج اسے قدر ہوئی تھی۔

اسے فکر رہتی تھی اپنی خوب صورتی، جلد، بالوں، ناخن، حتیٰ کہ پیروں کی ایڑیوں تک کی۔ نہیں رہتی تھی تو سب سے قیمتی شے زندگی کی نہیں رہتی تھی۔

زندگی سے زیادہ اہمیت تو اس نے جیتے کی کھال سے بے جوتوں کو دے دی تھی۔ جن کی قیمت تک اسے یاد تھی۔ نہیں یاد تھی تو اپنی ”زندگی کی قیمت“ چونکہ انسان زندگی کو خریدتا نہیں ہے اور دینے والا اسے بیچتا نہیں ہے تو وہ بھی اس کی اہمیت سے واقف ہی نہیں ہو پاتا۔ کل ملائکہ کا سجدہ، اشرف ہونے کا شرف، کائنات کی ہر شے کو تسخیر کرنے کا علم، بندگی کا رتبہ، انسانیت کی معراج، دنیا میں امن کا تاج، ترقی کا عنادیہ، اپنی پہچان کا ہنر۔۔۔۔۔ یہ ہے اس کی اہمیت۔ اور اپنی قیمتی زندگی کو یہ انسان گھٹیا سی چیزوں کے لیے فکرا نذا کر دیتا ہے۔

”مجھے میسے چاہئیں پاپا!“ وہ دو دن سے گھر آئی ہوئی تھی۔ یونانی طرز کا تازہ پھولوں سے بنایا تاج سر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ خود بھی ان پھولوں کی طرح مہلکی ہوئی تھی۔ وہ یونانی دیوی تو نہیں تھی، لیکن اسے خوش کرنے کے لیے مان لیتے ہیں کہ وہ یونانی دیوی ہی لگ رہی تھی۔ گھر کے لان میں ہی چھوٹی سی پکنک کر رہی تھی۔ پاپا اس کے لیے سب کاٹ رہے تھے۔ اور وہ باسکٹ میں سے باقی چیزیں نکال نکال کر پکنک شیٹ پر بچھا رہی تھی۔ ابھی وہ چولہا بھی سیٹ کرے گی اور اس پر کچھ پکانے کی کوشش بھی کرے گی۔ کھائے

گی پھر وہ اکیلی ہی۔

”کتنے۔۔۔۔۔؟“ اس نے آج تک میسے مانگ کر نہیں لیے تھے۔ ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اس کا اپنا پرسنل اکاؤنٹ تھا، ہر مہینے اس کے اکاؤنٹ میں میسے ٹرانسفر ہوتے رہتے تھے۔ پاپا کے سب وی وی آئی پی کارڈز بھی اس کی دسترس میں رہتے تھے۔

”جتنے آپ دے سکیں۔“ ان دنوں اس کے پاس جو سب سے خوب صورت چیز تھی، وہ اس کی بے ساختہ مسکراہٹ تھی۔

پاپا اسے ناچھی سے دیکھ رہے تھے۔ ”جتنے تم لینا چاہو، میں اتنے دے سکتا ہوں،“ سیب کی قاش اس کے منہ میں ڈالی۔

”میں سب لینا چاہتی ہوں۔ بھاری انویسٹمنٹ کر رہی ہوں میں۔۔۔۔۔ بہت بڑی والی ڈیل۔۔۔۔۔“ ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ ”بہت بڑی مطلب، بہت تبت تبت ہی بڑی۔۔۔۔۔“ وہ ہنس دیے۔

”اچھا۔۔۔۔۔ کیسی ڈیل اور کس کے ساتھ۔۔۔۔۔ یعنی یہ بڑی والی ڈیل؟“

”اللہ کے ساتھ۔۔۔۔۔ اپنا بزنس اسٹارٹ کر رہی ہوں۔۔۔۔۔“

”تمہاری زندگی کے لیے میں اب تک بہت کچھ چیر بئی کر چکا ہوں اور بھی دے سکتا ہوں میری جان۔“

”میں جانتی ہوں پاپا! اہم تینوں نے کبھی چیز بٹی سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ لیکن پاپا! شاید وہ سب بھی ہم نے فیشن کی طرح کیا۔ سخاوت یہ نہیں کہ ”کچھ“ دیا جائے۔ سخاوت یہ ہے کہ ”بہت کچھ“ کیا جائے۔ ہم نے وہ دیا جسے دینے سے ہماری دولت پر فرق نہیں پڑا۔ جیسے سوڈا الرز میں سے ایک پیٹی دے دینا۔ اپنا، پیٹ، نیت، نفس سب اچھی طرح سے بھرنے کے بعد دینا۔ ہم اتنا کچھ جمع کر لیتے ہیں کہ باقی کی دنیا کو خروم کر دیتے ہیں۔“

”امیر ہونا گناہ نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”لیکن امیر ہو کر غافل ہونا گناہ کبیرہ ہے۔
کچھ کو کچھ پر اسی لیے برتری دی جاتی ہے کہ وہ دنیا کو
بدلنے کے لیے آگے بڑھیں۔ لیکن ہم تو اپنے گھر،
اپنے رنگ، اپنے بال، اپنی کھال بدلنے میں لگے
رہتے ہیں۔“

”دنیا کو بدلنے میں، میں کبھی پیچھے نہیں رہا
ہوں!“

”ہاں..... لیکن تب جب آپ کو اپنی مصروفیت
سے وقت ملا۔ سال میں دو بار، ورنہ زیادہ سے زیادہ
چار پانچ بار۔ آپ نے اسے اپنا مقصد نہیں بنایا۔
آپ کا کروڑوں کا بزنس، پراپرٹی، مجھے نہیں بچا
سکی..... دیکھیں ان سب چیزوں کی قیمت کتنی معمولی
ہے۔ کیا ہم ان معمولی چیزوں کو دوسروں کے لیے
غیر معمولی بنا سکتے ہیں؟ جو چیزیں مجھے کچھ نہیں دے
سکیں، وہ دوسروں کو بہت کچھ دے سکیں گی۔
آسانیاں..... مسکرائیں..... راحتیں..... سب سے
بڑھ کر ”شفا“۔“

”کیا کرنا چاہتی ہو تم.....“

☆☆☆

اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی این
جی او سے بات ہو چکی تھی۔ وہ انہیں فنڈز اکٹھے
کر کے دینے والی تھی اور وہ کاغذ، افریقہ میں ہاسپٹل
بنانے والے تھے۔ چیرٹی کی ابتدا اس نے اپنے
آپ سے کی تھی۔

وہ اپنے ڈیرنگ روم میں آئی۔ آخری بار وہ
یہاں تب آئی تھی جب اسے کانووکیشن کے لیے تیار
ہونا تھا۔ اس کی یہ واک ان کلوزٹ تھی، اس گھر کا
سب سے بڑا حصہ تھا۔ اسے پروفیشنل کی ٹیم نے آکر
ویسے ہی سیٹ کیا تھا، جیسے بڑے برانڈ کے اسٹور
سیٹ کیے جاتے ہیں۔ ہر چیز ”شوکیس“ تھی۔ فیشن
کی دنیا کی کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں تھی جو یہاں
موجود نہ ہو۔ اگر وہ ایک ایک چیز کو گننے اور اس کی
خوبیاں گنوانے بیٹھتی تو ایک چھوٹی سی کتاب تیار
ہو سکتی تھی۔ یہاں موجود سب سے معمولی چیز اس کے

فرسلیپرز تھے جنہیں پہن کر وہ ڈیرنگ روم میں پہنچ
پھرا کرتی تھی۔ اور ان کی قیمت صرف دو ہزار پچاس
ڈالر (تین لاکھ) تھی۔

کمرے کے درمیان کھڑی ہو کر وہ گردن گھما
کر ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ ہر طرف برانڈز
خریدے گئے کچھ خاص بیگز، جیکٹس، جاکٹس، جاکٹس
کھالوں سے بنے جوتے، ہاتھ کی کارمیری کے کپڑے
نایاب نمونے..... ہر طرف نمائش تھی..... ہر طرف
پیسہ تھا۔ سفید سونے، ہر رنگ کے ہیرے موتی کے
پھاڑ تھے۔ لاکھوں ڈالر سے بنا روم، کروڑوں کی
مالیت کی ”چیزوں“ کے لیے۔ یہ سب چیزیں
اس کے کسی کام نہیں آئی تھیں۔ وہ ہاسپٹل میں اکیلی
جنگ لڑ رہی تھی۔

”سادگی ایمان..... سے ہے۔“

انسان کو سونے کے پھاڑوں میں دفن ہونے
کے لیے، ہیرے موتیوں کو اوڑھنے بچھونے کے لیے
پیدا نہیں کیا گیا۔ یہ چیزیں بس پتھر ہیں۔ لباس کتنا
بھی مہنگا ہو، بس جسم کا پردہ اور آرام ہے۔ اس سے
زیادہ اسے کچھ اور سمجھنا بے وقوفی ہے۔ اس سے زیادہ
اس پر خرچ کرنا، اس سے بڑی بے وقوفی
ہے۔ خوراک..... بس پیٹ بھرنا، بھوک ختم
کرنا..... بس..... کتنا کھاؤ گے، اور کیا کیا کھا جاؤ
گے؟

ند دولت فخر ہے..... نہ غربت لغت.....
”زندگی کا ہدف، جسم، لباس یا خوراک نہیں
ہے۔“

اگر چیزیں انسان کو خوشی دے سکتی ہیں تو وہ بس
ایک ہی صورت میں کہ ان کے ساتھ ذمہ نہ رہا
جائے۔ انہیں جڑ سمجھا جائے ”کل“ نہیں۔ ان کے
پھاڑ نہ اکٹھے کیے جائیں، انسانیت کی فلاح کی
طرف ان کے دریا بہا دیے جائیں۔ بھلا دنیا بھوک
سے مرنے ہو، اور ساری انسانیت بھوک سے مرنے ہو،
ہیرے کے لیے بڑی بڑی بولیاں لگا رہی

ہو..... ہیرا..... انسان سے بڑھ کر اس دنیا میں کون
"کو نور" ہوگا۔

اس نے سب سے پہلے اپنی سب سے پیاری
چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ گلابی ہیروں کا
ہار..... بابا نے بڑی بولی لگا کر اس کی اٹھارویں
سالگرہ کے لیے یہ گفٹ لیا تھا۔ اپنی خوبصورتی، نایابی
اور بڑی "بولی" کی وجہ سے یہ ہار اس کے دل کے
بہت قریب تھا۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس
نے ہار کو نگلنے کے ساتھ لگا لیا۔ اب وہ اسے پتھر کے
چند ٹکڑے لگے تھے..... جو سب سے قیمتی چیز شیشے
میں دکھائی دے رہی تھی، وہ، وہ خود تھی۔

"میں نے اپنی قیمتی گاڑیوں، گھڑیوں سے
چھٹکارا پایا، براڈ ڈکٹروں سے بھی۔ میں نے سب
کچھ چیر بیٹی کر دیا۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں رہی
تھی۔" (علی بنت)

انسا پر اس نے نیلامی کا آغاز کر دیا تھا۔ سب
سے پہلے گلابی ہیرے ہی نیلامی کے لیے پیش کیے
گئے تھے۔ اس کے اس قیمتی اور نایاب ہار کی نیلامی کی
خبر اس کی کینسر کی خبر سے زیادہ وائرل ہوئی تھی۔ دنیا
اسے خریدنے کے لیے پاگل ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی
کہ دنیا کو پاگل ہی ہونا ہے۔ کبھی وہ بھی اس پاگل
دنیا میں شمار ہوتی تھی۔ ایک مشہور پاپ سٹار کی جیکٹ
لینے کے لیے اس نے نیلامی کی بولی کی ساری حدیں
تار کر لی تھیں۔ اس وقت وہ انیس سال کی تھی۔ اسی
سٹار سے صرف تیس منٹ کی ایک ملاقات کے لیے
پاپا نے پورے پچاس ہزار ڈالر پے کیے تھے۔ وہ اس
سے ملنے کے لیے مری جا رہی تھی۔ اب وہ سٹار جانتا
بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی میں مر رہی ہے۔ اس کی
جیکٹ وارڈروب میں کسی ثرانی کی طرح لٹک رہی
تھی، وہ نہ اسے سانس دے رہی تھی، نہ
دوا..... پھر؟ پھر؟

عمارتیں..... چیزیں..... اور پتھر..... انسان
نے اپنا قبرستان خود تیار کر لیا ہے اور وہ جانتا بھی نہیں
ہے۔

ایک ایک کر کے وہ اپنی ساری چیزیں آن لائن
سیل کر رہی تھی۔ اس سیل کو اس جی او کی ٹیم ہی ہینڈل
کر رہی تھی۔ وہ مشہور تھی، اس کی چیزیں بھی عام نہیں
تھیں، اس لیے قیمت اچھی مل رہی تھی۔ اس نے
انٹرویو کے لیے رابطہ کرنے والوں کو بھی رسپانس دینا
شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے وہ شو پیس بننے کے لیے
تیار نہیں تھی لیکن تھوڑا بہت ایڈ جسٹ کر رہی تھی۔ وہ
فنڈز کے لیے ایکٹیو ہو چکی تھی۔ یہ وہی سوشل میڈیا تھا
جس پر اس نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت برباد کیا تھا۔
اب بھی یہ وہی سوشل میڈیا تھا، جو زندگیوں کو بچانے
کے لیے فنڈز جمع کرنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔
صراطِ مستقیم (درست سمت) ہر شے کے معنی
بدل دیتی ہے۔

اسے یہ سارے کام کرتے ہوئے پانچ مہینے
گزر چکے تھے۔ ڈاکٹرز کا بتایا گیا "موت کا وقت"
کب کا گزر چکا تھا۔ وہ زندہ تھی، پوری طرح سے
ایکٹیو تھی۔ اب وہ گاہے لگا ہے ہاسپٹل سے نکل آئی
تھی۔ ہفتے دس دن میں کسی نہ کسی ایونٹ میں چلی
جاتی تھی۔ وہ خود بھی بھول چکی تھی کہ ڈاکٹرز کا بتایا گیا
وقت آکر چلا بھی گیا۔ ماما، بابا اس کی صحت سے خوش
تھے۔ اس کے کالوں پر لالی نظر آنے لگی تھی۔ آنکھوں
کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اس نے جس چیز کے ذائقے
کا بھی مزہ نہیں چکھا تھا، اس ذائقے سے اب لطف
اندوز ہو رہی تھی۔ زندگی کے ذائقے سے۔

تین تین گھنٹے وہ سیلون میں گزار دیا کرتی تھی۔
اب انہی تین چار گھنٹوں میں وہ تین چار میٹنگز اسٹینڈ
کر لیتی تھی۔ اسے کہیں نہ کہیں فنڈ اکٹھا کرنے کے
لیے جانا پڑتا تھا، وہ وہاں چلی جاتی تھی۔ اسے مختلف
سوشل میڈیا ایوارڈ شووز میں بلایا جاتا تھا۔ کچھ بڑے
حوصلہ بھی اسے اپنی ایوارڈ تقریبات میں بلاتے
تھے۔ وہ ایونٹس چارج نہیں کرتی تھی، فنڈز کی ڈیمانڈ
کرتی تھی۔ جو ڈریس پہنتی تھی، جو بیک پکڑتی تھی،
کانوں میں پڑے ایئر کنڈیکٹر پر اسے فنڈز مل رہے
تھے۔ یہ وہی چیزیں تھیں جنہیں وہ کبھی نہ چاہے برباد

وہ دنگ رہ گئے..... چپ ہو گئے..... لا جواب ہو گئے..... عجیب سوال تھا.....

”میں مان لیتی ہوں ہمیں ہمارے کسی گناہ کی وجہ سے کوڑہ ہوا، پھر ان دو بچوں کو کیوں ہوا، جنہیں پانچ سال پہلے یہ بیماری ہوئی تھی؟ بچوں نے کیا گناہ کیا ہوگا؟“

”ان کے ماں باپ کے گناہ..... شاید ان کی سزا.....“ ان کی آوازیں کمزور پڑنے لگی تھیں، کیونکہ ان کی دلیلیں کمزور تھیں۔

”خدا کا خوف کرو، اپنے خدا کے بارے میں ایسے گمان نہ کرو۔ کیا وہ معصوم رگوں کو، ایسے گناہ کی سزا دے سکتا ہے جو انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔ ہمارے کمزور عقیدوں نے ہمیں بھٹکا دیا ہے۔ ہم نے اپنے رب کو غلط گمان سے پہچانا ہے۔ ہاں مجھے کوڑہ ہوا، میں بیمار ہوئی۔ لیکن یہ کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ یہ خدا کا عذاب، خدا کی لعنت نہیں ہو سکتی۔“ اس کی آواز خوشی کے احساس سے منور تھی۔

”تم خوش گمان ہو رہی ہو، جیسا! سب نشانیاں ہم پر لعنت کی ہیں۔ دیکھو ہماری شکلیں، ہمارے زخم، ہمارے جسم، مجھے تو خود سے نفرت محسوس ہوتی ہے تو کیا خدا کو نہیں ہوتی ہوگی۔ میں اپنا عکس پانی میں نہیں دیکھ سکتا، اتنا کر یہ صورت ہو چکا ہوں۔“

”تو کیا خدا خوبصورتوں کا خدا ہے؟ وہ پھول کا خدا ہے لیکن کانٹے کا نہیں؟“ سب کو سکتہ ہو گیا تھا۔

”جواب دو مجھے؟“

ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، ان کے پاس بس ناسور تھے، بد نصیبی تھی، تڑپ اور تنہائی تھی۔

”ہم اس غلاظت کے ڈھیر پر خدا کی وجہ سے نہیں، اس زمین کے انسانوں کی وجہ سے رہنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا، ہم بیمار ہیں اور اس وقت خدا کے رحم کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔“ اس نے کامل یقین سے کہا تھا۔

”کیا رحم ایسا ہوتا ہے؟“ ایک نے اپنے جسم کے زخم کے اس کے سامنے کر دیے تھے۔

کرتی تھی، اب بھی وہ چیزیں تھیں جن سے وہ فنڈز وصول کر رہی تھی..... نیت کی تبدیلی سے، چیزیں وہی رہتی ہیں لیکن ان کے فائدے بدل جاتے ہیں۔

”آپ ایڈمی جیسا بڑا اثر ست کیسے چلا رہے ہیں۔ اتنے زیادہ فنڈز کون دیتا ہے؟“

”زمین والوں کے لیے..... آسمان والا دیتا ہے۔“ (ایڈمی)

☆☆☆

”زمین والوں کے لیے آسمان والے کا رحم کبھی کم نہیں پڑتا۔ ہم نے یہ یقین کیسے کھو دیا؟“ دبسا پوچھ رہی تھی۔

سب چپ چاپ اسے سن رہے تھے۔ اس کی آواز کا جوش انہیں خوشی دے رہا تھا۔

”ہم نے یہ کیسے یقین کر لیا کہ وہ ہمیں چھوڑ چکا ہے۔ ہم نے کیسے مان لیا کہ اللہ کو ہم سے نفرت ہے؟“

”اس لیے کہ ہم کوڑھی ہو چکے ہیں۔ یہ بیماری ہے اس کی ناراضی کا ثبوت.....“ کسی نے کہا۔

”بس؟ صرف اس لیے کہ ہمیں کوڑہ ہو گیا؟“

صرف اس لیے کہ ہم بیمار ہو چکے ہیں۔ ہماری کھال جھڑنے لگی؟ تندرستی کے ساتھ بیماری ہے، جیسے زندگی کے ساتھ موت ہے۔ جس نے ایک کو بنایا، اس نے، اس کا جوڑ بھی بنایا۔ تو کیا ہم اس لیے دھکے مارے جائیں گے کہ ہم پر اللہ کا حکم پورا ہوا ہے؟ زندگی پر موت آتی ہے تو کیا وہ خدا کے حکم کی تکمیل نہیں ہوتی؟“

”خدا کے حکم کی تکمیل ہی ہوئی ہے۔ ہمارے گناہ پر خدا کی سزا کی صورت میں۔“

”گناہ.....؟ کون سا گناہ؟“

”کوئی ایسا گناہ جس نے خدا کے قہر کو دعوت دی تھی۔ سزا میں اس نے ہمیں یہ بیماری دے دی ہے۔“

”تو کیا روئے زمین پر ہم اکیلے ہیں جو گناہ کا رہیں؟ کیا ہم سے پہلے کوئی گناہ کا نہیں ہوا؟“

"ہاں ابھی دم لیا ہے۔ ہمیں اس کے معاملات پر غور کرنا چاہیے۔ امار اس ہماری طرف سے زیادہ" تو ہے۔ ہمیں صرف اس بات کو یاد رکھنا چاہیے۔"

"ہمیں ایسی امید نہ دے سنا امار اس پر بھائی نہ کرو۔" ضعیف بھی تڑپ اٹھی تھی۔

"ایک ماں کے چار بچے ہیں۔ ایک بچہ کھیل رہا ہے۔ ایک بچہ سو رہا ہے۔ ایک اس کی گود میں ہے اور ایک بخار سے تڑپ رہا ہے۔ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ ماں کا دل کس بچے کی طرف کھنچے گا؟" وہ ایک ایک کی طرف گھوم کر پوچھ رہی تھی۔

"جو بخار میں ہے" ضعیف نے سہ سانس کہا تھا۔ چوتھے سانس کی لہر ہاتھ تھی۔

"ہاں..... اس ماں کا دل اس بچے کی طرف کھنچے گا جو تکلیف میں ہے۔ وہ اسی کی طرف زیادہ متوجہ ہوگی جسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ جو روتا، بڑبڑاتا، ہلانا ہوگا۔ یہ ایک ماں کی محبت ہے۔ اس کے ہارے میں سوچو جس نے ماں کے دل میں ایسی محبت اتاری ہے۔ وہ کون ہے جو ایسی محبت کا خالق ہے؟ کون ہے؟" وہ امار سے ہے۔

امار نے رپ لے تھیں توں پھوڑا تھا۔ ہم نے اسے پکارا توں توں تھا۔ ہم دہانوں کے کمان کے ساتھ چلے، امار نے اپنا ایمان کھود دیا۔ ہم نے مان لیا کہ ہم کتنی ہیں، گناہ کار اور بد بخت ہیں۔ اگر ہم سب ہیں تب بھی خدا لے تھیں توں پھوڑا۔ وہ سب کی سنتا ہے لیکن امار کی زیادہ سنتا ہے کیونکہ ہم تھا ہیں، تکلیف میں ہیں، ہم ہمار ہیں۔ وہ سب کے پاس ہے لیکن امار کے پاس زیادہ ہے کیونکہ امار کے پاس اس کے سوا کوئی توں ہے۔ وہ سب پر رحم کرتا ہے، لیکن ہمیں وہ اپنے رحم کے سب سے زیادہ مرعوب رکھتا ہے۔ کیونکہ ہم دنیا کی سب سے زیادہ کا سب سے زیادہ شکار ہوئے ہیں۔" کہتے کہتے دھار دی گئی۔

گناہوں میں غانا چھایا گیا تھا..... اس دھار کا

یہ اندہ دہنی تھا، جس کے ہر پھڑ پھڑ ہے۔

"تمہارا ایمان کیا کہتا ہے؟" وہ اب وہ ایک ایک کو پکارتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

ضعیف کے "نٹ کپا پالے گئے تھے۔" کہ اس نے مجھ سے میرا رزق نہیں پھینکا۔ کوڑھی ہوئے یہ بھی مجھے ہر روز کھانے کے لیے ملتا رہا۔" وہ سکتے لگی تھی۔

"اور تمہارا؟" اس نے دوسرے بیمار کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارا یقین کیا کہتا ہے؟"

"مجھے اندھیرے اور تنہائی سے ڈر اگا کرتا تھا، جس دن میں پہلی بار یہاں آیا تھا، اس رات میرا دل خوف سے بند ہو جانے کو تھا۔ بھیڑیے مجھے کاٹ رہے تھے اور ساپ مجھے ڈالتے تھے۔ رات اندھیری تھی۔ ہادل میٹا ہے تھے۔ میں جاک جاک کر رونے لگا تھا۔ کچھ وقت گزرا، ہادل سمٹ گئے اور چاند اکل آیا۔ اس کی کرنیں، صبح میرے تارک بستر پر پڑ رہی تھیں۔ میرے اندھیروں کے لیے، ہمیشہ کہیں نہ کہیں سے چاند اکل آیا۔ میری روشنی کا انتظام اس نے ہمیشہ کیے رکھا۔"

دھار اپنی گیلی آنکھیں رکڑ رہی تھی۔ "اور تم؟" وہ تیسرے سے پوچھ رہی تھی۔

وہ ان سب میں سب سے کم عمر تھا۔ اس نے بھینٹے ہوئے اپنے لٹکانے کی طرف اشارہ کیا۔ سب نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھا وہاں نمودار سبز واک آیا تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ داد کھائی دیتا تھا، جس پر ایک چھوٹا سا پھول کھلا ہوا تھا۔

"جس رات میں یہ شکوہ کر کے سوا تھا کہ اس نے مجھے بد صورتی کا تھوڑا سا، اس رات کی صبح، اس پودے پر یہ پھول کھلا تھا۔ دنیا کا سب سے خوب صورت پھول۔ میرا یقین ہے کہ یہ پھول اس زمین کا توں، اس مقام کا ہے، جسے سب جنت کہتے ہیں۔"

سب گردنیں کھمکھم کر اس پھول کو دیکھ رہے تھے..... پھول کی خوشبو سے سب کی روئیں مسطر ہو رہی تھیں۔

”تو اب یقین کر لو کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہے۔ اس کی عبادت پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا اس بیماری سے پاک لوگوں کا۔ ہمارے جسم کو زہ زدہ ہیں لیکن ہماری رو میں پاک ہیں۔“

”تم کیا کرنا چاہتی ہو دیسیا؟ تمہاری باتوں پر یقین کر لینے پر بھی ہمارا نصیب نہیں بدلے گا۔“

”ہمیں نصیب نہیں بدلنا، ہمیں اپنے یقین کو ام یقین کرنا ہے۔“

”ام یقین۔“

”یقین سے بڑھ کر یقین۔ نفرت کی سب نشانیاں ملنے کے باوجود، خدا کی ”محبت“ پر یقین۔ قہر کی سب علامتیں دکھائی دینے کے باوجود اس کے رحم پر ”یقین“ ہماری بیماری کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی، ساری دنیا کے کہنے کے باوجود ”اس کی شفا“ پر یقین۔ ”جو زمین پر نہیں ہوتا، وہ آسمان پر ہوتا ہے، صرف رب کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس شہادت پر ”یقین۔“

☆☆☆

گھاٹیوں میں آگ لگی تھی اور وہ دور شہر میں، شہر والوں کو بھی دکھائی دے رہی تھی۔ انہیں کوڑھیوں کی پرواہ نہیں تھی لیکن پھر بھی انہیں ظالمانہ سی تشویش ضرور تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا گھاٹیوں میں رہنے والے آگ جلا کر اس میں کود رہے ہیں۔ آخر کار سب مر رہے ہیں؟ آگ میں مجلس کر خود کو ختم کرنے کا فیصلہ کرنے میں ان کی مدد کس نے کی ہے؟

”دیسیا غلاظت جلار ہی ہے۔ ناپاک لبادے، بستر اور استعمال کی دوسری ناکارہ چیزیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ عبادت کرنے جا رہی ہے اور عبادت کا آغاز غلاظت کی صفائی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ خدا کو پکارنے کا انتظام کر رہی ہے۔“ ان تک خبر پہنچ چکی تھی۔

”خدا..... وہ اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام کیسے لے سکتی ہے؟“

”زمین کی طرح تم نے خدا کو بھی اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے؟“ والد پوچھ رہے تھے۔ شہر والوں نے

ان کا تپاںک میں دم کر دیا تھا۔ جس دن دیسیا شہر سے ہو کر گئی تھی، اس دن وہ لوگ ان کے گھر انکس ڈرائے دھوکانے پہنچ گئے تھے۔ والد چپ چاپ سب سنے رہے تھے۔ لیکن ان کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ انہیں اپنی دیسیا پر فخر تھا۔

”دیسیا اس دیوانے کو..... اولاد کے غم میں یہ خدا کی شان میں گستاخی کرنے سے بھی باز نہیں آ رہا۔ ادب و بخت کے باپ۔ شکر ادا کرو کہ ہم نے تمہیں شہر سے نکال باہر نہیں کیا۔ تم دونوں باپ بیٹی کی وجہ سے شہر پر کیسے کیسے عذاب نہیں آئے۔“

”وہ تمہارے اعمال کا پھل ہوں گے۔“ والد نے اطمینان سے کہا۔

”اچھا..... تو پھر تمہاری بیٹی نے کس عمل کا پھل کھایا ہے؟ بتاؤ، کس گناہ سے منہ کالا کیا تھا جو سارے جہان میں خدا نے اس کا منہ کالا کر دیا۔“

ذلت اور رسوائی تو بہت سوں کو نصیب ہوتی ہے رچو کوڑھی کا نصیب بنتی ہے، اس کی تو مثال ہی نہیں ملتی۔“ قہقہہ لگایا۔

والد نے تڑپ کر کہنے والے کی گردن دیو جی جانی تھی۔ لیکن دوسرے لوگوں نے زوردار دھکا دے کر گرا دیا تھا۔

”جا کر کہہ دو اپنی لاڈلی سے، گناہ گاروں کی صف سے نکل کر ہم میں شامل نہ ہو۔ اگر اس نے اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام لیا تو اس کی زبان کاٹ دوں گا۔“

وہ زیر لب خدا کو یاد کر رہی تھی۔ آگ بجڑی رہی تھی۔ دیسیا نے ایک ایک غلیظ چیز اٹھا کر آگ میں جھونک دی تھی۔ وہ عبادت کے لیے اہتمام کر رہی تھی۔ پھر اس نے ایک بلند گھائی کی صفائی کی تھی۔ عبادت کے لیے اس نے بلندی کا انتخاب کیا تھا۔ سمندر کے پانی سے اس جگہ کو اچھی طرح سے دھویا تھا۔ گھاس پھوس کا فرش بچھا کر، ضیفہ سے منگوائے کچھ پھول اس نے کنارے کنارے رکھ دیے تھے۔

تھے۔

☆☆☆

”تمہاری بیٹی کی عقل کی داد دینی پڑے گی۔ ساری دنیا کو پاگل بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔ پاگل نہ ہوتی تو ساری دنیا کے کوڑھیوں کو جمع کر کے، خدا کی عبادت پر کیسے لگاتی۔ حج الدماغوں نے تو ان کوڑھیوں کو پتھر مار مار کر شہر سے باہر نکال دیا تھا۔ انہوں نے ان پر خدا کا نام لینا بھی حرام کر دیا تھا۔“ والد نے کل سے کہا تھا۔ ”ہونہ۔..... اپنی موت کا سامان کر رہی ہے۔“ ”زندگی کا اہتمام تو تم سب لوگ کر رہے ہو ناں۔ تو پھر اس کی موت پر پریشان کیوں ہو؟“ ”پاگل انسان..... بہک گیا ہے۔“ وہ بالکل نہیں بھکی تھی..... ہر رات وہ سب کے ساتھ عبادت کرتی تھی۔ خدا کو پکارتی تھی۔ وہ سب ایسا کر رہے تھے۔

اسی لیے اب انہیں پتھروں، گالیوں کے ساتھ ساتھ خدا کو پکارنے کے طعنے بھی ملتے تھے۔ ”تو کیا دیا خدا نے تمہیں؟ دوا؟ شفا؟“ کوئی کسی کوڑھی کو روک لیتا۔ اس کا مذاق اڑانے لگتا تھا۔ ”اپنا قرب دے تو دیا اور کیا چاہے ہمیں۔“ قہقہے۔

”جس کے پاس خدا ہوتا ہے، اس کے پاس کوڑھ نہیں ہوتا۔“ ”اصل کوڑھ تو تمہاری روحوں کو ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں سوچو۔“ ”تمہاری شکلیں تو اور منحوس ہو گئی ہیں۔ کیا ملا عبادت کر کے.....؟“

”کل کیا ہو گا وہ آج نہیں بتاتا.....“ ”جو کل ہو گا وہ آج مجھ سے سن لو۔ وہ تمہیں کوڑھ سے بڑی سزا دے گا۔ اپنی ناپاک زبانوں سے اس کا نام لینا بند کرو۔“ ”اگر وہ دے گا..... اگر وہی دے گا تو ہمیں

سورج غروب ہوتے ہی وہ سب آگے پیچھے جہلی کی صورت میں بیٹھ گئے تھے اور باری باری حمد و ثناء کرنے لگے۔ صبح کی اولین کرنوں تک یہی کرتے رہتے تھے۔

”ہم خدا کو اس کے رحم سے پہچانتے ہیں۔ ہم اس کے رحم پر یقین رکھتے ہیں۔“ دیہانے عبادت کو اس تشریف پر ختم کیا تھا۔

اب ہر رات وہ اسی جگہ، اسی طرح بیٹھ کر حمد و ثناء کرنے لگے تھے۔ پہلی رات سے اگلی رات تک، وہ خدا کو پہلے سے بہتر جاننے لگے تھے۔ ہر رات کی صبح ان کا شک یقین میں بدلنے لگا تھا کہ وہ تو صرف بیمار تھے..... صرف بیمار..... انہوں نے اس کے علاوہ خود کو کچھ اور کیوں سمجھا۔ وہ جھکتے نہیں تھے۔ رات بھر خوش و خرم رہتے تھے۔ کسی چیز نے انہیں اتنا خوش نہیں کیا تھا جتنا خدا کی حمد کرنی تھی۔ کسی چیز نے انہیں اتنا مطمئن نہیں کیا تھا جتنا اس یقین نے کہ وہ بد بخت نہیں ہیں۔

آہستہ آہستہ ان کی رات کی آوازیں، ایک زبان ہو کر حمد کی کامل صورت میں ڈھل گئیں اور رات کے سنانے میں گھائیوں میں گونجنے لگی تھیں۔ دور کھڑے والد بھی اپنی دیہا کی آواز کے ساتھ آواز ملاتے رہتے تھے۔ ان کی بیٹی بلندی پر خدا کے حضور بیٹھی تھی، وہ نیچے ہاتھ جوڑ کر خدا کے حضور کھڑے تھے۔

”اپنی ناپاک زبانوں سے کوڑھی خدا کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔“ یہ بات شہر کے ہر کین کو سخت ناگوار گزری تھی۔ اور یہی بات گھائیوں کے کوڑھیوں کی شہرت کی وجہ تھی۔ بات مسافروں کے کانوں تک پہنچی، مسافروں سے شہر سے باہر جا پہنچی تھی۔ ”کوڑھیوں کے شہر میں ایک لڑکی شفا کی دعا کروا رہی ہے۔“

یہ بات دور دور تک پھیل گئی۔ ایسے ہی جیسے کسی کو کوڑھ ہوتا تھا تو ہوا کے ساتھ اس کے کوڑھی ہونے کی خبر پھیل جاتی تھی۔ چھوٹے لوگ ہنس دے تھے، بیمار لوگ اپنا رخ گھائیوں کی طرف موڑ چکے

سب قتل ہے۔۔۔۔۔

کو میں نے بھی ایسے دوڑا دیے۔ جناب نہیں
دیکھے تھے۔ وہ جناب نہیں کیا کرتے تھے۔ میں
اب وہ جناب دیکھ سکے تھے۔ وہ خدا کے بارے
میں بات کرنے لگے تھے۔ وہ مرنے لگے تھے کہ
انہوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ ان کا رب آنا
بھی ان کے ساتھ ہے۔

انہیں یہ خبر نہیں تھا کہ کھلے جہاں آکر انہیں
روک دے گا۔ کھلے کو میں نے کے پاس بھی کر آئے
کی بات نہیں کہ تھا۔ کھانا اور دوسرے کچا سمیت
کی دواؤں کے ہم سے مشہور تھے۔ جن لوگوں نے
انہیں شکر سے کھانا تھا وہ بھٹکے ہوئے اور بے
کے اندر ہی کرتے تھے، وہ اس سے زیادہ بھٹکے کر
سکتے تھے۔ دن میں وہ لوگ دیکھ کر تھے، جناب
تک کرتے آئے تھے۔ میں رات ان کا اور ان کے
لب کی تھا۔

”کتی دقت ہو کر گیا دیر ۱۱ بجے ہے
خدا نے چھو نہیں کیا۔ وہ ہمیں تن بھی رہا ہے یہ
نہیں۔“ ایک پتہ لے کر چلا تھا۔

دیر ۱۱ بجے کر کے اسے نہ کھا تھا۔
”نہیں۔“ اسے بھی بات کرنے میں دقت لگا تھا۔

”کیا نہ وہ بے پروا ہے؟“ اس نے کہا تھا۔
”وہ تو یہ کیا کیا۔“ انہیں لوگ بھی تو نہیں کہہ
سکتے تھے وہ تو تھے۔۔۔۔۔

دیر ۱۱ بجے گہری سانس لی۔ ”ہم اس خدا پر
ایمان لائے ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دے رہا کیا وہ
دکھائی دینے کے لیے جو اس پر ایمان نہیں لائے وہ
ایمان لے نہیں گئے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے فوراً کہا۔

”نہیں! وہ تب بھی ایمان نہیں لائے گئے۔
ایمان کا تعلق شہادت سے نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق یقین
سے ہوتا ہے۔ روح اسی طرف مٹتی ہے جس طرف
سچائی ہوتی ہے۔ کیا ہماری رو میں ہمارے رب کی
طرف نہیں مٹتی؟“

”میرا خدا میری دل سے نہیں۔“

”جی ہاں! میں ایمان رکھتا ہوں۔“ اس نے کہا
حالات پر بھی مہینے رہتے تھے۔

جراثیم والے دیر ۱۱ بجے آکر کے ساتھ کھانا
کر چھوڑ کر گئے۔ میں نے بھی کھانے سے کچھ کھا
تھا۔ وہ کھانا کھا کر کھانا کر رہا تھا۔ جو کھانا کھا
کھانا تھا۔ دیر ۱۱ بجے تھے۔ میں نے کھانا کھا کر
مشتہق ہو کر کھانا کھا کر کھانا کھا کر کھانا کھا کر

نرتا تھا۔ وہ دیر ۱۱ بجے تھے۔ میں نے کھانا کھا کر
ایک طرف آ کر کھانا کھا کر کھانا کھا کر کھانا کھا کر

تے آئے تھے۔ میں نے کھانا کھا کر کھانا کھا کر کھانا کھا کر

حالت انہیں شکر سے سب تو وہ دیر ۱۱ بجے تھے۔ وہ دیر ۱۱ بجے

نہیں۔ میں نے کھانا کھا کر کھانا کھا کر کھانا کھا کر

سمیت کا تو وہاں انتظار کیا جا رہا تھا۔ میں نے کھانا کھا کر

”کیا آپ کو بھی شک ہے؟“ وہ پوچھ رہی
تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ رو رہی تھی۔ ”اچھی دولت دیکھی
ہے کہ عزت دیکھنا چاہتی ہوں۔ خدا کی محبت دیکھنا
چاہتی ہو دیر ۱۱ بجے۔“

دیر ۱۱ بجے سے صبح کے آسمان پوچھے۔
”آج رات اس کی حمد کے بعد ہم اس کی
”چاہت“ کی دعا کریں گے۔“

”انسان کے صے میں جو بے بڑی خوش
نہیں آئی ہے۔ وہ ”اللہ کی چاہت“ کی ہے۔“

زندہ کہہ رہا تھا۔

اسے فرشتے کی بات یاد آگئی تھی۔ ”تم خود بھی نہیں جانتیں کہ تم کیا کچھ کر سکتی ہو۔ تم نے خود کو کھوجا ہی نہیں تھا۔“

اب وہ خود کو تلاش رہی تھی..... دکھ اور سکھ کے ساتھ۔

خیند کا دورانیہ مختصر ہو چکا تھا۔ وہ قارغ وقت میں کتاب کے لیے نوٹس ریکارڈ کرتی رہتی تھی۔ جہاں جاتی، جو کچھ کرتی، جس احساس اور کیفیت سے گزرتی، وہ ریکارڈ کر لیتی تھی۔ کار کی پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے دوران، رات کو سونے سے دس منٹ پہلے، صبح اٹھ کر بیس پچیس منٹ..... بہت تھا اتنا وقت..... وہی وقت جو موبائل چیت، پوسٹنگ، فیس مساج، باڈی مساج، مٹی کیور، پیڈی کیور میں صرف ہوتا تھا۔

ہر دور میں انسان نے جموٹے خدا بنائے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ وقت گزارتا ہے، انہیں پوجتا ہے، ان سے دل لگاتا ہے۔ ان کی ستائش کرتا ہے، ان سے طلب کرتا ہے۔ اس دور کے جموٹے خداؤں میں سے چند کے نام فیس بک، انسٹا ٹویٹر، ٹکس، موبائل، فیشن، بیوٹی، ”دکھاوا“ ہے۔ انسان یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے کہ انہیں، اس نے ”خدا“ بنالیا ہے۔ غفلت ایسی ہی بیماری ہوتی ہے، یہ حقیقت تک پہنچنے ہی نہیں دیتی، اور نقصان تک لے جاتی ہے۔

اس کے وائس نوٹس پیپر پر لکھے ہوئے اسے مل جاتے تھے۔ وہ انہیں ایڈٹ کر لیتی تھی۔ اس کی زندگی کی کتاب کا ایک باب تیار ہو چکا تھا۔ اس پہلے باب میں اس کی بیماری سے پہلے کی زندگی کا احوال درج تھا۔ چوبیس سال کی زندگی اور بس ایک باب کیونکہ اس میں ایسا کچھ تھا ہی نہیں کہ وہ ”پوری کتاب“ بننا۔ زندگی کا وہ حصہ جب وہ زندہ تو تھی لیکن ”ہڈی“ (درست سمت) نہیں تھی۔

”اللہ کے ساتھ میری تجارت ٹھیک جا رہی ہے؟“ اس نے ایک دن فرشتے سے پوچھا۔

لائم وغیرہ نے یونیورسٹی میں اس کے نام سے ڈسٹ فنڈ قائم کر لیا تھا۔ اسکول کے بچے اسے اسپورٹس ایونٹس پر بلارہے تھے۔ وہ اسے اپنے جیب خرچ سے فنڈز دے رہے تھے۔ جو اسے دو ڈالر دینے کے لیے بھی بلارہا تھا، وہ وہاں بھی جا رہی تھی، جو اسے پانچ ڈالر دے رہا تھا، وہ اسے بھی لے نہیں سمجھ رہی تھی۔ ماما پاپا، فیملی فرینڈز، یونیورسٹی فیلوز، سب جتنا دے سکتے تھے، دے دیا تھا۔

سوشل میڈیا پر اسے سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا جا رہا تھا۔ اس کی چھٹی زندگی کا ریکارڈ ایسا رہا تھا کہ اس فنڈ ریزنگ کو سب اس کا ڈرامہ قرار دے رہے تھے۔ وہ بیمار نہیں ہے، سر کے بال صاف کروا کر بیماری کا ڈھونگ جا رہی ہے۔ شہرت کے لیے لوگ گردنیں کٹوا دینے کے لیے تیار تھے، وہ تو پھر بیماری کا ڈھونگ جا رہی تھی۔

جو جتنا اچھا ہوتا ہے، اسے اس سے کہیں زیادہ برائی ملتی ہے۔ یہ دنیا کا دستور ہے، روایت ہے، رواج ہے۔ بس..... یہ ہوگا، ہر حال میں ہوگا..... وہ منہ توڑ جواب دینے والوں میں سے بھی لیکن اب اس نے خاموشی اپنائی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی زبان بھی انویسٹ کر چکی تھی۔ کلام، اور بد کلامی بھی۔ اسے دلیس نہیں دینی تھیں، بحث نہیں کرنا تھی۔ وہ بہت تکلیف میں بھی ہوتی تو فیم کو ہاں کہہ دیتی تھی۔ کسی تقریب، ایونٹ یا انٹرویو کے دوران اس کا سر چکرا رہا ہوتا تب بھی وہ صبر کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اسے فنڈز دیے جا رہے تھے۔ کم بہت، کمزوری، بہانے، یہ سب بھی اس نے انویسٹ کر دیے تھے۔ اسے وقت کی چھوٹ دی جاتی تھی لیکن وہ وقت کی پابندی کرنا مناسب سمجھتی تھی۔

”تمہارے پاپا کہتے ہیں، میں نے ساری زندگی اتنا کام نہیں کیا جتنا ہڈی کر رہی ہے۔“ ماما حیران تھیں۔

”ہاں..... اور اب تمہیں سب سے خاص چیز
انویٹ کرنا ہے۔“

اجھاوہ کیا ہے؟

”یقین..... ام یقین.....“

☆☆☆

زندگی ایک سفر ہے..... اللہ کی پہچان کا

سفر۔

”انسان کمزور اتنا نہیں ہے، جتنا شاکہ ہے۔
وہ بار بار جلدی نہیں ہے جتنی جلدی ہار ماننا شروع کر
دیتا ہے۔ دنیا کی بدقسمتی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس
نے زندگی کو ہندسوں میں قید کر لیا ہے۔ ایک سال،
دو گھنٹے، پانچ منٹ، بیس سیکنڈ، ہر چیز تک پر آگئی
ہے۔ اسی تک تک نے انسان کو بے مبرا بنا دیا ہے۔
مشکلوں، مصیبتوں، دعاؤں کی قبولیت، معجزوں کی
رونمائی کو بھی سیکنڈز کا تلی میٹرم دیا جاتا ہے۔

اس بیماری سے لڑتے ہوئے، اسے پورے
اٹھارہ مہینے ہو چکے تھے۔ اکثر وہ خود بھی بھول جاتی
تھی کہ وہ بھی ہسپتال سے باہر بھی زندگی گزار رہی
تھی۔ ماں رونے لگتی۔ بابا کا دل بند ہونے لگتا
تھا۔ لیکن پھر اس کی حالت خفجیل جاتی تھی، وہ اٹھ کر
کھڑی ہو جاتی تھی۔ موت کا آنا اس ہے، اس کا ہونا
اٹل ہے۔

نیشن دعاؤں کی خیر اس کے ساتھ رہی تھی۔ یقیناً وہ
جانتی تھی کہ اسے کہا گیا تھا کہ وہ بمشکل سات آٹھ
مہینے زندہ رہے گی اور وہ اٹھارہ مہینے سے زندہ
تھی۔ لیکن اگر وہ ٹرینٹ شروع نہ کروائی، بہت
سے کام نہ لیتی تو آج کہانی مختلف ہوتی۔ ہم اپنی
زندگی کی کہانیوں کے واقعات بدل سکتے ہیں۔
انسان کے اختیارات محدود ہو سکتے ہیں لیکن اس کی
کوشش بھی محدود نہیں ہوتی۔ کس نے کہا بیمار ہمیشہ
بیمار رہے گا؟ کون۔ ثابت کر سکتا ہے کہ مصیبت زدہ
کی مصیبتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی؟ انسان کے حوصلے
بلند ہونے چاہئیں، پہاڑ ہوں یا صحرا، سب فتح ہیں

اس کے سامنے۔

اس کی کتاب کے پانچ باب تیار ہو چکے تھے۔
”اسے اپنی زندگی میں ہی شائع کروالو۔“

ایک بار اس کی دوست کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ
اداسی سے ہنس دی تھی۔ دوست شرمندہ تھی لیکن وہ
جانتی تھی کہ اس میں اس کی دوست کا نہیں اس اعتقاد
کا قصور ہے جس نے سب کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ
زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گی۔

کامیو میں ہسپتال کی بلڈنگ بھی تیار ہو رہی
تھی۔ اسے وہاں بلایا جا رہا تھا لیکن وہ فی الحال سفر
نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی سالگرہ آ رہی تھی اور اسے
دعوت دی جا رہی تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ آ کر
منائے۔ وہ چھبیس سال کی ہونے والی تھی۔ لیکن اگر
کوئی اس سے اس کی اصل عمر پوچھتا تو وہ کہتی ہے کہ
”دو سو سال، اور شاید کچھ مہینے۔“ دو سالوں میں اس
نے دو سو سال کی زندگی جی لی تھی۔ زندگی مندرج کا
نام نہیں ہے، بچپن، جوانی، بڑھاپا..... یہ منازل کا
نام ہے، شہر، آگاہی، زندہ دلی، روحانی بے داری
اور اطمینان۔

زندگی ایسی کہانی ہے جو ہر روز کہی جاتی ہے اور
مسلل کہی جا رہی ہے۔ اپنی کہانی وہ کہتی رہی اور
دوسروں کی سستی رہی۔ اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ
لوگوں سے ملتی رہی۔ ٹرائی روم میں کپڑے ٹرائی کرتی
رہی، لپ اسٹک کے شیڈز اور جوتوں کے اسٹاکل بھی
دیکھتی رہی۔ لیکن اب وہ برائے پڑھتی تھی، اب وہ
بھی ”افورڈ“ نہیں کر سکتی کہہ کر چیزیں ایک طرف
کر دیتی تھی۔ وہ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتی تھی،
ایسے اپنے کھانے سے چھب زیادہ فنڈز کی فکر رہتی
تھی۔ وہ فنڈز خرچی سے ”فلاحی خرچ“ کی طرف
آگئی تھی۔ یہ اس کی روحانی ترقی، اور شعور کی آگاہی
کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ روز ٹریس پر لائیم وغیرہ کے ساتھ گئی تھی۔ وہ
کلاس فیلوز کی شادیاں بھی اٹینڈ کی تھیں۔ چھوٹے
سے ایک ایکسڈنٹ میں ایک دوست کے ”دھڑ

دانت و ان مفارقت دے گئے تھے، ان کا افسوس کرنے کے لیے بھی جانا پڑا تھا۔ چونکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ دنیا کی بد صورت ترین لڑکی بن چکی ہے اور معنوی دانت بھی اس کی بد صورتی کم کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکے، تو وہ اسے اس کی بد صورتی یا دلدلانے لگی تھی۔ تین دن تک کمرہ بند کر کے روئے کے بعد وہ ڈپریشن میں چلی گئی تھی۔ اس کا دانتا تھا کہ معنوی دانتوں کی مسکراہٹ بہت "فیک" لگتی ہے۔ ان میں وہ بات نہیں۔

بات بس اتنی سی ہے کہ ہم نے خود کو اتنا زیادہ پرفیکٹ بنا لیا ہے، کہ ذرا سا نقص ہماری نیندیں اڑا دیتا ہے، سکون تباہ کر دیتا ہے، ہمیں ڈپریشن کا مریض بنا دیتا ہے۔ پریکشن اور خوبصورتی کے بھوت نے اصل زندگی کا خون پینا اور گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔

اس دو سو سالہ زندگی میں اس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ زندگی اور موت ہمیشہ برابری کا سلوک کرتی ہیں۔ دنیا کا نظام کسی "عام" انسان کے مرنے پر نہیں رکتا تو "خاص" کے مرنے پر بھی چلتا رہتا ہے۔ برابری.....

سورج ہر روز اپنے وقت پر لکھتا رہتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ڈھلتی ہے، رات چھا جاتی ہے۔ چاند ستارے، ہوا، دھوپ، پانی، درخت، جنگل، پہاڑ، پرندے، ہر چیز اپنی ڈیوٹی دیتی رہتی ہے۔ کوئی ایک بھی، ایک دن کی چھٹی نہیں کرتا۔ یہ سب نشانیاں انسان کو یہ سبق دیتی ہیں کہ گمراہ نہیں۔ ہمارے ساتھ زندہ رہو۔ دیکھو ہم اپنے کام سے، اپنے مقصد سے ایک بھی دن کی چھٹی نہیں لیتے۔ ہم ہمیشہ اپنا کام کرتے رہے ہیں، تم انسان ہو، تمہارے پاس سب سے خاص کام ہیں کرنے کے لیے، تم وہ کرتے رہو، زندگی کو تم کے سہارے نہ گزارو، زندگی کو زندگی بنا کر نہ۔ کتنا روؤ گے، کتنا دکھی ہو گے؟ کتنا یاد کرو گے؟ کتنا بچھاؤ گے؟ رہنے دو۔ آگے بڑھ جاؤ۔

آگے بڑھ کر وہ ہر اس شے سے مکمل چکی تھی

جو "زندگی" تھی۔

"تو تمہارے فرشتے کا کیا نام ہے؟"

وہ سب لائٹ کے دادا کے گاؤں آئے تھے۔ کھانا وہ کھا چکے تھے اور اب آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے فرشتے کی کہانی سنا چکی تھی۔

"نام.....؟ میں نے اس کا نام نہیں پوچھا۔ مجھے لگا کہ فرشتہ صرف فرشتہ ہی ہوتا ہے۔"

"جیسے انسان صرف انسان؟ ہر انسان کا ایک نام ہے تو فرشتوں کا کیوں نہیں؟" لائٹ اسے کم عقل ثابت کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔

وہ ہنس دی۔ اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ "اگر میں اسے نام دوں تو شاید ہدایت کا نام دوں۔"

"یعنی گائیڈنس.....؟"

"خاص اللہ کی طرف سے ملنے والی "ہدایت"۔ یہ لفظ بہت گہرا ہے۔ گائیڈنس اس کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ میں اس کے معنی نہیں سمجھا سکوں گی..... ابھی بہت کم عقل ہوں میں۔"

"شکر ہے تم نے اپنے فرشتہ کا نام کسی براٹر سے متاثر ہو کر نہیں رکھ دیا۔"

پہلے وہ دھیسے سے ہنسی اور پھر قہقہہ لگا دیا۔ "تم لوگ مجھے سات خون معاف کر دو گے لیکن میری فیشن ہسٹری معاف نہیں کرو گے؟"

"فیشن کوئی انسان ہوتا، تو اس وقت تمہارے پیچھے تلواریں لے کر لگا ہوتا۔ تمہارا سر قلم کر کے ہی دم لیتا۔ کیسے کیسے تم نے اس بے چارے فیشن کی گردن نہیں مروڑی..... حال سے بے حال کر دیا۔ کسی جوگا نہیں چھوڑا ہے۔"

وہ ہنستی ہی رہی۔ آگ کا الاؤ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ یہ تو آج کا رواج ہے کہ دی دی آئی پی لوگوں کو جان کی حفاظت کے لیے گارڈ رکھنے پڑتے ہیں۔ جبکہ یہ انسان کے زمین پر آنے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ اس کے ساتھ فرشتوں کو گارڈ

کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ کتنی بڑی گھڑی حاصل ہے ہر انسان کو۔۔۔۔۔ اللہ کے لیے ہر انسان دی دی آئی پی ہے۔

دو سال دو ہفتے گزر چکے ہیں۔۔۔۔۔
ڈاکٹرز مایوس نہیں تھے لیکن۔۔۔۔۔ رپورٹس،
تسج، جسم، ری ایکشن، ان کا کسی چیز پر بس نہیں
تھا۔ اتنا کچھ جان کر بھی تو کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ بابا،
بابا دونوں سولی پر لٹکے رہتے تھے۔ جہاں وہ بدلتی تھی
تو جیسے وہ بھی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے کوئی ایسی
ترکیب نہیں چھوڑی تھی جو ان کی اولاد کی جان بچا
سکتی۔ دنیا کے بازار میں ایک زندگی ہی تو نہیں ملتی۔ یہ
یہ اول بدل سے بھی نہیں ملتی، اور نہ ہی تلاش سے۔ یہ
مہجر و صرف اوپر سے ہوتا ہے۔

دو سال ایک مہینہ گزر چکا ہے۔
”امید“ یہ ایک ہری بھری شاہراہ ہے لیکن یہی
امید جب ناامیدی میں بدلتی ہے تو تیز دھار گھوڑوں میں
بدل جاتی ہے، کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی
ہے۔ یہ صرف بیماری ہی تو نہیں جھیلتا۔ اس کے
ساتھ آنے والے ہزاروں خدشے، خوف، بدلتے
انسانی رویے، بے بسی، جی دباؤ بھی جھیلتا ہے۔
ایک جسم سے، ایک دماغ سے، ایک روح سے۔ وہ
تین محاذوں پر اکیلا لڑ رہا ہوتا ہے۔
اس کے تینوں محاذ گھروں پر لڑنے لگے تھے۔
ہدیٰ ادو پھر سے رو دی تھی۔

وہ اس کا صرف کرش تھا۔ صرف ایک
کرش۔

چونکہ محبت کرنا جان جو حکم کا کام ہے، اور کرش
پر کوئی برداشت کر سکتا ہے۔ اس لیے کچھ کرشنز وہ بھی
رکھتی تھی۔ ”اس پر میرا کرش ہے۔“ فریڈز رہا ہے تو
کاہر ہے یہ فریڈز اس نے بھی قائل کیا تھا۔ آٹھ دس ہالی
واٹر روز پر، ایس پائیس پاپ سکرز، دو چار ماڈلز، پنڈ
فٹ ہارڈ، کچھ آئی ٹی ٹیکنالوجی اور۔۔۔۔۔ اس پر۔۔۔۔۔ جو
اس کے فریڈز سرکریٹ میں سے تھا۔ جس کی شادی کی
تصویریں وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتا بھی کہیں تھا کہ وہ

اسے پسند کرتی ہے۔ ایک بار وہ اس سے ملنے
ہاسپل بھی آیا تھا۔ آکر وہ بیمار نہ ہوئی تو شاید۔۔۔۔۔
اب۔۔۔۔۔

اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ہر
کہ ہر چیز، ہر شخص پر سے اس کا حق ختم ہو چکا ہے
اسے رلا رہی تھی۔ ساری دنیا اپنی اپنی جگہ پر
رہی ہے، ایک اسی کی پلاننگ دھڑکی کی دھڑکی
ہے، نے اسے پھر سے پرانی بدلتی دنیا قلمبند
بھر دیتی رہی، رات بھر جاتی رہی۔ ایک ایک کر کے
ہر چیز ہی اس سے چھین چکی ہے۔

”تو کیا جو چیزیں تم سے چھین گئیں۔ ان کے
بدلے میں تمہیں ان سے بہتر چیزیں نہیں ملیں؟“
فرشتہ پوچھ رہا تھا۔

اس نے تانسید میں سر ہلایا اور وہ بھی دبی۔ ”کی
باتوں کے جواب نہیں ہوتے بدایت۔ وہ بس ہوتی
ہیں۔ اور اس کو دیتی ہیں۔ دل تو زود دیتی ہیں۔“
”تم پھر سے کمزور بن رہی ہو بدلتی دنیا۔“
”تمہیں اینٹ اینٹ پر اڑنا پڑا ہے، اس دل شکنی سے
کو دل بدل نہ دیتے دو۔“

”تمہیں اپنی محنت کے ضائع جانے کی فکر
ہو گئی۔“ اس نے فکر کیا۔ اس نے ایک لمبے عرصے
کے بعد یہ رویہ اپنایا تھا۔

”میں تمہارا گھر ڈھوں۔۔۔۔۔ مجھے تم سے نپا
کون عزیز ہو گا؟ تم سے زیادہ کس کی فکر ہو گی؟“
ہدیٰ نے گھر اسٹائنس چھینچا۔ ”میں تو رہنا چاہتی
ہوں۔۔۔۔۔ میں ہر وقت تمہیں گھسیٹ سکتی۔“

نے چڑ کر کہا۔
”ہدیٰ! تم ٹھیک ہو رہی ہو۔“

”بس تو تھوڑی سی اور۔۔۔۔۔“
”پہلے تو وہ جتنی رہی اور پھر ایک دم سے چلا
انٹی۔۔۔۔۔ مجھے جھوٹی امید نہ۔۔۔۔۔“

”ہو جاؤ۔“
فرشتہ دنگ اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ ”حق
میری نگاہ سب باتیں بھلا دیتا۔“

بدی! ہر بیماری، ہر دور میں..... یہ تو آنے والے وقت کے لوگوں کو قابل علاج لگنے لگی ہیں۔ فلو..... کیا تم جانتی ہو کبھی یہ بیماری انسان کو خوفزدہ کر دیا کرتی تھی؟ یہ وبا کی طرح پھیلی تھی اور اس نے نسلوں کی نسلیں ختم کر دی تھی۔ انفلوینزا..... کیا تم آج اس سے خوفزدہ ہو؟

”نہیں.....“ فرشتہ اسے حیران کر رہا تھا۔
”کتنا ذہین گارڈ ہے میرا؟“ وہ سوچ رہی تھی۔

”اس پر یہ بیماری میڈیسن یا ویکسین سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ بیماری موت کی دہشت تھی۔ یہ میں ایک صدی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر میں چند صدیاں اور پیچھے جاؤں تو ”گردن توڑ بخار“ یا سرخ بخار انسان کی جان لے لیتا تھا۔ نمونیا، ٹی بی، پیٹ کا درد، طاعون..... کیا آج تم ان بیماریوں سے خوف زدہ ہو؟ یہ بیماریاں تب کینسر سے زیادہ خوفزدہ کر دینے والی تھیں۔

اس وقت کے انسان کو بھی یہی لگتا تھا کہ ان بیماریوں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ مر جائے گا، کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ لیکن جو اس نظریے پر یقین نہیں رکھتے تھے، وہ اس کی دوا ڈھونڈ رہے تھے۔ شفا ڈھونڈ رہے تھے۔“

”نہ میں کوئی دوا بنا سکتی ہوں نہ شفا ڈھونڈ سکتی ہوں۔ میں مریض ہوں۔ ڈاکٹر یا سائنس دان نہیں۔“

”بیمار تو ہو۔ یہ بیمار ہے جو اپنے لیے شفا منگواتا ہے۔ تم اللہ سے شفا مانگتے ہوئے اس کا اختیار دیکھو، اپنی بیماری کی اسج نہیں۔ اپنی رائی کے دانے سے بھی چھوٹی عقل سے، اپنے رب کی عظمت کو نہ پرکھو۔ تمہارا شعور محدود ہے، اس کا اختیار لامحدود۔“

سائنس نے ہمیشہ ثبوتوں کی زبان بولی ہے، ثبوت..... پہلے زمین چٹنی (فلیٹ) تھی، لیکن جب آلات بنے تو زمین بیضوی نکلی..... کیوں؟ کیونکہ جو اسے چٹنی مانتے تھے ان کے پاس آلات نہیں تھے۔

زبان نئی شروع کر دی؟“
”سر تمام کر بیٹھ چکی تھی۔“ نہیں..... لیکن مجھے یہ مان لینے دو کہ میں اس بیماری سے نہیں نکل سکتی۔“
”تم اس بیماری سے کیوں نہیں نکل سکتیں؟ تم نے ایسا کیوں سوچا؟“

”کیونکہ اس کا علاج نہیں ہے..... مجھے دماغ کا کینسر ہے، میرا کینسر اپنی نوعیت میں پیچیدہ ہے۔“
”شفا سائنس کی زبان پر جھتی ہے نہ میڈیکل رپورٹس کی۔ وہ بس ملتی ہے۔ واقع ہوتی ہے۔ آسمان سے اترتی ہے۔ حکم پر، عمل درآمد کرتی ہے۔“ اس نے ایک درد بھرا سانس کھینچا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا یقین رکھو۔“

”میں نے یقین رکھا ہے.....“ اس کی آواز تیز تھی۔ ”رکھا ہے، لیکن پھر بھی..... یہ بہلاوا لگتا ہے۔“

”جب انسان یقین کھو دیتا ہے تو وہ سسٹم کو ریورس گیر (الٹا چلانا) پر چھوڑ دیتا ہے۔ پھر ہر شے، ہر کام، ہر چیز انہی چال چلنے لگتا ہے۔“ مایوسی کھڑی ہے۔ ”یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ ریورس گیر سے بچو۔ ایسا سمجھ لو کہ یہ انہی چال روحانی طاقت کو کھا جاتی ہے، جیسے آگ سوکھی لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر ز کا اس حقیقت پر یقین ہے کہ دوا، صرف پانچ یا دس فیصد کام کرتی ہے، باقی انسان کی انرجی کام کرتی ہے۔ اگر تم یقین رکھتی ہو کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو دوا اپنا اثر بڑھانے لگتی ہے کیونکہ تمہارا سسٹم ٹھیک کام کرنے لگتا ہے۔ تمہیں ہوا چاہیے تو تم فین آن کرو گی، روشنی چاہیے تو لائٹ آن کرو گی، انسان کو تندرستی چاہیے ہو تو وہ ”میں ٹھیک ہو جاؤں گا“ کا بن آن کرے۔ اپنی طاقت کو بیدار رکھے۔ دوا اور اس کی امید یہ دونوں مل کر اسے ٹھیک کر دیتے ہیں۔“

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ سسک رہی تھی۔ وہ لمبے عرصے بعد اس حالت میں آئی تھی۔
”میری کنڈیشن، رپورٹس۔“

”بیماریاں ہر زمانے میں لا علاج رہی ہیں

ثبوت نہیں تھے، بس ایک جاہلانہ نظریہ تھا۔ جو عقل مند تھے وہ یقین رکھتے تھے کہ زمین کیا ہے، نظام کیا ہے، کارخانہ خدا کیا ہے۔

عقل مندوں کے پاس ثبوت نہیں ہوتے۔ بدی ان کے پاس بس یقین ہوتا ہے۔ یاد رکھنا، یقین ہمیشہ عقل والے کے پاس ہوگا، جس کا شعور جاگتا ہے، وہ نشانیوں سے حقیقت کو پالیں گے۔ باقی لوگ ثبوت ہی ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔ جن کے پاس شعور نہیں تھا ان کے خدا سورج، چاند، ستارے تھے۔ جن کے پاس شعور تھا، ان کا خدا ”چا“ تھا۔ یقین اسے ہی کہتے ہیں کہ جو دکھائی نہ دے، لیکن موجود ہو۔ جو ہونے لگے لیکن ”ہو“۔

اگر انسان کچھ کرنا چاہتا ہے، تو اللہ اس سے وہ کروانا چاہتا ہے بدی انسان سے پہلے یہ چاہت، اللہ کی چاہت ہوتی ہے۔ پھر یہ چاہت زمین پر بھیجی جاتی ہے۔ یہ منتخب لوگوں کو سونپی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو حوصلہ نہیں ہارتے، ہار نہیں مانتے، اور یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ نہیں ہو سکتا، دراصل وہی تو ”ہوتا“ ہے۔

تمہاری بیماری کے لیے بھی خدا کی چاہت موجود ہے..... کیا تم وہ زمین چلا سکتی ہو؟

خدا کی چاہت..... یہ انسان کے نفع کے سوا کیا ہو سکتی ہے بھلا؟

کوئی نہیں جانتا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ انہوں نے دن گئے تھے نہ مہینے۔ رات کی تنہائی، یا دن کے واویلے انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی توجہ آسمان والے کی مرضی سے ہٹنے نہیں دی تھی۔ شہر میں رزق کی تلاش میں، رات میں شفا کی پکار میں، انہوں نے اپنے دلوں کو خشک، وہم اور وسوسوں سے پاک رکھا تھا۔

آج کی رات انہوں نے حمد کے بعد خدا کی چاہت کی بات کرنے کا عزم رکھا۔ ان کے ہاتھ بلند تھے، آنکھوں سے اشک رواں تھے، ان کی رو میں

ترپ رہی ہیں، اور وہ خدا کی چاہت کو جاننے کے لیے بے قرار تھے۔ انہوں نے کسی کی مدد، انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ ساری دنیا بھلا کر، اپنے اشک منار، صرف ایک ذات پر انحصار کر رہے تھے۔

”ہم بھی یہ جان نہیں پائے کہ آسمان کی دیوار دکھائی دیتا ہے وہ رات کو، دلوں کے لیے گناہ کا اچھا یہ وہ راز ہے جسے سب رات کہتے ہیں، اس کی جتنی تاریک ہو، کتنی بھی جلی ہو، وہ روشنی رکھتی ہے۔ وہ دن کی نوید بھی رکھتی ہے کیونکہ اللہ کی بھی شے کو حاصل نہیں۔ پھر کوڑھ کو بھی کسے حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ بھی جلد مٹ جائے گا۔ کیا خدا اشارہ ہے اور یہی اس کی چاہت۔ سورج، چاند، روشنی جیسا بدی ہے، لیکن جلاتی نہیں، مثلاً چرخ، ایسی عقل، پر حیران ہوں جو پکار پیاں صرف کر نہیں بھیجتی ہے۔

روشنی..... یہ کائنات کا اندھروں کے انتظام ہے۔ پھر ہماری ذات کے اندھروں کے لیے عیسیٰ مخلص بھی آئے ہیں؟ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہماری روشنی موجود ہے۔ وہ ہم تک آ رہی ہے۔ خدا کی چاہت ہے۔

”وہ ہم تک آ رہی ہے۔ وہ ہم تک آ چکا ہے۔ وہ کامل یقین سے ہار ہار کہہ رہے تھے۔ رورہے تھے۔ ہم نے شک کیا اور یقین کو بے یقینی لیا۔ ہم تجھ سے دور ہو گئے، غیر حاضر رہے۔ ہمیشہ قریب رہا اور موجود رہا۔ یہ حیرت انگیز پیار بھی۔ ہمارے ہاتھ بلند ہیں اور یہ صرف حیرت انگیز طرف بلند ہیں۔ آسمان کی سب چیزیں زمین چیزوں سے افضل ہیں، ہمیں بھی آسمانوں سے زمین پر بھیجا گیا، ہماری عزت بھی وہیں سے آئی ہے۔ زمین کے اس عارضی بڑاؤ کے لیے آسمان سے اپنے لیے سب سے ”افضل“ چیز کی مالکتے ہیں۔ حیرت چاہت کی۔ اے عظیم رب اگر یہ کوڑھ حیرت چاہت ہے

میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا سب کوڑھیوں نے اپنی قبریں کھود کر خود کو دفنایا ہے۔
”پہاڑ کیوں توڑے گی، اپنے لیے آسمان کے دروازے کھولے گی۔“

والد سمجھ نہیں پارے تھے کہ دبیسا سے لوگوں کی نفرت کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ جرات مند ہے؟ یا اس لیے کہ وہ عقل مند اور باشعور ہے؟ یا اس لیے کہ اس نے کوڑھی ہونے پر بھی کوڑھیوں جیسی زندگی نہیں گزاری۔ اس نے لوگوں سے بھک اور ان سے ان کا رحم نہیں مانگا۔ وہ بد صورت ہو کر بھی بہادر رہی۔ وہ زخم خوردہ ہو کر بھی زخمی نہیں ہوئی۔ ہر انسان اپنا عروج اور دوسرے کا زوال ہی کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟ ہر انسان۔ لفظوں میں ”لعنت“ اور اعمال میں ”کوڑھ“ کا انتخاب ہی کیوں کرتا ہے؟

وہ لوگ جو کبھی کسی کوڑھی کی خبر لینے کے لیے گھاٹیوں میں نہیں گئے تھے وہ لوگ اب توہ لینے کے لیے گئے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ سب بیمار غار میں بند ہو کر، رات دن عبادت کر رہے ہیں۔ بھوکے، پیاسے، تکلیف سے تر پتے، پاگل، بیکے ہوئے، لعنتی، بد بخت۔ آخر کس چیز نے انہیں اتنا یقین دلا دیا ہے کہ وہ ضرور کچھ پائی لیں گے، ضرور کچھ لے کر ہی اٹھیں گے۔ کیا چاہیے انہیں؟ جو بھی چاہیے۔ وہ انہیں کبھی نہیں مل سکتا۔

”تم نے ہر حال میں اپنی بیٹی کا دفاع کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔“

”بھئی ڈھال کو تلواریں بننے دیکھا ہے؟“ والد نے پوچھا۔ ”باب ہوں اس کا، تمہیں اس کی خوش نصیبی پر شک ہو سکتا ہے، مجھے نہیں۔“

”تم دونوں خوش نصیب باب بیٹی! یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ خدا کے لیے کوڑھی کیسی کسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ خدا ان سے پوچھے۔ ایک کوڑھی کہہ رہا تھا کہ ہم اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہیں یہ سکھار ہی تمہاری بیٹی انہیں۔“

”جو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ وہی سکھار ہی ہے۔۔۔۔۔ مجھے

بہن قبول ہے، اگر یہ کوڑھ ہماری سزا ہے، تو ہمیں سناں اور اگر یہ ہماری آزمائش ہے تو ہمیں آسانی مطلوب ہے۔ لیکن اے رب! اگر اس پر تیری مرضی کچھ اور ہے تو ہمیں وہ مرضی مقصود ہے۔“ وہ سسک رہی تھی۔

”ہمیں وہ مرضی مطلوب ہے۔“ وہ سب ایک زبان کہہ رہے تھے۔ ان کے رونے کی آواز نہیں تھی، بس آہیں تھیں۔ ان کے غلیظ جسوں کے اندر، بدبو دار زخموں کی تہہ میں، اندھیروں میں روشنی ہو رہی تھی۔

”کائنات کے تمام امور خدا کے حکم سے انجام پاتے ہیں، یہ بیماری، اس کی شفا پر اپنا حکم واجب کر دے۔ انسان کی ساری حقیقت بس یہی ہے کہ اس کا ”ایک رب“ ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے اور یہی اس کا نفع۔ اے رب! اگر تو راستہ نہ دے تو ہماری جانوں کا بچنا محال ہے۔ جیسے اگر میتائی نصیب نہ ہو تو دیکھنا محال ہے۔ ہم دانا نہیں، ہم پینا بھی نہیں، ہم تو طلب گار ہیں، اس چاہت کہ جو تیرے پاس ہے، اور جو ہمارا نصیب، ہمارا مقصود ہے۔ وہ جو ہمارا نفع ہے، اور ہمیں ہی دیا جانے والا ہے۔ یہی ہماری طلب ہے، اور یہی ہماری ”دعا“ ہے۔“

اللہ کو کوئی چیز اتنی عزیز نہیں جتنی دعا۔

وہ رات بھر روتی رہی۔ وہ دن بھر کہتی رہی۔

یہی دعا جو دبیسانے کہی، یہی دعا بدی نے کہی۔

اللہ کو کوئی آواز اتنی محبوب نہیں۔۔۔۔۔ جتنی طلب گار کی صدا۔

دن کی روشنی میں، رات کے اندھیروں میں، ان سب نے رب سے بس یہی کلام کیا۔ اپنا ارتکاز ٹوٹے نہیں دیا۔ اپنا مطلوب چھوٹے نہیں دیا۔ ان کی چاہت، اللہ کی چاہت وہ ایک ہو جانے کو کہ۔۔۔۔۔

”تو اب اے غاروں میں بیٹھ کر تمہاری بیٹی کیا پہاڑ توڑے گی؟ دیکھو ذرا اس کے تماشے ہی ختم نہیں اور ہے۔“ تین دن گزر گئے تھے انہیں کوئی کوڑھی شہر

"-۱۴۰۵

”وہ ہاتھ لگاتے ہیں اور.....“

اور والد..... وہ پوری شدت سے چلا اٹھے۔
 "میں یقین رکھتا ہوں، یہ ایسے ہی ہو گا۔ میں
 یقین رکھتا ہوں۔" وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر
 رو دیے۔ سارا جھوم ان کی ہچکیاں سننے لگا۔ "ممکن
 تو یقین کروں گا۔ اس مجزے پر، اس شفا پر۔ اس
 میساج پر۔"

اس رات دبیسہ کے کوڑھ کا سن کر اس کا بھائی
شہر میں دبیسہ، دبیسہ پکارتا، روتا، مچلتا، بھاگتا پھرتا تھا۔
اس دن دبیسہ کے والد..... دبیسہ..... دبیسہ چلاتے
ہوئے شہر سے باہر، گھاٹیوں کی طرف بھاگے جانے
تھے۔ وہ روتے جاتے تھے، اور کہتے جاتے تھے۔
”دبیسہ..... میری دبیسہ..... تمہارا معجزہ۔
تمہاری شفا..... زمین پر آ چکی ہے۔“
”اللہ کی مرضی..... اس کی چاہت، وہ تم سب
کی جھولیوں میں ڈال دی گئی ہے۔“

اس دن گھائیوں میں یہ آوازیں دن بھر گونگ رہیں۔ والد جوشِ مسرت سے چلاتے رہے، اور بے رہے، اور مسکراتے رہے۔ گھائیوں سے باہر نکلتے ہوئے انسان کو اس معجزے پر یقین نہیں تھا۔ یہ تھا تو صرف کوڑھیوں کو ہی تھا۔ وہی تھے اس معجزے پر سب سے پہلے ”ایمان“ لانے والے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ”یقین“ کسے کہتے ہیں۔ اور وہ جانتے تھے کہ ”معجزے“ کن کے لیے ہوتے ہیں۔

☆ ☆ ☆
 ”کیونکہ میں جان گئی ہوں کہ یقین کے لیے
 ہیں اور مجھ سے کن کے لیے ہوتے ہیں۔ اللہ کی
 طرف سے ہر انسان کے لیے۔ اللہ کی طرف سے
 میرے لیے۔“ روتے ہوئے بدی نے اپنی دعا
 مکمل کی۔

یقیناً "کتاب عمل ہو چکی ہے۔"

فر ہے اس پر۔“
 ”ہاؤ اور جا کر اس سے کہو ٹیل دو گلڑے ہو
 سکتا ہے لیکن کوڑھی شلایا نہیں ہو سکتا۔ وہ پتھروں
 سے اپنا سر پھوڑ پھوڑ کر مر جائے گی لیکن اپنے ایک
 زخم سے بھی جان نہیں چھڑا پائے گی۔ میرے بس
 میں ہو تو میں سب کوڑھیوں کو اٹھا اٹھا کر سمندر میں
 پھینک دوں۔ ساری زمین کو غلات سے بھر دیا
 ہے۔ اب مجھے ہیں شور شرابا کرنے۔“
 ”جانے۔“

والد کی آنکھیں یکدم نم ہو گئیں۔ انہیں دیکھا
کی بیماری کا ایسا غم نہیں تھا، جتنا ان باتوں کا تھا۔ اس
کے زخم ایسے بد صورت نہیں تھے، جتنے لوگوں کے لفظ
تھے۔ وہ کس کس کا منہ توڑتے۔ کس کس سے جا کر
کہتے کہ چپ ہو جاؤ، وہ میرے دل کا سکون ہے،
اسے کچھ نہ کہو۔ وہ بیمار ہو گئی ہے، شہر بدر ہو چکی ہے،
خدا کو راضی کر رہی ہے..... اب تو چپ رہو..... کچھ تو
حم کر دو۔

بلند گھاٹیوں میں سجدے میں گر کر روتی دیکھا۔
بلند گھاٹیوں سے پرے..... شہر کے جھوم میں
سکتے والد.....

اس کی چاہت کہ وہ عرش ہلا دے..... ان کی
 تڑپ کہ وہ زمین والوں کو دکھادیں کہ.....
 ”کوڑھ..... کیا اس شہر میں بھی کوئی کوڑھی
 ہے؟“ مسافر گھڑ سوار نے ان کی باتیں سن لی تھیں
 شاید۔

والد نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا۔ ”اسی شہر میں تو سب سے زیادہ ہیں۔ کیوں؟؟“ ان کی آواز کاٹنے لگی تھی۔

”اُس شہر تک خبر نہیں پہنچی؟ ان کے ہاتھوں میں کوزہ کی شفا دی ہے اللہ نے..... معجزہ..... ایسا کہتا ہے عیسیٰ کا..... اللہ کے نبی کا۔“

انجمن کو سناپ سوکھ گیا تھا۔ چند لوگ ہنس دے
تھے۔ چند نے گردنیں جھٹلی تھیں۔ ”کیسی بہکی بہکی
باتیں کر رہے ہو، کوڑھ لا علاج مرض ہے، کیسے ٹھیک

ہوں گے۔“

والد خاموش رہے۔ دنیا سے پھول کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ ایسے ہی جیسے کانٹے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

دبیسہ کی دعا، ہڈی کی دعا، دبیسہ کا یقین، ہڈی کا یقین۔۔۔۔۔ وہ جو کچھ دے سکتی تھی، وہ دے کر اس نے۔

وہ ہاسپٹل کی زیر تعمیر عمارت دیکھنے کے لیے کاٹوا آئی تھی۔ اسے سفر کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح سے ڈاکٹر کو بہلا کر آ گئی تھی۔ ماما،

پاپا اور اس کے سب دوست اس کے ساتھ تھے۔

اسکول کے بچوں اور بیمار بچوں نے انہیں خوش آمدید

کہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی خوش نہیں

ہوئی تھی، جتنی وہاں جا کر، بچوں سے مل کر، ان کی

مسکراہٹیں دیکھ کر ہوئی تھی۔ عمارتیں، ہاسپٹل، فلاحی

ادارے۔۔۔۔۔ یہ بنتے ہی رہتے ہیں۔ انسان بس

ذریعہ ہوتا ہے، اصل کام تو آسمان سے ہوتا ہے۔

لیکن انسانیت۔۔۔۔۔ انسانیت کی عمارت۔۔۔۔۔ یہ انسان

کو خود تعمیر کرنا پڑتی ہے۔ کبھی اس کا درجہ اور تہ بلند

ہوتا ہے۔

وہ سکون کی اس بلندی پر تھی کہ خود بھی اندازہ

نہیں لگا سکتی تھی۔ انہوں نے بچوں کے ساتھ کیک

کاٹے، اپنی بھدی آوازوں میں گانے گا کر سنائے

اور بے کار کے ڈراپے پیش کیے۔ بچے ہنستے رہے،

وہ بھی ہنستے رہے۔ دو تینیں بنا کر انہوں نے فٹ بال

کا میچ کھیلنا شروع کیا تھا اور۔۔۔۔۔ جب وہ فٹ بال کو

کلک لگانے کی کوشش کر رہی تھی تبھی اسے آسمان

مگھوٹا ہوئی دکھائی دیا۔۔۔۔۔ وہ چکر اکر گر گئی۔

وہ پندرہ دن سے ہاسپٹل میں ہے۔ یہ کانٹو کا ہی

ایک فلاحی اسپتال تھا۔ اسے واپس نہیں لے جایا جاسکتا

تھا۔۔۔۔۔ کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ موت کی اس

خیم۔۔۔۔۔ خیمہ کی اس سنگ دلی سے وہ کب لوٹے گی۔

وہ بار بار کومہ میں جا رہی تھی۔ اس کا ہوش میں آنا

بھی گہری خیمہ کی ہی خیمہ تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا

سمندر کی وسعت میں، کشتی کے بادبان کے

ساتھ کھڑے ہو کر دبیسہ نے دور کنارے پر کھڑے

والد کو دیکھا۔ وہ خوشی سے رو دی تھی۔ اس کے سر پر

اس کا پرندہ چل رہا تھا۔ اس کی طرح وہ بھی خوش تھا۔

یہ پرندہ ہی ان سب کو آگے کا راستہ دکھانے والا تھا۔

وہ سب ایک لمبے سفر پر جا رہے تھے۔ وہ اپنے میسا

سے اپنی شفا لینے جا رہے تھے۔

سمندر کے پانیوں پر اڑتا پرندہ۔۔۔۔۔ وہ سبز شاخ

لے کر آنے والا تھا۔

”ایک لمبا سفر ہے جو انہیں کرنا ہو گا۔“

کنارے پر کھڑے والد بڑبڑائے۔ ”کھنکھن اور

مشکل۔ درد ناک اور مصیبت زدہ۔ یہ گریں گے،

روئیں گے، طوفان ان سے ٹکرائیں گے، سرد ہوائیں

انہیں بے حال کر س گی، لوگوں کے طعنے اور ان سے

دھکار پائیں گے لیکن یہ یقیناً چلتے رہیں گے۔ اپنا

سفر روکیں گے نہیں کیونکہ یہ جان چکے ہیں کہ روشنی

انہیں ہی ملتی ہے، جو اندھیروں سے ٹپکنے کی تک دو

کرتے ہیں۔“

کشتی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

کوڑھی۔۔۔۔۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے جا رہے تھے۔

ان کی واپسی کے انتظار میں والد پھولوں سے

بھری نوکری شہر کے دروازے پر رکھ کر انتظار کرتے

تھے۔ وہ بلندی پر چڑھ کر بیٹھ جاتے اور اپنی دبیسہ کی

راہ دیکھتے۔۔۔۔۔ ایک سال تین مہینے گزر چکے تھے۔

ایک صدی بھی گزر جاتی تو کبھی وہ مایوس نہ

ہوتے۔ سمندر کی وسعت، زمین کا پھیلاؤ، یہ باپ

کی محبت کو مات نہیں دے سکتا تھا۔

یہ قصہ بھی پرانا ہو چکا تھا کہ کبھی ان گھائیوں

میں کوڑھی رہتے تھے۔ پھر وہ اللہ کے نبی کی تلاش

میں نکلے۔ نہ پہلے کسی کو ان کی پروا تھی، نہ اب بھی۔ نہ

پہلے انہیں یقین تھا کہ یہ بیماری ٹھیک بھی ہو سکتی ہے

اور نہ اب تھا۔

”پھول تو زوڑ کر تم نے دنیا جہاں کے سارے

بان اُجاڑ دیے۔ اب تک تو وہ سب مر کھ چکے

زندگی کے غموں کو دل سے اتار پھینکا ہو۔ جس نے
 فکروں کی جالیوں کو آگ لگا دی ہو۔ جس نے حقیقی زندگی
 کے معنی سمجھ لیے ہوں۔ جس نے جان لیا ہو کہ زندگی
 ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ زندگی کے ساتھ بھی اگر نہیں
 لگتا۔ اس جہاں اور اس جہاں، اور اس سے پہلے کہ
 جہاں۔ زندگی کے ساتھ بھی اگر نہیں لگے۔

موت۔۔۔۔۔ یہ تو بس ایک مرتبہ کا قسطہ ہے۔
 باقی ساری کہانی تو بس زندگی ہی کی ہے۔
 یہ زندگی۔۔۔۔۔ اگلی زندگی۔

ماں نے آسمان کی طرف دیکھا، اور باپ نے
 اس کی تھید کی۔۔۔۔۔ دل پر پتھر رکھ کر، دنیا جہاں کے
 خوف اور خدشات میں گھر کر انہوں نے انجکشن کی
 اجازت دے دی۔۔۔۔۔

ہم ہم ہم

”دیسا۔۔۔۔۔“ بلندی پر بیٹھے والد نے، دور
 سمندر میں دکھائی دینے والی کشتی کو دیکھ کر چلا کر
 پکارا۔ کشتی تو ابھی بہت دور تھی۔

”ہڈی۔۔۔۔۔“ اس نے اس کے گال پر اپنا ہاتھ
 رکھ کر اسے تھپکا۔ اسے پکارا۔۔۔۔۔ ہڈی تو ابھی بہت
 دور تھی۔۔۔۔۔

دیسا۔۔۔۔۔ میری جان۔۔۔۔۔ میرا پھول۔۔۔۔۔“
 والد چلاتے ہوئے اس کی طرف بھاگے۔ شہر والے
 متوجہ ہوئے بغیر نہیں رو سکے تھے۔

”ہڈی۔۔۔۔۔ وہ اسے مسلسل تھپک رہی
 تھی۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔۔۔“

ماں کی سانس اس کی سانس میں اٹکی تھی، باپ
 کی جان اس کی جان میں تھی۔۔۔۔۔

ہڈی۔۔۔۔۔ وہ پکار رہی تھی۔۔۔۔۔

”دیسا۔۔۔۔۔“ والد کی پکار، والد کا پیار، والد کا
 جہاں۔۔۔۔۔ وہ کشتی کے ہادہاں کے ساتھ کھڑی
 تھی۔ وہ نوکری سے پھولوں کو نکال نکال کر سمندر کی
 اوڈن کے سپرد کر رہے تھے۔ وہ سارے سمندر کو
 پھول کر دیں گے، وہ سارے جہاں سے کانٹے بن
 گئے۔ اس کے سارے بہن بھائی، اس کا نام پکار

پکار کر دیوانے ہو رہے تھے۔ ماں آبی نمی کرتی تھی
 چلتی تھی۔ اسے آبی بھی ہوش نہیں رہا تھا۔
 اپنا آنکھیں رگڑتی دیکھا۔۔۔۔۔ وہ سوجھی کے
 کنارے پر کھٹے سے پہلے ہی، کھینچ کر پانی میں
 چھٹا لیں، ماری، والد کے سینے سے جا لگی تھی۔ اس کا
 حسن بے مثال تھا، اس کا تھال باکمال تھا۔

”میری آنکھیں کا نور۔۔۔۔۔ میری دیسا۔۔۔۔۔“
 ہڈی نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔۔۔ اسے دو تھیلی
 آنکھیں دکھائی دیں۔ وہ یہ آنکھیں پہلے بھی دیکھی تھیں
 تھی۔۔۔۔۔ یہ آنکھیں۔۔۔۔۔

”میں اور میری ٹیم جچھے دو سال سے اس
 میڈسن پر کام کر رہے تھے۔ آپ بیمار کیل سہیل
 ہیں جس پر یہ میڈسن اپلائی کی گئی ہے۔ آنکھیں
 کھول دیں، پوری طرح سے ہوش میں آنے کی
 کوشش کریں۔“

ماں فرط جذبات سے اس پر جھک گئی۔ ”جیسا“
 ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم ہوش میں آؤ۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔“
 اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔

”ہڈی! بہت دیر سے سو رہی ہیں آپ۔
 کیوں؟ جاگ جائیں آپ کو اچھا لگے گا۔ سر جھٹک
 ہوں۔ ایک شیلے۔۔۔۔۔ مجھے بتایا گیا کہ سر آپ سے
 پہلے بھی مل چکی ہوں، آپ کو پھول دیتی رہی ہوں۔
 آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔ آج سر آپ کا
 زندگی کی نوید دیتی ہوں۔ خوش آمدید۔“

اس کی آنکھیں کھل گئی۔ پوری طرح سے۔
 سامنے اس کا فریضہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ فریضہ
 اس کا پرندہ خوشی سے ٹپک رہا تھا۔

دیسا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ہڈی نے
 کھڑکی سے جھانکتے آسمان کو اپنے قریب رکھا۔
 ”نو زمین سے نہیں ہوتا، وہ آسمان سے
 ہوتا ہے۔ یقین رکھیں۔۔۔۔۔ ضرور ہوتا ہے۔“



حکیم

تالیہ خواب میں قاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ تالیہ سے اپنی فاکس کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلکہ کر کے سکھواتی ہے، مگر سکھ اس کے ہاتھ میں نہ دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ قاتح صاحب کے ذریعے قاتح کو عالم کا پتا چلتا ہے۔ فاکس کی واپسی کے لیے عالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے، منصوبے میں قاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ قاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اثر ہے۔ عالم پتا چلا لیتا ہے کہ فاکس اشعر کے آفس میں ہے۔

صبح تالیہ کو بلکہ میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، صبح کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ عالم جان پہ کھیل کے روز ہی فاکس اشعر کے سف سے چر اگر لادیتا ہے۔ قاتح، عالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ دو تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے قاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو قاتح اور اشعر دونوں آتا ہے۔ قاتح سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی قاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کتوں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ قاتح سے



کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ مصر وادوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آدابھو کے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے لاشیں پھانسیوں پر لٹا کر ان کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ محاربت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو چکی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مٹ شدہ لاش دفن دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کیچڑ بناتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کر لیا تھا۔

ایڈم ملای کہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسیلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم ملک میں ہر راستے میں فاتح کو پہنچاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر ہلندہ ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ نئی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ چند ہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر مکمل جاتا ہے کہ تالیہ ہی عالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھارہی ہے اور اس نے تالیہ کے کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا قہقہہ ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ جاپانی بنادے گا اور وہ اس ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ماکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبودار قدیم ماکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور جاپانی زبردستی کھڑکرائے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ماکہ کے ایک قدیم خانے میں جاتے ہیں۔ پہنچ کر وہ کئی تھی۔ وہاں کی انپارچ مسز ماریہ نے اس کا بریسیلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار

لے بہت سی لایا تھا۔ وہ مکمل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم نے تالیہ پر چوری کا لالچ لگایا تھا۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسز ڈوالمٹس آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا سن بچاؤ لیاٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر کل کا اسٹج بناتی ہے۔ ذرا

اسے پہاڑ کا اب اور سکے کا ایک شعبہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔ ذرا لالشی ایک کون آرٹسٹ اور اس کا مر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ لیاٹ کرنے نہیں آتا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھتا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسٹج ہتھیاتی ہے۔ تو وہ غلط اسٹج بنا کر اسے چھینتی ہے۔

تالیہ کو ہار ہار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا براسلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس کی اس شیلی کے دادا جی کے نقل کا مجسمہ لالشی لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ لالشی کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے ہالڈ لالشی کو ڈھونڈ لگا لالشی اور احسان مندی کے طور پر ڈوالمٹس نے اسے اپنا سارا ہنر دکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو "ابو الخیر" نامی آدمی کے کارندے ایک منجر ہے میں قید کر کے محوڑا گاڑی کے ذریعے قید

تالیہ کے طور پر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایلام کو آزاد کرنا چاہتی ہے۔ مگر قلع کو آزاد کرانے سے پہلے انہوں کا رویہ کونسا ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں قلع کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ قلع کو ایک قید خانے میں قفل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں ایک "لیڈ" تھری کے ساتھ ہر اسلوگ کیا جاتا ہے۔

قید میں قلع کو اور ایک ایسا ہتھکڑیاں میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے تہم و کیم میں پھرنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی قربانیت سے وہ دونوں اپنے انہوں کا رویہ بدل کر محسوس بدل کر طور میں ہی بھرتے ہیں۔ یہاں تالیہ یہ افکشاف لگاتا ہے کہ وہ خود اپنے انہوں کا قید خانے اور بندہ بار کی جگہ ہے۔ بندہ بار اور اپنے ساتھیوں سے غداروں کی کر کے انہیں چاروں طرف سے اور خود بیاہاد سے جو اس کا "انہوں" نے اسے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چیر ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر چکی ہے اور وقت کا دورہ ادا دیا کر چکی ہے۔ لیڈ مراد تالیہ کو اپنی جگہ تاشکی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایلام، وہ ان قلع کو ایہ اخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے موقع یا کرتالیہ کے بارے میں جانتا ہے قلع اس تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلع کے کنہ و اثر و توجہ میں ایلام بھی شامل ہے۔ مگر قلع کو ایہ کے مختلف مزا کیسے دیتا ہے ایلام کو شامی کتب خانے میں کام کرنے کی ہر ہمتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر حیرت لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائکہ واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر لیڈ مراد نے چاہاقت کا اور تعلیم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خود کو قید کر دیتا ہے۔ لیڈ کی خاص کثیر شریک اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی مکر و فریب پہ چلا کر اس کی وقار اور تفریحی ہے۔

ملکہ یان سینہ جیش بادشاہ کی جیش اور بادشاہ مرسل کی جیش سے مکر و فریب ایک عالم صورت ہے اور اس کے مقابلہ بندہ بار مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ ان قلع کو ایہ اخیر اپنے باورچی تھانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی نظر آئیں کھانے کو دیتا ہے کہ شادی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، قلع سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کام کیا ہے۔ انہوں نے تھے مگر قلع نہیں جانتا۔ ایلام "یہ کارایا ملازم" کے ہاتھ کو تھم لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب صحتی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تحصیل لیتی ہے۔

ایہ اخیر شامی خزانہ بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور لیڈ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متر متر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوئو "واگف" کی "کوشاکی خزانہ" بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ایہ اخیر کو وہاں قلع محسن بانو کے واگف کی سے متر متر دعوت میں من بانو واگف کی بھی موجود ہوتا ہے۔ ایہ اخیر اس سے غطر و محسوس کر کے قلع کے ہاتھوں سے زبرد و لوٹا ہے مگر قلع واگف کی کو خیر و دار کر دیتا ہے۔

قلع، واگف کی سے بے حد متر تر ہے اور اسے خزانہ کی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ایہ اخیر کو خزانہ کی دیکھنے کی سہولت کرتی ہے۔ قلع کو یہ بات نام کو گزر رہی ہے۔ تالیہ، ایلام کو شامی مورخ قیصرات کرتی ہے۔ قلع تمام قلاسوں میں آکر لڑکی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ لیڈ مراد تمام اہم جہدوں پر بادشاہ کو قلع کی کر کے اپنے آدمی قیصرات کر دیتا ہے اور ہر اور سے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شامی مورخ سے اپنی جھوٹی تقریریں کھولتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی حفاظت لیتی ہے تو اس پر افکشاف ہو جاتا ہے کہ وہ خیرہ طور پر کمالی گنی دولت، کسی خیرہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر ہر حاصل کرنے کے لیے ایہ اخیر سے راجہ راز کر سکتی ہے۔ قلع کو ہٹا چل جاتا ہے، وہ ہاراض ہوتا ہے اور بنیادی میں واگف کی کا قلعام بنے کو ترجیح دیتا ہے۔ قلع مستحق کی باتیں بنا کر واگف کی کو متر متر کرتا ہے۔

یان سوئو کے والد کو بادشاہ مرسل کی غٹر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستحق قلع کا پانی چاہتی ہے مگر شامی طبیب آنا کافی کرتا ہے۔ تالیہ مدافعت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ملکہ، تالیہ کی جاسوسی

کروا جاتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔
 قانع کے کہنے پر محمود مرنی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کا بت قانع کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔
 رجبہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر قانع کا دماغ مگھوم جاتا ہے۔ رجبہ مراد کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کر داتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ جاتی ہے اور فاتحہ کو خبردار کرتی ہے۔ رجبہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔

ملکہ یان سو فو کی کینریہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔
 تالیہ، عصرہ کو نیلامی والے دن گھاس غزال کی نقلی پینٹنگ کے اسکیٹڈل سے بچا لیتی ہے اور سن باؤ والے گھر کو کرائے پر حاصل کرنے کی بات کرتی ہے۔ وان قانع ایڈم سے اس رات کی بابت دریافت کرتا ہے۔
 تالیہ کے گھر سچ آتا ہے اور اسے دھمکا تا ہے۔ تالیہ اسے کہتی ہے کہ وہ اب اس سے ڈرتی نہیں ہے۔
 وان قانع حاکم (تالیہ) کو فون کرتا ہے اور اس سے اس رات کے بارے میں معلومات کے لیے کہتا ہے۔
 اشعرنا شتے پر تالیہ سے ملنے جاتا ہے وہاں رمی اس سے کہتا ہے کہ نقلی خریدار پینٹنگ کے پیسے مانگ رہا ہے۔ اشعرنا سے سخت کہتا ہے۔ تالیہ اشعر کو ہنسی ہنسی میں بہت کچھ جتا دیتی ہے۔ اشعرنا چاہتے ہوئے بھی مسکرا کر اس کی بات سنتا ہے۔ تالیہ وان قانع کے آفس میں اس سے نوکری دلوانے کا کہتی ہے۔

ایڈم کی ماں اس سے کہتی ہے کہ وہ جلد از جلد نوکری ڈھونڈے ورنہ اس کی مستقبل ختم ہو جائے گی۔
 تالیہ وان قانع کے آفس جاتی ہے وہاں سچ اسے بلیک میل کرتا ہے تو وہ واش روم میں اسے بلا کر اپنے ہیرے کے ٹاپس دے دیتی ہے۔
 عصرہ کے بچے وان قانع کے کمرے سے چرائی فائل کے بارے میں جانتے ہیں۔ عصرہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔
 بچوں کو دھمکا جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے۔

PakiBooks.Site

انیسویں قسط

گیلے بالوں اور کپڑوں کے ساتھ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اب ایک بھرپور چٹھی انجوائے کرنا نظر آ رہا تھا۔

”قانع صاحب.... وان قانع!“

آوازوں سے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ رپورٹرز نے اسے ڈھونڈ لیا ہے۔ اس نے بس مسکرا کے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ مکھڑوں کی طرح اطراف سے اس پر جھپٹے۔ پل بھر میں سامنے پانچ چھ افراد جمع ہو گئے تھے۔ ایک دو نے چھتریاں تان کے باقی سب کو بھی بارش سے بچا لیا تھا۔ کچھ چھترے آگے تھے۔
 ”آپ نے کاغذات نامزدگی جمع کروادیے

حکام سے فون پہ بات کرتے ہوئے سرک پہ تیز تیز چل رہا تھا جب بارش شروع ہوئی۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس کانوں میں بینڈز فری لگائے، اس

نے چہرہ اٹھا کے آسمان کو دیکھا، پھر قدم تیز کر دیے۔
 قریب میں بس اسٹینڈ کا چھپر بنا تھا۔ قانع نے بات جاری رکھتے ہوئے، جیب سے پانی کی گھیسی سی بوتل نکالی اور شیش کی طرف آگیا۔

حاکم نے ایک دم سے کال کاٹ دی تو اس نے برامانے بغیر بینڈز فری کانوں سے نکالے اور بیچ آ بیٹھا۔ پھر بوتل لبوں سے لگائی اور موبائل کھول کر دیکھنے لگا۔

ہے اور پھر الیکشن سے پہلے بہت سے کاغذات جمع کروائے جاتے ہیں۔“

ہینڈ زفری کانوں میں ڈالتا وہ فٹ پاتھ پہ آگے بڑھا تو رپورٹرز اپنے مائیک اس کی طرف بڑھائے لائے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔

”آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اشعر صاحب صرف کوریگ امیدوار ہیں؟ اور وہ بعد میں کاغذات واپس لے لیں گے؟“ ایک لڑکے نے بلند آواز میں پوچھا۔ (کوریگ امیدوار دراصل امیدوار کا حامی ہوتا ہے اور اس لیے کاغذات جمع کرواتا ہے تاکہ اگر اصل کے کاغذات مسترد ہو جائیں تو اس کا گروپ اس کو کھڑا کر سکے۔ مسترد کیے جانے کے فیصلے کے آنے تک کاغذات نامزد کی جمع کروانے کا وقت ختم ہو چکا ہوتا ہے۔)

”مگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنی جاگک مکمل کر لوں کیونکہ میرے سامنے ایک لمبا دن

ہیں۔ کیا آپ خود کو بی این کا اگلا حیر میں بننے دیکھ رہے ہیں جبکہ کچھ عرصہ پہلے تک آپ کے استعفیٰ کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔“

کسی نے مائیک اس کے چہرے کی طرف کیے سوال جھاڑا۔ وہ مسکرا کے پیچھے ہوا، ایک بازو شیخ کی پشت پر پھیلا دیا اور ٹانگ سے ٹانگ جمالی۔

”وان فاتح استعفیٰ نہیں دے رہا... نہ دے گا۔ میں الیکشن لڑ رہا ہوں اور بالکل لڑ رہا ہوں۔“

”مگر کچھ عرصہ پہلے تک لوگ آپ سے یہ سوال پوچھتے تھے تو آپ جواب گول کر جاتے تھے۔ اب آپ بہت دھڑلے سے الیکشن لڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ کیا تب آپ کو لگتا تھا کہ آپ کو مخالفتوں کے باعث الیکشن سے دستبردار ہونا پڑے گا؟“

”دیکھیں الیکشن لڑنا تو میں اس دن چھوڑوں گا جس دن آپ کو اطلاع ملے گی کہ بعد نماز عصر وان

فاتح کا جنازہ ہے۔ ورنہ اس زندگی میں سیاست میں ایک دفعہ اتر جانے والا اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔“

بارش میں کھڑے رپورٹرز کا تہہ بہہ گونجا۔

”مگر فاتح صاحب..... جب سے آپ کی دکانیں جلی تھیں اور آپ کی انوسٹمنٹ ڈوبی تھی عام

تاثر یہ بن گیا تھا کہ آپ کے پاس الیکشن لڑنے کا پیسہ نہیں ہے۔ تو اب آپ کے مالی حالات کیسے ہیں؟“

”اب صوفیہ رتن کی طرح میرے باپ نے بھی کرپشن کر کے لامحدود دولت اکٹھی کی ہوئی تو میرے

مالی حالات کو اس آگ سے فرق نہ پڑتا مگر خیر.... میں الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں ہوں۔“

”فاتح صاحب یہ بتائیے:“ دوسرے رپورٹر نے سانس لیے بغیر پوچھا۔ ”نازہ اطلاع ہے کہ کل

اشعر محمود بھی چیرمین شپ الیکشن کے لیے کاغذات جمع کرانے جا رہے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا

کہیں گے؟“

فاتح نے جیب سے ہینڈ زفری نکالے اور ان کی گردہ کھولنا اٹھا۔ ”کاغذات جمع کروانا ہر ایک کا حق

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سوچ نگار کی دانی



وحشیہ جمیل

قیمت - 350/- روپے

منسلک کاغذ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

دیتے تھے۔ ایڈم نے شرمندگی سے اپنے چھوٹے
سے بانیچے کو دیکھا، پھر ہاتھوں سے شرٹ کی نادیہ
فلٹیں درست کیں اور کنگھارتا ہوا قریب آیا۔
”پتہ تالیہ!“

وہ اس کی طرف گھومی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔
تالیہ نے سفید ہیٹ ترچھا کیا تو اس کا چہرہ پورا نظر
آیا۔ اس چہرے پر صرف سادگی تھی۔
”اندرا..... اندرا آئیے۔“

وہ گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ یعنی سڑک پر۔
ارد گرد چھوٹے گھروں کی قطار تھی اور لوگ آ جا رہے
تھے۔ ایک لڑکی پرآم دھلیاتی آ رہی تھی۔ ایک فربہ
مانگی عورت سبزی وغیرہ کے تھیلے اٹھائے سامنے جا
رہی تھی۔ ایک بوڑھا جوڑا خوش گوار موسم کے باعث
چہل قدمی کرنے نکلا ہوا تھا۔

”یہ عورت کبھی اس لڑکی جیسی ہوگی۔“ اس نے
ایرو سے سامان اٹھائے چلتی عورت کی طرف اشارہ کیا
تو ایڈم نے اس کی نکاہوں کے تعاقب میں پہلے اس
مونی عورت کو دیکھا پھر اس نوجوان لڑکی کو۔ ”کبھی یہ
اتنی پتلی ہوگی لیکن اپنی شادی کے تین چار سال بعد یہ
ایسی ہوگی ہوگی۔ تقریباً بیس کلو وزن بڑھا ہوگا جس کو
یہ گھٹانے سکی ہوگی۔“

ایڈم غور سے اسے بولتے ہوئے دیکھ رہا
تھا۔ اپنے گھر پہ شرمندگی اپنا رخ حلیہ ’ساری فکریں
ذہن سے محو ہونے لگیں۔

”جانتے ہو پتلے لوگ مونے کیوں ہو جاتے
ہیں؟“ تالیہ گردن مونے پتلی لڑکی کو پرآم دھلیاتے دیکھ
رہی تھی۔

”کیونکہ وہ بہت کھاتے ہیں۔“
”مگر کتنا کھاتے ہیں؟ پتا ہے ایک حقیقی ہوگی
اس بارے میں کہ پتلے لوگوں اور مونے لوگوں کی
روزانہ کی خوراک میں کتنا فرق ہے؟“
وہ ذہم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہی تھی۔

”مونے اور پتلے لوگوں کی سال بھر کی خوراک
کا موازنہ کیا گیا تو معلوم ہے ’شاہی مورخ‘ ہر روز

مونے لوگ پتلے لوگوں سے کتنا زیادہ کھاتے ہیں؟“
اس نے چہرہ موز کر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔
”صرف ایک نوالہ زیادہ!“

ایڈم نے بے یقینی سے ایہہ اٹھائے۔
”ایک نوالہ؟ صرف ایک نوالے سے کون مونے
ہوتا ہے؟“

”بالکل۔ یہ عورت بھی یہی سمجھتی ہوگی کہ روز کا
ایک نوالہ زائد کھانے سے میں مونے کہاں ہو سکتی
ہوں۔ مگر ہر روز کا ایک زائد نوالہ جو اندر جاتا ہے وہ
جمع ہوتا جاتا ہے اور سال بھر میں چار پانچ کلو وزن
بڑھاتا ہے۔ شادی کے چوتھے پانچویں سال تک
لڑکیاں پندرہ بیس کلو بڑھا کر مونی مرغیوں جیسی بن
جاتی ہیں کیونکہ ان اب کو لگتا ہے کہ ایک نوالہ.....
ذرا سی چینیٹک سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

پھر وہ پوری اس کی طرف گھومی اور اس
مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”لیکن فرق پڑتا ہے۔ روز کے چھوٹے
چھوٹے جھوٹ اور چھوٹی چھوٹی خیانتیں جمع ہو کر
بہت بڑا ڈھیر لگا دیتی ہیں اور ان سے جان چھڑانا اتنا
ہی مشکل ہوتا ہے جیسے بڑھا ہوا وزن کم کرنا۔ ان
دونوں کاموں کے لیے بہت سادہ اور پرہیز کرنا ہوتا
ہے۔ پلیٹ میں پیش کی گئی نعمتوں کو دیکھ کے بھی انکار
میں سر ہلانا پڑتا ہے۔“

”آپ نے فیصلہ کر لیا ہے؟“
”ہاں..... میری کار میں کھدائی کا سامان پڑا
ہے۔ میرے ساتھ ملا کہ چلو۔ ہم اپنا خزانہ کھود کے
نکالیں گے اور پھر ہم فوراً ڈسٹرکٹ آفیسر کو خبر دیں
گے۔ ہم اسے پوری ایمانداری سے سرکار کے حوالے
کر دیں گے۔“

ایڈم نے اسے پتلیاں سکڑ کے مشکوک نظروں
سے اسے دیکھا۔ ”میں کیسے یقین کروں کہ آپ خزانہ
دیکھتے ہی کدال میرے سر پہ نہیں دے ماریں گی؟ اور
کھودے ہوئے گڑھے میں میری لاش دفن کر کے
سارے ثبوت نہیں مٹا دیں گی؟“

”ہاں اور جب ہم سرکار سے خزانے کی ذیل کریں گے تو ان سے عہد لیں گے کہ انعام خزانے کا پرسنٹ اتج ہونا چاہیے۔ کروڑوں کے خزانے کا معمولی حصہ بھی بہت ہی ہوگا۔ حکومت بہت آرام سے چند نوادرات ہمیں دے دے گی جس کو میں بھولہ پردوشن کے بعد کروڑوں میں بیچوں گی۔ ہاں ہم اس رقم سے بہت امیر نہیں ہو جائیں گے مگر ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اتنی رقم کافی ہے اور پھر میرے پاس ملاکہ سے لایا گیا قیمتی زیور بھی ہے اور وان فاتح مجھے لی این میں اعلیٰ پائے کی جاب بھی دلوا دیں گے۔ یہ بھی کم نہیں ہے۔“

”اور میں سمجھا چے تالیہ اپنے سارے خواب بھلا کر درویشانہ زندگی گزارنے جا رہی ہیں مگر آپ نہیں بدلیں گی۔“ وہ مصنوعی حلقی سے بولا تو تالیہ نے کندھے اچکائے۔

”خوابوں پر شہزادی تالیہ کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی۔ گستاخ مورخ۔“ پھر اس کے دائیں ہاتھ کو دیکھا جسے ایڈم نے سرعت سے پیچھے کر لیا۔ ”میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں، آپ یہیں رکھیں۔“

وہ جیسے ہی اندر آیا ایبو پیچھے پیچھے چلتی آئیں۔ ”تم دونوں کسی خزانے کی بات کر رہے تھے ایڈم مجھے بتاؤ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ایڈم بن محمد کو زمین میں چھپے خزانے کا راز لے والا ہے، ماں۔ تایا کی دعا قبول ہونے والی ہے۔“ وہ الماری میں ہنگر زادہ کر کرتے ہوئے غلت میں ہٹانے لگا۔ چہرہ جوش سے تھمتار ہاتھا۔

چوکھٹ میں کھڑی ایبو نے گہری سانس لی۔ ”اور اس روز تم دنیا کے بادشاہوں سے زیادہ طاقتور بن جاؤ گے۔ یہ بات بھی اس خواب میں شامل تھی۔ ایڈم کے ہاتھ رکے۔ وہ ٹھٹکا۔ بے اعتبار کمبوڈوڈرین کی لاش اور وہ غار یاد آیا جو سونے سے بھرا تھا۔

(ایک خزانے کا راز اسے پہلے بھی ملا تھا مگر اس نے کسی مقام پہ خود کو بادشاہ سے زیادہ طاقتور تصور نہیں

تالیہ نے تھکی ہوئی سانس بھری۔ ”اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو تمہیں ساتھ کیوں لے کر جاتی؟ اسکے ہی سارا خزانہ نکال کے غائب ہو جاتی۔ تم نے پولیس کو نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔“

”واقعی مجھے ساتھ لے کر جا کیوں رہی ہیں آپ؟“

”تاکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ تالیہ بنت مراد اپنے باپ کی جیسی نہیں ہے۔ وہ اس خزانے کو نہیں لوٹے گی جو اس کے ملک کے لوگوں کی امانت ہے۔ اور میرے خواب کے مطابق ہم دونوں اکٹھا خزانہ نکالنے کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک خزانہ ہم نے پہلے بھی ایک ساتھ ڈھونڈا تھا۔ جیسے تم نے اس خزانے کی حفاظت کی تھی آج مجھے اس کی کرنے دو۔“

ایڈم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ماتھے کے ٹیل غائب ہو گئے۔ وہ پورے دل سے مسکرایا۔

”آپ واقعی بدلنا چاہتی ہیں؟“

”ہاں مجھے اچھائی کی طاقت پر اتنا بھروسہ تھا تو ہے ہی۔“ بیٹ والی لڑکی مسکراتی تھی۔ ایڈم کا دل خوشی سے بھر گیا۔

”لیکن آپ کے امیر ہونے کا خواب ادھر ادھر جائے گا۔“

تالیہ مراد نے بیٹ ترچھی کی اور معنی خیزی سے مسکرائی۔ ”کس نے کہا؟“

ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ”ایک منٹ..... آپ نے ابھی کہا کہ آپ خزانے کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔“

”ہرگز نہیں... میں نے یہ کہا کہ ہم ڈسٹرکٹ آفیسر کو اطلاع دیں گے اور خزانہ حکومت کے حوالے کردیں گے مگر یونوواٹ ایڈم۔ تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ تم بہت سیدھے ہو۔ میں نہیں ہوں۔ میں نے فریڈرک روڈ ایکٹ پڑھا ہے۔ اس کے مطابق حکومت کو خزانہ ڈھونڈنے والوں کو انعام بھی دینا ہوتا ہے۔“

”انعام؟“ ایڈم کا منہ کھل گیا۔

آسان ہو۔ اس کے سارے دوست نے ہیرے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ بہت قیمتی ہیں۔ وہ ٹاپس بلیو ڈائمنڈ کے تھے اور ڈیزائنرز جیولری معلوم ہوتے تھے یقیناً تالیہ کو اس کے کسی چاہنے والے نے دیے ہوں گے۔

”اپنی والدہ کے ڈائمنڈز کو میں اتونٹی میں جڑوانا چاہتا ہوں۔ دراصل میری شادی ہو رہی ہے گا وہ سکران کے بیٹا رہا تھا۔ ساتھ ہی جیب سے ایک باکس نکالا اور اسے کھولا۔ اس کے اندر وہ دونوں ہیرے ایک سونے کے لاکٹ کے ساتھ پڑے دکھائی دیتے تھے۔ لاکٹ پرانا تھا اور ایسا لگتا تھا اندر سے ہیرے اتارے گئے ہیں۔

”میں نے ایک جیولر سے ان کو اتر وایا مگر اس نے اتونٹی کے جو ڈیزائن دکھائے وہ مجھے پسند نہیں آئے۔ میں اسے آپ کے پاس لے آیا۔“

”شیدر سر۔۔۔ آپ کے ذہن میں کوئی ڈیزائن ہے؟“

اس نے فوراً باکس قریب کیا اور فوٹو میز سے ایک ہیرا اٹھا کے دیکھا۔ اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

”میں یہ ڈیزائن چاہ رہا تھا۔ میری مہلتیتر کو یہ پسند ہے مگر سر براہزد دینا ہے تو اس لیے۔“ وہ موبائل پر ایک ڈیزائن دکھانے لگا۔

”آپ کے پاس رسید ہے نا اس کی؟ دراصل سسٹم ایسا ہے کہ۔۔۔“ فیچر وضاحت دینے لگا۔ بظاہر شک کرنے کی بجائے جنتی تھی مگر وہ مجبور تھا۔

”آف کورس ہے۔“ اس نے جیب سے فوراً کانڈیکٹل کے دکھائے۔ ”والدہ نے قریباً پانچ برس پہلے یہ لاکٹ بنوایا تھا۔ ان کی دقات کے بعد سے ایسی ہی پڑا ہے۔“ اب دورنی رٹائی کہانی سنار ہاتھا۔

”بہت قیمتی ہیرا ہے یہ۔“ فیچر مٹا کر کنکھروں سے ہیرے کھالت پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے احتیاط سے دونوں ہیروں کو فون میں ڈالا۔

”میں ان کو چیک کر لوں۔ پھر بتاتا ہوں کہ کیا

کرنا ہے۔“ خوش اخلاقی سے کہتا فیچر ہیروں کو پہلے شوکیس کے سرے تک آیا جہاں نیچے چند مٹینیں رہی تھیں۔ اس نے مائیکرو اسکوپ کی طرح کی مٹین میں ایک ہیرا رکھا اور آنکھ مقررہ جگہ پر لگا کر اسے ہر کھتے لگا۔

اسٹور کے قیمتی ہیروں اور سونے کی ہمک سمج کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اسے سی کے ٹھکانے اور خنک ماحول میں وہ خود کو بہت آرام دہ محسوس کر رہا تھا جب مینجر واپس اس تک آیا۔

”آپ کے ہیرے بالکل اصلی ہیں۔ اچھا اب میں آپ کو چند فریش ڈیزائن دکھا دیتا ہوں جو آپ کی خوش قسمت وائف کو بہت پسند آئیں گے۔“

فیچر خوش دلی سے چند کمیز نکال لایا۔ پھر ایک ایک اتونٹی نکال کے دکھائی۔ اپنی چرب زبانی سے وہ ہر اتونٹی کے ڈیزائن کی شان میں غلابے مار رہا تھا۔

سمج کچھ دیر ان کو دیکھتا رہا۔ یوں ظاہر کیا جیسے اسے ڈیزائن پسند نہ آ رہے ہوں۔

”شاید ہیرے بہت بڑے ہیں۔ ان کو بچ کے میں چھوٹے ہیرے خرید کے اگر انہیں یوں بنوایں تو۔۔۔“ وہ ایک ڈیزائن پر انگلی رکھ کے بولا تو جیولر گہری سانس لیتے ہوئے پیچھے ہوا۔

”نو پھٹس جناب۔“ مجھے آپ کے چوری کے ہیرے نہیں خریدنے۔“ جیولر کا لہجہ ایک دم روکھا ہوئے سمج نے چونک کے اسے دیکھا جو سمج کے پیچھے کی دیکھ رہا تھا۔

سمج ایک دم گھوما۔ کرسی بھی ساتھ ہی گھومی۔ دکان کے دروازے سے تین پولیس آفیسر داخل ہو رہے تھے۔

”ایک منٹ۔ میرے ہیرے چوری کے نہیں ہیں۔“ اس نے بوکھلا کر فیچر کو پکارا۔ ”آپ نے پولیس کیوں بلائی ہے؟“

”کہانی اچھی گھڑی آپ نے جناب۔“ جیولر رکھائی سے کہتا اٹھا اور اسے کمیز پہنے لگا۔ پولیس والے اس کے گرد گھیرائے گھڑے ہوئے۔

پوچھ رہے تھے جتنے ان پریشان ہو گیا تھا۔

”اور میں آپ کی کہانی میں آجھی گیا تھا لیکن میں نے ہیرا دل کو چپ کر لیا۔ جس مناسبت آپ نے چلی رسیدیں بنوائی ہیں، اس کے پاس۔ یہ دانی تحقیق نہیں ہوئی ورنہ تھوڑے دنوں میں ہیرا دل کو ہیرا دل کی کٹی ہے جس میں ان کا سر نیچا ہیرا سر لکھا ہے۔ یہ آپ کی واحد کٹے نہیں ہیں جناب۔ یہ ہیرے Joyalukkas کے ہٹس سے ہمارے گھے ہیں اور یہ ایک مال پہلے ایک سنگ پورین قانون کے پاس سے چوری کیے گئے تھے اور ان کا حقیقت نمبر پولیس نے تمام ڈائمنڈ ڈیلرز کو بھیج رکھا تھا۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ ڈیزائنر جیولری جب بھی چوری ہوتی ہے، اس کے مالکان اس کا لیڈر اسکر ہینڈ نمبر پولیس کو دے دیتے ہیں۔“ وہ ٹھک ٹھک انٹرویو کے ڈیو کے ڈھکن بند کر رہا تھا اور سچے کے قدموں سے زمین سرک رہی تھی۔

”یہ میں نے نہیں چرائے۔ مجھے میری بیوی نے دیے تھے۔“

”یہ ہیرے صرف چوری شدہ نہیں ہیں مسٹر۔“ افسر نے اس کے ہاتھ پیچھے لے جا کر ہتھکڑی لگاتے کہا۔ ”یہ ہیرے ایک ٹل کے کیس سے چرائے گئے تھے۔ اب تم تھانے چل کے ہمیں یہ بتاؤ گے کہ اس ٹل سے تمہارا کیاعلق ہے؟“

”اف!“ سچ نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

وہ اسے جان بوجھ کے ہاتھ روزنک لائی تھی کیونکہ وہاں کیمرے نہیں لگے تھے۔ اس نے جان بوجھ کے اس وقت صرف موٹے موٹے ٹاپس پہن رکھے تھے تاکہ وہ ان کے لالچ میں آجائے۔ اس کا وہ ڈرنا وہ غصہ کرنا وہ سب۔ سب اداکاری تھا۔ اس نے اسے بہت برا پھنسا تھا۔

اف! اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

ملا کہ شہر میں سن باؤ کا گھر ویسا ہی تھا جیسا وہ ہفتہ بھر پہلے رات کو چھوڑ کے گئے تھے۔ وہی سرخ

تھوڑی سی سیٹی کتوال۔ سیٹی تھوڑی سی سیٹی اور سیٹی لال انٹرویو والا تھیں۔ مجھے بھی ایسے قیاسی سے سر ہٹانے کے کھڑا تھا۔ اس کی پچھلی آنکھیں سنجیدگی سے مراٹے والی دیوار کے پورے تھیں۔

اس حالت ان کو کھانی کرتے کٹی گھٹنے پر تھے تھے مجھے کے قریب۔ انہیں آہٹیں پڑتی تھیں اور گہری جگہ کھٹتی تھیں۔ شام ہو چکی تھی اور وہ دیووں مٹی سے لائے پتروں کے ساتھ دستے جڑے تھے، بال پلاسٹک کیپ سر ڈھانکے، کدالیں پتھر سے منہ ہونے سے لگے تھے۔

”جب تک ہمیں یہ جگہ عہد ملتا چاہیے تھی۔“ ایڈم سانس لینے کو رکھا تو شکایتی انداز میں بولا۔ اس کا چہرہ مٹی سے لٹکا ہوا کپڑے کی میسے ہوئے تھے۔

تالیہ نے کدال کا پھل زمین میں بگاڑا اور اس پر دونوں ہاتھ جھاکے ذرا اوپر کو سستانے لگی۔

”اچھا! اسے کام کرنا تھا۔ ورنہ سارے بازار کو اٹھا دیتی جاتی کہ یہاں کھانی ہو رہی ہے۔“

”آؤ اس جواب بھی مٹی بول گئی۔“

”اسی لیے آتے وقت اس پاس بٹا دیا تھا کہ جی کرائے دار ہوں اور گھر کی رتی ماڈلنگ کروا رہی ہوں۔ بے فکر رہو۔ کوئی شک نہیں کرے گا۔“ اس نے پھر سے کدال اٹھائی اور زمین کھودنے لگی۔

چھ سو سال نے اس جگہ کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ مجسمہ ویسا نہ تھا جیسا اس نے بنایا تھا۔ جگہ جگہ سے وہ ٹوٹ ہوا لٹکا تھا گویا بعد میں مرمت کی گئی ہو۔ مٹی بھی کٹی دفعہ بنایا گیا تھا مگر زمین پرانی تھی۔

جیسے آسمان پرانا تھا۔ جیسے ملا کہ کا بوڑھا سمندر پرانا تھا۔

بس ہوا میں cesium کی ملاوٹ تھی۔

کدال کی ہر ضرب کے ساتھ مٹی نکلتی جا رہی تھی اور وہ اپنے مطلوبہ صندوق کے قریب پہنچتے جا رہے تھے۔ مٹی پہ نظریں جمائے، کدال اس میں مارتے،

اس کے ذہن کے پردے پر ایک سرمئی شام اترنے لگی۔

ہاتھ لگائی کے ساتھ ساتھ ہاتھ لگائی

[illegible]

”اے سال میں نے اس لئے کوئی ٹکٹ نہیں جانتا تھا کہ یہ وقت میں پیچھے جا کے تم نے خریدا تھا۔“ آواز یہودیوں تک کے گئی۔

قانع اور پرانے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔
تالیہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔
”تو آگیا!“

”شمن ادا کی!“ قاتح نے سر کو خم دیا۔ ادب سے یہاں بھی پہلا قدم نہ ہی تھا۔

جگہ جگہ ٹوٹ چوٹ — خیر آتی ہے۔ مجھے یاد ہے

ہمارے وقت میں سفر والے روز عصر کے بعد جو کرتے
 یہ میں وہاں بھی تو دیکھا تھا۔

ورثے کی حفاظت کے شوقین لوگ اس کی مرمت

نوک پلک سنواری تھی۔ "وہ زینے اترتے ہوئے
 نچے آتا تو ساتھ ساتھ اڑتا جا رہا تھا۔ وہ گھر سے

سفر کیا تو ساتھ ہی بوسا جا رہا تھا۔ دو بارے سفر
 التحضرے ہاتھ لیے اس کو دیکھے مئی۔
 سفید چھوٹے کرتے اور باجائے میں دو صاف

رحمت والا اونچا لمبا غلام مسکراتے ہوئے قریب آ رہا تھا۔ ملائشامس وہ ایک اسٹار سیلیبرٹی بنی تھا اور میاں و

ایک غلام۔
مگر مرد دُشوں جگہوں پہ دو 'اس' کا تھا۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ وہ اس کے بالکل سامنے آ رہا۔ مسکراتے ہوئے غور سے اس کی آنکھوں کو

خواتین و ملجس

[illegible]

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰
 ۲۰۱
 ۲۰۲
 ۲۰۳
 ۲۰۴
 ۲۰۵
 ۲۰۶
 ۲۰۷
 ۲۰۸
 ۲۰۹
 ۲۱۰
 ۲۱۱
 ۲۱۲
 ۲۱۳
 ۲۱۴
 ۲۱۵
 ۲۱۶
 ۲۱۷
 ۲۱۸
 ۲۱۹
 ۲۲۰
 ۲۲۱
 ۲۲۲
 ۲۲۳
 ۲۲۴
 ۲۲۵
 ۲۲۶
 ۲۲۷
 ۲۲۸
 ۲۲۹
 ۲۳۰
 ۲۳۱
 ۲۳۲
 ۲۳۳
 ۲۳۴
 ۲۳۵
 ۲۳۶
 ۲۳۷
 ۲۳۸
 ۲۳۹
 ۲۴۰
 ۲۴۱
 ۲۴۲
 ۲۴۳
 ۲۴۴
 ۲۴۵
 ۲۴۶
 ۲۴۷
 ۲۴۸
 ۲۴۹
 ۲۵۰
 ۲۵۱
 ۲۵۲
 ۲۵۳
 ۲۵۴
 ۲۵۵
 ۲۵۶
 ۲۵۷
 ۲۵۸
 ۲۵۹
 ۲۶۰
 ۲۶۱
 ۲۶۲
 ۲۶۳
 ۲۶۴
 ۲۶۵
 ۲۶۶
 ۲۶۷
 ۲۶۸
 ۲۶۹
 ۲۷۰
 ۲۷۱
 ۲۷۲
 ۲۷۳
 ۲۷۴
 ۲۷۵
 ۲۷۶
 ۲۷۷
 ۲۷۸
 ۲۷۹
 ۲۸۰
 ۲۸۱
 ۲۸۲
 ۲۸۳
 ۲۸۴
 ۲۸۵
 ۲۸۶
 ۲۸۷
 ۲۸۸
 ۲۸۹
 ۲۹۰
 ۲۹۱
 ۲۹۲
 ۲۹۳
 ۲۹۴
 ۲۹۵
 ۲۹۶
 ۲۹۷
 ۲۹۸
 ۲۹۹
 ۳۰۰
 ۳۰۱
 ۳۰۲
 ۳۰۳
 ۳۰۴
 ۳۰۵
 ۳۰۶
 ۳۰۷
 ۳۰۸
 ۳۰۹
 ۳۱۰
 ۳۱۱
 ۳۱۲
 ۳۱۳
 ۳۱۴
 ۳۱۵
 ۳۱۶
 ۳۱۷
 ۳۱۸
 ۳۱۹
 ۳۲۰
 ۳۲۱
 ۳۲۲
 ۳۲۳
 ۳۲۴
 ۳۲۵
 ۳۲۶
 ۳۲۷
 ۳۲۸
 ۳۲۹
 ۳۳۰
 ۳۳۱
 ۳۳۲
 ۳۳۳
 ۳۳۴
 ۳۳۵
 ۳۳۶
 ۳۳۷
 ۳۳۸
 ۳۳۹
 ۳۴۰
 ۳۴۱
 ۳۴۲
 ۳۴۳
 ۳۴۴
 ۳۴۵
 ۳۴۶
 ۳۴۷
 ۳۴۸
 ۳۴۹
 ۳۵۰
 ۳۵۱
 ۳۵۲
 ۳۵۳
 ۳۵۴
 ۳۵۵
 ۳۵۶
 ۳۵۷
 ۳۵۸
 ۳۵۹
 ۳۶۰
 ۳۶۱
 ۳۶۲
 ۳۶۳
 ۳۶۴
 ۳۶۵
 ۳۶۶
 ۳۶۷
 ۳۶۸
 ۳۶۹
 ۳۷۰
 ۳۷۱
 ۳۷۲
 ۳۷۳
 ۳۷۴
 ۳۷۵
 ۳۷۶
 ۳۷۷
 ۳۷۸
 ۳۷۹
 ۳۸۰
 ۳۸۱
 ۳۸۲
 ۳۸۳
 ۳۸۴
 ۳۸۵
 ۳۸۶
 ۳۸۷
 ۳۸۸
 ۳۸۹
 ۳۹۰
 ۳۹۱
 ۳۹۲
 ۳۹۳
 ۳۹۴
 ۳۹۵
 ۳۹۶
 ۳۹۷
 ۳۹۸
 ۳۹۹
 ۴۰۰
 ۴۰۱
 ۴۰۲
 ۴۰۳
 ۴۰۴
 ۴۰۵
 ۴۰۶
 ۴۰۷
 ۴۰۸
 ۴۰۹
 ۴۱۰
 ۴۱۱
 ۴۱۲
 ۴۱۳
 ۴۱۴
 ۴۱۵
 ۴۱۶
 ۴۱۷
 ۴۱۸
 ۴۱۹
 ۴۲۰
 ۴۲۱
 ۴۲۲
 ۴۲۳
 ۴۲۴
 ۴۲۵
 ۴۲۶
 ۴۲۷
 ۴۲۸
 ۴۲۹
 ۴۳۰
 ۴۳۱
 ۴۳۲
 ۴۳۳
 ۴۳۴
 ۴۳۵
 ۴۳۶
 ۴۳۷
 ۴۳۸
 ۴۳۹
 ۴۴۰
 ۴۴۱
 ۴۴۲
 ۴۴۳
 ۴۴۴
 ۴۴۵
 ۴۴۶
 ۴۴۷
 ۴۴۸
 ۴۴۹
 ۴۵۰
 ۴۵۱
 ۴۵۲
 ۴۵۳
 ۴۵۴
 ۴۵۵
 ۴۵۶
 ۴۵۷
 ۴۵۸
 ۴۵۹
 ۴۶۰
 ۴۶۱
 ۴۶۲
 ۴۶۳
 ۴۶۴
 ۴۶۵
 ۴۶۶
 ۴۶۷
 ۴۶۸
 ۴۶۹
 ۴۷۰
 ۴۷۱

میں نے ان کو دیکھا تھا۔ وہ ایک بڑی بڑی عورت تھیں۔
وہ ایک بڑی بڑی عورت تھیں۔ وہ ایک بڑی بڑی عورت تھیں۔

[illegible]

پسے کا بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔

کے لئے شکر ہے۔

میں چاہتی تھی کہ مجھے آزاد کر دے۔
مجھ پر ایسے قمار ہیں کہ اقل میں آپ مجھے

میں نے اس کی طرف سے ایک خط بھیج دیا تھا۔ مگر اب اس نے جواب نہیں دیا۔

سفر ایک رات کو کیا ہے۔ مس چاہتی ہوں آپ مجھے
 نہ بھولیں۔

”میں نہیں سیوے بھلا سزا میں کیا بدلتی ہوگی۔
 میرا بیوہ ہے۔ جسم نے اس سے کچھ ملے۔ باقی میرا
 کھنکھنے کے لئے ہے۔“

میرا آب نے کہا تھا کہ میرا آب کے ساتھ رہو اور میرا آب کے ساتھ رہو۔

”سواری مگر وہاں قاصح کو کسی کی ضرورت ہے اور مجھے آپ کی۔“

نہیں رہی۔ ”اس نے شانے اچکا دیے۔ دھڑک دھڑک سے گزرو کے آگے آیا اور قریب سے مجھ سے دیکھنے لگا۔

212 نومبر 2018

جیسے پلٹ کے اسے دیکھا۔

”اور اگر مجھے آپ کے قریب رہنا ہو تو میں کیا کروں؟“

”سرمئی شام ابھی تک روشن تھی اور سن باؤ کا گھر خاموش تھا۔ ایسے میں آدھے بنے جسے کے ساتھ وہ دونوں یوں کھڑے تھے کہ قہر جیسے کود کھڑا تھا اور وہ اسے۔“

”تم کئی دفعہ کہہ چکی ہو کہ تم یہاں سے دور چلی جاؤ گی۔ امریکہ وغیرہ۔“

”چلی تو میں جاؤں گی۔ اپنی کچھ چیزیں لے کر۔“ اس نے نظریں جھکا کے جسے کے قدموں کو دیکھا جہاں زمین برابر تھی مگر منوں مٹی تھے اس کا خزانہ چھپا تھا۔ ”لیکن اگر بھی ارادہ بدل دوں اور آپ کے ساتھ رہنا چاہوں تو کیسے رہوں؟“

وہ آہستہ سے اس کی طرف گھوما۔ ایسے کہ چتلیاں سیٹھریں اس کی بات پہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

”میرے آفس میں جا کر لیٹا۔“

”مگر آپ کو تو میری ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”ہاں وہ تو نہیں ہے، لیکن میری زندگی تالیہ، صرف کام کے گرد گھومتی ہے۔ اگر کہیں میرے قریب رہتا ہے تو تمہیں میرے آفس میں جا کر بیٹھنے کی اجازت ہے۔“

”آپ کے آفس میں مجھے کون سی جا بٹل سکتی ہے؟“ پھر پھر کے بولی۔ ”آپ کے آفس میں کون سی جا بٹل سکتی ہے اور کون سی ادنیٰ ترین؟“

”ادنیٰ ترین تو ممبرز پارلیمنٹ ہوتے ہیں۔“

”وہ تو میں بن نہیں سکتی۔ ادنیٰ ترین کون ہوتے ہیں؟“

”سب سے ادنیٰ اور معمولی جا بٹل سیکرٹری درکار کی ہوتی ہے مگر نہیں، وہ آفس کے باہر ہوتے ہیں۔ پھر وہ گمیا لفٹ والا آدمی۔ انہوں۔ وہ بھی ہمارے فلوور پہ نہیں ہوتا۔“ وہ ٹھوڑی کھباتے ہوئے

سوچنے لگا۔ ”ہاں۔ سب سے کم فلوور والا سیکرٹری ہوتا ہے یا باڈی مین ہی ہوتے ہیں۔ اور سب سے اعلیٰ جا بٹل پارلیمنٹ ہونے کی ہوتی ہے۔ یہاں تو سب سے اعلیٰ اور داہنی کی وجہ سے وہاں تعینات ہوتے ہیں۔ لیکن سوشل سینیٹ یا نیم کا منیجر سے تو میں۔ سینیٹ یا سوشل سینیٹ کا بیڈ، مگر اصل یہ لوگ کٹ مکتے ہوتے ہیں۔“

”تو سب سے اعلیٰ جا بٹل مکتے کی ہوتی ہے۔“ اس کی آنکھیں چمکیں۔

”بالکل۔“ پھر اس نے دیکھ کے مسکرایا۔ ”میرے اہم سے وعدہ ہے۔ تم جب بھی مجھ سے جا بٹل مانتے آؤ گی، میں تمہیں اپنا کٹ مکتے ہوں۔“ اس عہد سے کچھ عرصہ تک وہ بھی ہوا۔ کٹ مکتے کا عہد وہی ہو گیا۔

”اور اگر شہرت اور طاقت کی چکا چوند میں آپ اپنا وعدہ بھول گئے تو؟“ اسے دہرا رہا ہوا۔

”بھول بھی گیا تو تم اتنی قابل ہو کہ کسی بھی سیاسی جماعت میں بہت جلد میرٹ اور محنت سے کٹ مکتے میں جاؤ۔“ پھر وہ پھر۔ ”لیکن یہاں کٹ مکتے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔“ اس عہد کے تالیہ کے اہل و عیال سے اس نے کہا۔

”راہبہ نہیں کون؟“

”روٹی بادشاہ کوئیس کا سلطان سرتو۔ ویسے تو وہ کوئیس کے بیٹے اور بیٹی الیگزینڈرا کا صاحب گھر ہے۔“ لیکن بادشاہ کا اصل نام راز اور شیر بھی تھا۔ بادشاہ ہر فیصلہ اپنے اسی روحانی مشوا سے پوچھ کے کرتا تھا۔ الیگزینڈرا اور راہبہ نہیں، ان دونوں کے غلط مشوروں سے کوئیس کو نقصان پہنچا تھا۔ دونوں سے عوام شدید نفرت کرتے تھے۔ آخر میں راہبہ نہیں کو ایک دوسرے شہزادے نے دعوت کے پرانے گھر بلا کے قتل کر دیا تھا۔“

الفاظ کی سنجائی نے سرخ محن کو اداس کر دیا۔

”عوام سلطان سازوں سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟“

”کیونکہ وہ اپنے لیڈر کو اپنے علاوہ کسی کی خواہش پہ چلنا نہیں دیکھ سکتے۔ آزاد لیڈر کسی سلطان

ایلم اور وہ خزانے کے قریب پہنچے تھے۔
اس کا فون بیج رہا تھا۔ تالیہ نے کدال رکنی اور فون
جیب سے نکالا۔ دوستانہ اشارے ہوئے پیغام دیکھا۔
پھر مسکرا دی اور فون واپس رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" ایلم نے زمین کھودتے ہوئے
تشویش سے سہاٹا۔

"میرا ایس۔۔۔۔۔ سچ۔۔۔۔۔ میرے بچے پا
تھا۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ اسے پولیس پکڑ کے
لے گئی ہے۔"

"اور آپ تو اتنی معصوم ہیں کہ اس میں آپ کا
ہاتھ ہی نہیں ہوگا۔"

"ہاتھ نہیں، دماغ ہے۔ دماغ۔" مسکراتے
ہوئے دوستانہ چہ چاہتے اس نے واپس کدال اٹھالی۔

"میرا اور داتن کا ایک چودہ دوست ہے آصف۔
اس نے مجھے ایسی ڈیزائنز چوری کی بندوبست کر کے
دیا جو قتل کے کیس سے تعلق رکھتی تھی اور بیچنے والے
نے کوڑیوں کے مول بیچ کے جان چھڑائی تھی۔ سچ
نے وہ ہیرے مجھ سے لیے اور انہیں بیچنے کی کوشش
کرتے پکڑا گیا۔ پوچھو کیسے؟"

"ان ہیروں سے بھینا laser
inscription کی گئی ہو گی جو کہ سر ٹیٹا نڈ
ڈائمنڈز پہ ہوتی ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ تمہیں کیسے پتا؟"

"کیونکہ میں کتابیں پڑھتا ہوں۔" اس نے
زور سے کدال کی ضرب لگائی۔ بالآخر لوہے کے
صندوق کا کنارہ نظر آ رہا تھا۔

"یا اللہ!" وہ دونوں گڑھے میں اترے اور
تیزی سے مٹی ہٹانے لگے۔ کیڑے، بودوں کی
جزیرے، پتھر اور یہ تاریں۔۔۔۔۔ جگہ جگہ سے نکلتی تاریں
بہت رکاوٹ ڈال رہی تھیں مگر جلد ہی وہ مٹی کم کرتے
گئے، یہاں تک کہ صندوق کی اوپری سطح واضح ہوئی۔
لوہا یوں لگتا تھا جیسے گل گیا ہو۔ زنگ آلود۔۔۔۔۔ بوسیدہ
لوہا۔۔۔۔۔ جس کے درمیان۔۔۔۔۔ بڑا سا ڈکاف تھا اور
مٹی بھری تھی۔

ساد، کسی مشین کی خواہش پہ چلتا بھی نہیں ہے۔ وہ
اصولوں پہ چلتا ہے اور صرف درست مشورہ قبول کرتا
ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ محام بھی اپنے لیے رکھ
تھوڑا وارنٹس ٹھہراتے۔ وہ راسخ نہیں ہیں۔ سلطان
سازوں اور ایکزیگزٹو راجہ کی طاقت اندیشہ بیویوں
سے نفرت کرتے ہیں۔ لیزر آخر تک ہیرے درہتا ہے۔"
وہ دونوں جیسے کے ساتھ صحن میں گھڑے دیکھی
آواز میں بات کر رہے تھے۔

"اور آخر میں سارے طاقتور سلطان سارا قتل
کیوں ہو جاتے ہیں؟"

"کیونکہ اگر وہ بادشاہ کے ساتھ وفادار نہ رہیں
تو بادشاہ کو مار کے تخت پہ قبضہ کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر
وفادار رہیں تو بادشاہ کا ان سے اعتبار کوئی نہیں ہوتا
سکتا۔ کوئی سازش، کوئی چال ان کا مقام نہیں کھٹا سکتی تو
ماسد رقیب ان کی جان لے لیتے ہیں۔ سلطان ساز
بننا آسان نہیں ہے۔ اور کو کہ میں تمہیں جواب دینے کا
وعدہ کرتا ہوں، لیکن میں دل سے کبھی نہیں چاہوں گا
کہ تم میرے آفس میں میرے ساتھ اس طرح کام
کرو۔"

"کیوں؟" وہ چوکی۔

"کیونکہ۔۔۔۔۔ وہ چند قدم آگے بڑھ آیا اور مال
اس کی آنکھوں میں دیکھا۔" یہ ایسی دلدل ہے
جس میں کچھ ہی کچھ ہے۔ یہ تمہیں اپنے اندر دھنسا
لے گی۔ اور اگر دھنسانہ سکی تو لباس داغ دار ضرور کر
دے گی۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ صرف میرے
ساتھ رہنے کے لیے تم اس دلدل میں قدم رکھو۔"

وہ فکر مند لگتا تھا۔ تالیہ مسکرا دی۔

"جیسے آپ کو میری ضرورت نہیں، ویسے ہی
مجھے بھی آپ کی ضرورت نہیں۔ میں تو آپ کا امتحان
لے رہی تھی۔" پھر شہزادی نے گھمنڈی انداز میں سر
جھکا اور بے نیازی سے واپس کارے کی طرف پلٹ
گئی۔

فون کی گھنٹی نے اسے ہٹا دیا تو وہ سال میں
واپس آئی۔

تالیہ کا ہاتھ اٹھکا۔ یہ شکاف کیوں ہے؟
 مگر نہیں۔۔۔ اس نے سارے واہموں کو ذہن
 سے جھٹکا اور ہتھیلیوں سے مٹی ہٹانے لگی۔۔۔ ان
 دونوں کی زبانیں ساکت تھیں اور ہاتھ تیز تیز کام کر
 رہے تھے۔

یہاں تک کہ صندوق کی ساری مٹی انہوں نے
 باہر نکال دی۔۔۔۔۔

اور۔۔۔ دو صندوق خالی تھا۔ خزانہ وہاں نہیں تھا۔
 تالیہ کا مٹی سے اٹا چہرہ ساکت ہو گیا۔ ایڈم بھی
 شل رہ گیا۔

دو ٹخن اٹا پکا اور قدیم تھا کہ یوں لگتا تھا، برسوں
 سے کسی نے ایک اینٹ بھی نہیں ہلائی تھی۔ مجسمہ بھی
 اپنی جگہ پہ موجود تھا۔ تو پھر خزانہ کہاں گیا؟

صندوق اٹا مضبوطی سے فٹ کیا گیا تھا کہ
 خزانہ نکالنے والے نے اس کو دیے ہی چھوڑ دیا اور
 صرف اس کے ڈھکن میں شکاف کر کے ساری
 چیزیں نکال لی تھیں۔ مگر کس نے اور کب؟
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔ جے تالیہ یہ ناممکن ہے!“

اب حالت یہ تھی کہ خن کے درمیان میں گڑھا
 کھدا ہوا تھا اور اس کے دبانے پہ وہ دونوں مٹی مٹی
 ہوئے پھر لٹکائے بیٹھے تھے۔
 ”ہمارا خزانہ کہاں گیا ایڈم؟“ وہ سرگوشی میں
 بولی۔ ششدر نظریں ٹوٹے ہوئے صندوق پہ جمی تھیں۔
 ”کسی نے ہم سے پہلے خزانہ نکال لیا ہے۔ مگر
 کس نے؟“

”نوب، ہمیں حکومت کا انعام نہیں ملے گا۔“
 ”اور میری شادی کے پیسے بھی اکٹھے نہیں ہو
 پائیں گے۔“

”یعنی ہم وہیں پہ آگئے ہیں جہاں سے شروع
 ہوئے تھے۔ ہمارا خزانہ چوری ہو گیا ہے۔“ وہ کھوٹی
 کھوٹی سی بولی۔ ”اور ہم پھر خالی ہاتھ ہیں۔“

وہ دونوں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ شل۔
 ماؤف دماغ لپے۔ سب کچھ جیسے تم ہو گیا تھا۔
 ”ہم نے کیوں سوچ لیا تھا ہے تالیہ کہ چھ سو سال

گزرنے کے بعد بھی خزانہ اپنی جگہ پہ موجود ہوگا۔“
 وہ ابھی تک بنا پلٹیں جھکے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔
 ”پانچ سو ستاون سال ایڈم۔“
 اور ان دونوں میں سے کوئی نہ ہنسا۔ وہ چپ
 چاپ گم صم سے بیٹھے رہے۔

من باؤ وانگ لی کا مجسمہ اپنی پتھر لی آنکھوں
 میں صدیوں پرانے راز چھپائے خاموشی سے دور افق
 کو دیکھتا رہا۔

صرف وہی جانتا تھا کہ خزانہ کس نے نکالا تھا۔
 مگر بند لہار کی بیٹی نے اس کا پتھر چلا چہرہ
 بناتے وقت اندر زبان۔ نہیں رکھی تھی جس کو بلا کے
 وہ انہیں حقیقت بتا سکتا۔

اس کی صرف آنکھیں تھیں جن میں سارے سداوت
 پتھر ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

سوموار کی صبح کے ایل کے دفتروں میں کام
 شروع ہو چکا تھا۔ منڈے مارنٹ کسی کو پسند نہیں
 تھی مگر بھائیوں روکتے اتوار کے۔ بیٹا سون کو
 بھلانے کی سعی کرتے ملازم کام میں لگے تھے۔ پترا
 ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے اس قدر پہ بار۔ سن سینٹر کا پتھر بھی
 معمول کی مصروفیات کا شکار دکھائی دیتا تھا۔

وان قاح کے آفس کے سامنے بے چھوٹے
 سے سٹک ایریا میں تالیہ مراد پتھی نظر آتی تھی۔ بالوں
 کا جوڑا بٹائے، وہ بجوری اسکرٹ بلاؤز پہ سفید کوسٹ
 پہنے کوئی ایگزیکٹو لگ رہی تھی۔

وہ ابھی ابھی آکے تیجی تھی اور اسے دیکھتے ہی
 قاح کا سیکرٹری عمن فوراً ہڑا آیا تھا۔

”ہیم آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ میں قاح
 صاحب سے آپ کے آپائنٹمنٹ لیٹر کا پوچھ کے آ رہی
 ہوں۔“ وہ شائستگی سے بولا تو تالیہ نے سب سے تیزی
 سے گردن ہٹا دی اور ابھر ابھر دیکھنے لگی۔

عمن چلا گیا تو اس کا فون بجلا۔ اس نے سر ہانکی
 نکال کے اسکرین روشن کیا۔

”میں نے ساری جگہ کھود کے دیکھ لی کہ شاید

فری اور ان کے ہلنے لب....
 سڑک کنارے اخبار کھولے بیٹھے ممبر لوگ....
 خواب روز روشن کی طرح واضح تھا۔
 ایسے میں وہ سڑک عبور کرتی ہے
 اور اندر ایک گلی کی طرف مڑ جاتی ہے۔
 پھر تین سوڑ مزید مڑتی ہے....
 گلی آگے جا کے تنگ ہونے لگتی ہے....
 اس کی دیواریں نیلی اینٹوں کی بنی ہیں....
 وہ قدم بڑھاتے ہوئے اینٹوں پہ ہاتھ پھیر
 رہی ہے....

”دروازہ کھلتے ہی یہ ہر گزرتے پل بھاری
 ہوتی جائے گی یہاں تک کہ تم اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکو
 گے۔ اور آخر کار تم اس کو گردن سے فوج پھینکو گے۔“
 ”تقریباً کتنی دیر بعد؟“ اس نے دہرایا۔ ”کتنا
 وقت ہوگا میرے پاس؟“

”تقریباً ایک پوری رات۔ اس سے زیادہ
 نہیں۔ کیوں؟ تم اس ایک رات میں کیا کرنا چاہتے
 ہو؟“ مراد نے غور سے اسے دیکھا۔

”ایک رات تو بہت طویل عرصہ ہے راجہ۔
 یہاں تو ایک لمحے میں دنیا بدل جاتی ہے۔ زمانہ پلٹ
 جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا تم مجھے نہیں جانتے۔ اور۔“
 نرسی دھکیل کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تاثرات
 پتھر جیسے بھرے تھے۔

”اور مجھے معلوم ہے کہ میں یہ کیوں کر رہا
 ہوں۔“
 ”کیوں کر رہے ہو؟“ مراد راجہ نے گردن اٹھا
 کے استہزاء سے اسے دیکھا۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہر جادو کا توڑ ہوتا
 ہے۔ یادداشت کا کھودنا مستقل نہیں ہوگا۔ اس کا
 کوئی حل بھی ہوگا۔“

مراد راجہ لمحے بھر کو ریگ رہ گیا۔ گردن میں
 تھوک نچکنے سے کھنسی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔

”تمہاری یادداشت واپس نہیں آئے گی غلام
 قاضی۔“

قاضی جواباً کھڑے مسکرایا۔
 ”غلط۔ تالیہ کی یادداشت کھڑوں کی صورت
 میں واپس آئی تھی۔ اسے قدیم ملاک میں اپنے بھجن
 چند لمحے کے لیے قدیم ملاک کی اس شام میں
 واپس جاتے ہیں جب مراد راجہ کے سامنے بیٹھے غلام
 قاضی نے وہ بے رنگ بے ذائقہ شروب پی کے چابی

کے کچھ حصے یاد ہیں۔ مجھے بھی قدیم ماکہ میں گزرے یہ چار ماہ یاد آجائیں گے مگر سوال یہ ہے کہ کیسے؟

مراد راجہ کے ماتھے پہ تل پڑے۔

”تم سمجھتے ہو کہ یہ آسان ہے؟“

”وان فاتح نے زندگی میں آسان کام کبھی نہیں کئے کیونکہ وہ سب کر لیتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ وہ کیا مشکل کام ہے جسے میں کروں تو میری یادداشت واپس آجائے گی؟“

راجہ چند لمحے لب بھینچے اسے کھورتا رہا۔

”میں تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا۔“

”تمہارے پیارے میں تاریخ کی کتابوں میں ایک حکایت پڑھی تھی میں نے۔“ فاتح نے ہتھیلیاں میز پر رکھیں اور جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ایک لڑائی کے دوران تمہارے مد مقابل شخص کا تلوار والا ہاتھ کٹ گیا۔ ہاتھ بھی گیا اور تلوار بھی۔ تو تم نے اپنی تلوار پھینک دی اور اپنا ایک ہاتھ کمر کے پیچھے کر کے نہتے وہ لڑائی لڑی اور اسے مار گرایا۔ یہ غیرت مند مردوں کا طریقہ ہوتا ہے راجہ! وہ مقابلہ برابری کی سطح پر کرتے ہیں۔ مجھے نہتا کر کے ہرانے میں کیا مزا ہے؟“ وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ”یا شاید تمہیں ڈر ہے کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا؟“

”تم کچھ بھی کر لو۔ میری بیٹی میرے پاس واپس ضرور آئے گی۔“

وہ تیزی سے بولا پھر خاموش ہو گیا۔

”تم کہہ کے تو دیکھو۔“

مراد راجہ چند لمحے اس کی آنکھوں کی ہٹ دھری دیکھتا رہا پھر گہری سانس بھری۔

”ہم شکار باز صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔

ہم زمانوں کے مسافر ہیں۔ وقت میں سفر کرتے

ہیں۔ ہر زمانے میں شکار بازوں کا ایک راہبر ہوتا ہے۔ ان کا سربراہ۔ تمہاری یادیں اگر کوئی لوٹا سکتا

نہا تو وہ بھی ہے۔“

”اور وہ کون ہے؟“

”وہی جو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور وہ مجھے

کبھی تمہاری یادیں لوٹا سکتا ہے۔“ وہ صراحت سے علم

میں تفر سے بولا۔ ”لیکن شاید تمہاری دنیا کا کوئی اور

تم پہ رحم کھالے۔“

”ہماری دنیا کا شکار باز! وہ جھانکا۔ کمرے

ڈھیلے پڑ گئے۔ آہستہ سے سیدھا ہوا۔ ”تو فیروز باغ

نہیں ہوں گے۔ وہ نسل در نسل اپنے علم کو منتقل کرتے

جائیں گے اور ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔“

”ہم زمانے کے مسافر ہیں۔ ہم بھی ختم نہیں

ہوں گے۔“ وہ تقاضے سے مسکرایا۔ ”تمہارے پاس

ایک رات ہوگی وان فاتح۔ تمہیں اپنا دنیا کے شکار

باز راہبر سے ملنا ہوگا۔ وہ تم سے تین سوال پوچھے گا۔

اگر تم ان کا جواب دے سکو تو تمہارے لیے امید نکل

سکتی ہے۔“

”کیسے سوال؟“

مراد راجہ نے لباس شانوں سے جھٹکا اور اٹھ

کھڑا ہوا۔ ہاتھ کمر پہ باندھ لیے۔

”معلوم نہیں۔ ہر زمانے کے اصول اور سوال

مختلف ہوتے ہیں۔ وقت کا چکر مکمل ہونے پہ جب

بھی چابی تحلیل ہوتی ہے وہ شکار باز راہبر کے پاس

چلی جاتی ہے۔ تاہم جب بچپن میں تمہاری دنیا میں گئی

تھی تو وقت کا چکر مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے وہ چابی

ٹوٹ گئی اور کئی برس تحلیل نہ ہوئی۔ تم نے میری دنیا

میں آتے وقت دروازہ کھول ڈالا جس سے چابی تحلیل

ہوتے ہی میرے پاس تو آ گئی لیکن وہ ناکارہ ہو چکی

تھی کیونکہ تم نے وقت کا چکر خراب کر دیا ہے۔“

وہ سانس لینے کو رکھا۔ فاتح غور سے اس کو دیکھ

رہا تھا۔

”اب جو چابی میں تمہیں دے رہا ہوں یہ

تحلیل ہوتے ہی تمہارے زمانے کے شکار باز کے

پاس چلی جائے گی۔ اس چابی میں تمہاری بادی قید

”کون؟“

”وقت کا مسافر ہوں اور اپنی یادیں واپس لے آ رہا ہوں۔“

دوسری طرف چاموشی چھا گئی۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھلا۔ وان قانع نے چہرہ اٹھایا تو اپنے سامنے چوکھٹ پہ ایک اڑھڑ عمر آدمی کو کھڑے پایا۔ اس نے گرتے پاجامے کے اوپر ناف کے گرد کپڑا باندھ رکھا تھا اور سر پہ جینز کپ جھکی ٹوٹی تھی۔ ٹھوڑی پہ ہلکی سی ڈاڑھی بھی تھی۔ آنکھیں کینڑ کے قانع کو دیکھا اور مسکرایا۔

”خوش آمدید۔“ پھر راستہ چھوڑ دیا۔

اس نے جوتے چوکھٹ پہ اتارے اور اندر داخل ہوا۔ وہ آدمی آگے بڑھتا گیا۔ صاف ستھری چھوٹی سی راہداری عبور کر کے ایک دیوان خانے میں اسے لے آیا جہاں فرش نشست چھٹی تھی۔ دیوار پہ ویلٹ بنے تھے جن کے خانوں میں کاج کی بہت سی بوتلیں رکھی تھیں۔ اگر مٹی اور خوشبودار موم بتیوں نے فضا کو مضطرب کر رکھا تھا۔

وہ دونوں آنے والے سامنے چٹائی پہ دوڑانو ہو کے بیٹھ گئے تو اس آدمی نے غور سے قانع کو دیکھا۔

”وقت کے مسافر ہو؟“

”اپنی خوشی سے نہیں گیا تھا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”غلطی سے دروازہ مار کیا تھا۔ صبح اس چابی کے تحلیل ہوتے ہی قدیم ملاکہ میں گزرے پل بھول جاؤں گا۔“

”یاد رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ وہ نرمی سے مسکرایا۔

”میں فرار ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جو کیا ہے اس کو یاد رکھ کے اس کا سامنا کرنے والوں میں سے ہوں۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں جو اس جادو کا توڑ ہو سکے اور صبح پہری یادداشت نہ کھوئے۔“ اس آدمی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں قانع کی گردن میں پڑی زنجیر پہ جمی تھیں۔

”یادداشت تو کھو جائے گی لیکن ایک صورت

میں اگر تم اس راہبر کو ڈھونڈنا چاہتے ہو تو تمہیں پانی اس کارستہ خود دکھائے گی۔ اب میں نے تمہیں سب بتوایا ہے۔ اب ہم اس مقابلے میں برابر ہیں۔ تمہاری یادداشت واپس آئے یا نہ آئے میری بی واپس ضرور آئے گی۔“

”وہ سمجھتے ہیں۔“ وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

ہم چلے گئے

سولہ جولائی کی رات تالیہ اور ایم کے اہل کے لیے نکل پڑے تو وہ پولیس اسٹیشن چلا آیا۔ اپنا بیان ریکارڈ کروایا مگر یہاں سے وہ گھر نہیں گیا۔ اس نے گردن میں پڑی چابی کو ہاتھ میں اٹھا کے دیکھا۔ ”مجھے اپنے وقت کے شکار باز سے ملنا ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔“

چابی سے سنہری سا پتھہ نکلا اور فضا میں اڑنے لگا۔ قانع نے گاڑی وہیں چھوڑی اور اس سنہری پتھہ کے پیچھے قدم۔ قدم چلتے لگا۔ اس پتھہ کو اس کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ہوا میں تیرتا پر صرف قانع کو راستہ دکھانے کے لیے تھا۔

وہ مٹی میں دیرویران سڑکوں پہ چلتا رہا۔ چابی ہر گزرتے پل کے ساتھ بھاری ہوتی جا رہی تھی مگر وہ اس وزن کو برداشت کیے ہوئے تھا۔ پتھہ اڑتا چلا جا رہا تھا۔

ملاکہ کے ایک مہمان آباد علاقے میں وہ اسے کھینچ لایا۔ وہاں قطار میں ایک منزلہ گھر بنے تھے جن کی خردکی چھین تھیں اور دیواریں سرمئی ٹیلی اینٹوں کی بنی گئی تھیں۔ وہ درمیانے درجے کا علاقہ تھا اور رات کے اس وقت سنسان پڑا تھا۔

پتھہ ایک دروازے کے پائندان پہ جاگرا اور ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ منزل آچکی تھی۔ وان قانع نے ہٹھلی سے دستک دی۔ پھر گھنٹی بجائی۔

دھماکہ مسموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کسی نے دروازے کے پیچھے سے سوال کیا۔

ہے اس کے واپس آپنے کی۔“

”بتائیے۔“ وہ محل سے بولا۔ گردن میں پڑی زنجیر بھاری ہو رہی تھی۔

”اگر تم وقت کے تین سوالوں کا جواب پالو تو تمہاری یادیں وقت تمہیں خود لوٹا دے گا۔“

”پوچھیے۔ وہ تین سوال کیا ہیں۔“

شکار باز کی نظریں زنجیر سے اٹھ کے اس کے چہرے پر جا رکیں۔

”تو پھر بتاؤ۔ پہلا سوال، کوئی کام شروع کرنے کے لیے سب سے اہم وقت کون سا ہے؟

دوسرا سوال۔ انسان کی زندگی کا سب سے اہم کام کون سا ہوتا ہے؟

تیسرا سوال انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہونا چاہیے؟“

چند ثانیے کے لیے اس دیوان خانے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں نے ہلکے سے ہنسی۔

”اور اگر میں کہوں کہ مجھے ان تینوں سوالوں کے جواب معلوم ہیں تو؟“

”تو میں یہ کہوں گا کہ اکثر کہتے ہیں، لیکن ان کا جواب دینا کافی نہیں ہے۔ تمہیں ان کا جواب

”پانا“ پڑے گا۔ کل جب تمہاری یادداشت کھو جائے گی تو تمہارا امتحان شروع ہو گا۔ جس دن تم ان

جوابات کا، دل کے اطمینان سے اقرار کر لو گے تو وقت تمہیں تمہاری یادداشت لوٹا دے گا۔ لیکن ایک

شرط ہے۔“

”کہیے۔“ وہ بدقت بولا۔ چابی بھاری ہو رہی تھی۔ شاید وہ دیکھنے بھی لگی تھی کیونکہ اسے گردن پہ

گرمانش محسوس ہو رہی تھی۔

”تم کسی سے بالواسطہ مدد نہیں مانگ سکتے۔ تم اپنے لیے کوئی تحریر یا اشارہ چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ تم

اس امتحان میں نفل کر کے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تم ان سوالوں کے بارے میں کسی کو بالواسطہ کچھ نہیں بتا سکتے ورنہ تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ تمہیں ان کا

جواب فطری طریقے سے خود حاصل کرنا ہو گا۔“

”اگر کوئی اپنے طور پر میری مدد کرنا چاہے تو؟“

”تم ان تین سوالوں کے بارے میں کسی کو بتا سکتے ہو لیکن اس سے مدد نہیں مانگ سکتے۔ اس کے علاوہ جو کہو اس کے لیے تم آزاد ہو۔ کوئی خود سے

تمہاری مدد کرنے وہ اس کے لیے آزاد ہے۔“

ادھیڑ عمر آدمی دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔

”یہ سوال تم سے کل کے بعد اگر کوئی زبانی کلامی پوچھ بھی لے تو بھی ان کا جواب دینا درکار نہیں۔ تمہیں اپنے عمل سے ان کا جواب خود کو دینا

ہو گا۔ جس دن تمہاری زندگی میں یہ جوابات شامل ہو جائیں گے تمہاری یادیں میں تمہیں لوٹا دوں گا۔“

رات پچھلتی جا رہی تھی اور شکار باز کی آواز بھی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بڑھتے ہوئے بوجھ کے ساتھ ک

رہا تھا۔

”یعنی میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”شہزادی تاشہ کو؟ ہرگز نہیں۔ اگر تم نے اسے چھوڑ دیا تو آخری سوال کا جواب کیسے دھوڑ پاؤ گے۔“

”آپ اسے جانتے ہیں؟“ قانع نے ابرو اٹھائی۔

پراسرار آدمی مسکرایا اور شلیف کی طرف اشارہ کیا جہاں کانچ کی زنجیریں صراحیوں پر تھیں۔

”ان میں سے تیسرے نمبر والی میں تابلہ کی یادداشتیں ہیں۔ اس کو ایک سوال کا جواب مل گیا تھا اس لیے کچھ یادیں واپس چلی گئیں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ بھری ہوئی نہیں ہے۔ اور وہ جو خالی صراحی ہے وہ تمہاری ہے۔ صبح یہ بھر جائے گی۔“

قانع نے کپٹی کو چھوا۔ چابی کا وزن بڑھتا جا رہا تھا۔

”اگر اسے میرے ساتھ رہنا ہے تو اسے ایک بات کا علم ہونا ضروری ہے۔“ قانع نے قریبی میز پر

دھرا قلم کا غذا اٹھایا اور صفحے پہ چند ہندسے لکھنے لگا۔

”وہ میرے قدموں کے نشانات کا پچھا کرتے یہاں ضرور آئے گی۔ جب وہ آئے تو اس کو یہ

بند دے دیجیے گا۔“ صفحہ پھاڑ کے اس کی طرف
 ہدایا۔ شکار باز نے اس کا غد کو تہ کیا اور جیب میں
 رکھا۔
 ”درست وقت اور درست جگہ پر میں اسے یہ
 پہنچا دوں گا۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔“
 وان فارح نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور
 اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”مجھے واقعی جانا چاہیے۔ ایک ادھوری ای میل
 کو مکمل کرنا ہے مجھے۔“
 واپسی کا راستہ طویل تھا مگر کٹ گیا۔ جیب میں
 کچھ سکے تھے جن سے اس نے رک کے ایک فون
 بوتھ سے عثمان کو کال کی اور ایک رقم ایڈم کے اکاؤنٹ
 میں ڈلوانے کو کہا۔ ساتھ ہی اپنے لیے نئے موبائل کا
 بندوبست کرنے کا حکم دیا۔
 واپس گھر آ کر اس نے ای میل کی آخری سطور
 مٹائیں اور اسے دوبارہ سے لکھا۔ پھر ایڈم کو ایک ای
 میل الگ سے لکھی۔ وہ چاہتا تھا کہ تالیہ کو ان پیسوں
 سے ایڈم چاہلیس اور کو کو پچھل بھیجا کرے۔
 وہ سب کچھ بھول بھی جائے تو بھی تالیہ نہ
 بھولے کہ وہ دونوں ابھی تک مکمل طور پہ وقت کی
 تلاشی سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔
 ☆☆☆
 واپس چالیہ دن میں آتے ہیں۔
 وان فارح کے آفس کے باہر سیکرٹری کا کیمین
 تھا۔ اس کے آگے چھوٹا سا لاؤنج بنا تھا۔ لاؤنج کے
 صوفے پہ براجمان تالیہ اس کیمین کے ساتھ کھڑے
 سرگوشیوں میں بات کرتے عثمان (سیکرٹری) اور
 عبداللہ (باڈی مین) کو صاف دیکھ سکتی تھی۔
 عثمان اب دونوں ہاتھ اٹھا کے سلی دینے والے
 انداز میں اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ عبداللہ کا چہرہ بچہ گیا۔
 سر اثبات میں ہلایا۔ شکوہ کتنا انداز میں تالیہ کی
 طرف دیکھ کے کچھ کہہ بھی ڈالا۔ عثمان اس کے
 کندھے کو چھپتا مڑا ناکی کی ناٹ درست کی اور
 چہرے پہ مسکراہٹ سجائے تالیہ کی طرف آیا۔

”چے تالیہ۔“ خوشامدی انداز میں کہتا اس کے
 قریب صوفے پہ بیٹھا۔
 وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی ناقدانہ انداز
 میں اسے دیکھنے لگی۔
 ”کیا مجھے جاب دینے سے انکار کر دیا ہے فارح
 صاحب نے؟“
 ”نہیں نہیں... اصل میں... ابھی کوئی دیکھنی
 خالی نہیں تھی لیکن عبداللہ کچھ دن سے چھٹی مانگ رہا
 تھا تو کیوں نہ کچھ دن آپ عبداللہ کی جگہ پہ کام کر
 لیں۔“
 تالیہ نے ٹانگ دوسری ٹانگ سے ہٹائی اور
 سیدھی ہوئی۔ تاثرات بدلے۔ ”باڈی وومن کی
 جاب؟“
 ”بس کچھ دن کے لیے.... عبداللہ جیسے ہی
 واپس...“
 ”عبداللہ ابھی تو چھٹی سے واپس آیا تھا۔ غالباً
 آپ اسے چند دن کے لیے چھٹی پہ بھیج رہے ہیں
 کیونکہ باس کو لگتا ہے کہ (بند دروازے کو دیکھا) چے
 تالیہ چند دن سے زیادہ نہیں نکلتے گی۔“
 ”ہرگز نہیں میم....“ عثمان شرمندہ ہوا۔ تالیہ
 نے ماتھے پہ ہل ڈالے، ہنکارا بھرا۔
 ”خیر... آپ باس کو جا کے بتائیں کہ تالیہ مراد کو
 یہ جاب منظور ہے۔ کب سے کام شروع کروں؟“ وہ
 ایک دم طنزاً مسکرا کے بولی۔
 عثمان کو شاید توقع نہ تھی۔ لمبے بھر کو چپ ہو گیا۔
 پھر مسکراہٹ لیوں پہ واپس لے آیا۔
 ”کل سے۔ آج آپ پورا دن خود کو کوئی طور پہ
 تیار کر لیں۔“
 وہ اٹھنے لگا تو وہ بولی۔ ”وہی مجھے کیا کرنا ہوگا؟
 کیا وان فارح کی حفاظت کرنی ہوگی؟“
 ”وہ تو باڈی کا رٹز کا کام ہے۔“ عثمان جھینپ
 کے ہنسا۔ ”یہ باڈی وومن کی جاب ہے۔ ہر سیاست
 دان کے ساتھ ایک سیکرٹری اور چند کارٹرز ہوتے ہی
 ہیں مگر ایک پرسنل ایڈ بھی ہوتا ہے جو باڈی مین کہلاتا

ہے۔ وہ بالکل بھی ہاڈی کارڈ جیسا نہیں ہوتا۔
 ”اور اس کا کام کیا ہوتا ہے؟“ وہ گردن اٹھا
 کے سامنے کھڑے عثمان سے پوچھ رہی تھی۔
 ”باس کے کھانے پینے اور کپڑوں کا خیال
 رکھنا۔ چیزیں پکڑانا، کوٹ، داغ لگا ہے تو اسے
 صاف کرنا۔ ان کی صحت کا خیال رکھنا۔ کام کی زیادتی
 باس کو اپنا آپ بھلا دیتی ہے تو آپ ان کو ازرقی بارز
 اور کافی لاکے دیتی رہیں گی۔ وہ کار سے ٹکس تو ان
 کے ہاتھ سے خالی کپ لے لیتا وغیرہ وغیرہ۔“
 ”پندرہویں صدی کے ملاکہ میں یہ کام غلام کیا
 کرتے تھے۔ وان قارح مجھے غلام بنانا چاہتے ہیں؟“
 وہ اداسی سے مسکرائی۔

”نہیں بچے تالیہ۔ یہ جاب بہت قابل مہر و سا
 لوگوں کو دی جاتی ہے۔“

عثمان کے جانے کے بعد وہ انھی اور کرسی پہ
 خاموش بیٹھے عبداللہ کی طرف آئی۔
 ”میں امید کرتی ہوں آپ کو مجھ پہ غصہ نہیں آ
 رہا ہوگا کیونکہ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے آپ کی
 جاب لے لی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی تو
 وہ جلدی سے کھڑا ہوا۔

”ہرگز نہیں“ بچے تالیہ۔ مجھے شرمندہ مت
 کریں۔“ وہ جھینپ گیا۔
 ”میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو آپ کی
 جاب واپس مل جائے گی۔ آپ میری طرف سے دل
 بہ امت کیجیے گا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ باس کبھی بھی مجھے
 یوں ضائع نہیں کریں گے میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے
 نہیں اور ایڈ جسٹ کر دیں گے۔“ وہ خوش دلی سے
 مسکرا کے بولا تو تالیہ نے بند دروازے کو دیکھا۔
 ”عبداللہ؟“ آواز دھیمی کی۔ ”کیا آپ مجھے
 میری جاب سکرپشن لکھ کے دے سکتے ہیں؟“
 ”بے ذی؟“ عبداللہ نے سوالیہ ایمو اٹھایا۔
 تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”قارح صاحب کو آپ سے بہتر کون جانتا ہو

کا۔ اگر آپ مجھے قبولہ کا لکھی کر دیں، کہہ دیں
 کے اندر کیا کیا شامل ہے تو وہ ۱۰۰۰ روپے
 کا۔“
 ”آف کورس ہے تالیہ۔ میں ابھی اچھا
 ہوں۔ آپ نے کتنی سبھی میں پورا کر دیا ہے۔
 جانتا ہوں کہ باس کو مشکل نہ ہو۔“ ان نے فوراً دروازے
 سے چھوٹی ڈائری نکالی اور قلم مولا۔ چھوٹی پین
 اور جلدی جلدی کا غلاف اٹھا کر دیکھنے لگا۔ ”تو جیسا
 سمجھاتا بھی جا رہا تھا۔ وہ تین کمرے کلا۔“
 کئی۔

باڈی مین کو آفس تک نہ دتا تھا۔ یہ قلم ایب
 کرسی ملتی تھی۔ ہنہ۔

تالیہ

”کیا پڑھ رہی ہو؟“ وہ پتھر میں دھاپے
 کے برآمدے کے زینے پہ بیٹھی عبداللہ کے پاس
 کاغذات کو پڑھ رہی تھی جب دانتوں سے تھکا کے بیچ
 تالیہ چمکی پھر کاغذات کی طرف بڑھا۔
 ”مجھے وان قارح نے پرسنل ایئر کی جاب
 دی ہے۔ یہ میری ہے ذی (جواب دے سکتی
 ہے۔“

اب وہ سامنے گھاس پہ جمی تختی دھپک
 دیکھ رہی تھی۔ دانتوں نے ٹیک ہاک پہ بتائی تھی
 کاغذات کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔
 ”یہ اس کے آفس کی اعلیٰ ترین جاب ہے۔“
 ”جانتی ہوں۔“

”جانتی ہوں تو قبول کیوں کی؟“ یہ تھا ہونٹ۔
 ”مجھے خزانے سے بہت امید تھی۔“ دانتوں
 خزانہ ہاں نہیں تھا۔ خزانہ کھینچا ہے۔ پہلو ہوا
 میں داپس کر چکی ہوں۔ چھتہ بیداری کے سویرے
 پاس کچھ نہیں ہے۔ میں دانت قارح کے قریب رہتا
 چانتی ہوں۔ ایسا ہے تو ایسے ہی کئی۔
 ”کیا ان کو معلوم ہے کہ تم ہی عالم ہو۔“
 چوڑی۔

”عالم جس سے پوچھ لیا۔“ نہیں مگر اس نے

عام کر ایک کام کیا تھا۔ واٹن تم ایک کام کرو۔ تم ہمارے
ہاں اور معلوم کرو کہ سولہ اور سترہ ہولائی کی درمیانی
شعبہ دان خارج کے ساتھ وہاں کیا ہوا تھا۔ ان کو ہمارے
چوبیس آئی ہیں اور وہ یاد نہیں کر پا رہے کہ ان کے
ساتھ کیا ہوا۔

”تم ٹوڈ پھ کیوں نہیں معلوم کر لیں؟“
”کیونکہ میں جانتی ہوں ان کے ساتھ کیا ہوا تھا
لیکن جو میں جانتی ہوں وہ ان کی عقل سے اوپر ہے۔
تم ایک عام انسان کے طور پر جو بھی معلوم کرو کی وہ
ان کی عقل میں آجائے گا۔“ مکر واٹن کی نقلی نہیں
ہوئی تھی۔

”اگر تمہیں سب معلوم ہے تو ان کو آسان الفاظ
میں بتا کیوں نہیں دیتیں؟“
تالیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
”وہ یقین نہیں کریں گے۔ کوئی یقین نہیں
کرے گا۔“

”تو پھر میرے جانے کا فائدہ؟“
”جو کام انہوں نے سونپا ہے اور جس کے چہرے
وہ دیں گے اس کو ایمان داری سے کرنے کے لیے
تمہیں وہاں جا کر اس رات کو ٹریس کرنا ہوگا۔“
”اور اس رات ہوا کیا تھا؟“ واٹن غور سے
اسے دیکھ رہی تھی۔ ”اس رات کے بعد سے تم بدلی
بدلی ہی ہو تالیہ۔“

”میرے ساتھ کیا ہوا تھا اسے جانے دو۔ لیکن
ان کے ساتھ جو بھی ہوا تھا وہ کسی سی سی ٹی وی فوٹیج پر
نہیں ملے گا۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں یہی معلوم ہوگا
کہ وہ ایڈم کے ساتھ سوا گیا رہ کے قریب کمر میں
داخل ہوئے اور پھر ساڑھے گیارہ بجے ایڈم اور
میرے جانے کے بعد وہ وہاں سے نہیں نکلے۔ یہ
بات شہوتوں کے ساتھ میں ان کو سمجھا دوں گی تو وہ اس
رات کا پیچھا چھوڑ دیں گے۔“

وہ واٹن کے ہاتھ سے کاغذات لہجی اٹھی۔
”اب میں اپنی نئی جاب کی تیاری کر لوں۔“
”اوہ ٹریک... تم کیسے ایک سیاسی پارٹی میں کام

کر کی؟ تم اگر اپنے دل سے اتنا دور نہیں ہوا
کتی؟“

تالیہ نے ہوا سے منہ اگے لگتی ہمارا دل داری
اور کمرے والی کو بلایا۔

واٹن (پیشہ پر یوں لہجی تھی کہ اس نے مقصد
سے مصروف آرہی تھی۔ تالیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں
اور اس نے ہاتھ کا پھانسا۔

”وہ کون ہوتا ہے جو دوسرے کے اعلیٰ کر اس
کے خلاف استعمال کر کے... اسے... اسے... اسے...
ہمارا سادے کر لواتا ہے اور پھر یوں آنکھیں بند ہوتا ہے
کہ اس کا کارڈ ہاتھ لگا رہتا ہے اور ہاتھ لگتی
سکتا ہے کہ وہ کون ہے کہ اس کا ہاتھ اعلیٰ کر لیا تھا۔
کون ہوتا ہے وہ ہمارا؟“
”ایک کام۔“

”ہاں اور سیاست دان بھی۔“
آنکھیں بند ہو کر کے تاریک نگر آتی واٹن کو
دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

”ہر ایک شخص نے بعد عوام ہاتھ ملتے ہیں انہوں
کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو ووٹ کیوں دیا۔ یہ تو
ہمیں لوٹ کے چلے گئے مگر یہ تو سیاست دانوں کا
اسلام ہے۔ وہ لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کو
ووٹ دینا عوام کا اپنا آئیڈیا تھا۔ غلط واٹن پوچھا۔
غلط۔“

ایکشن ایک لمبا اسلام ہوتا ہے۔ ایک خوب
صورت کون گیم۔ عوام ووٹ نہیں دیتا۔ سیاست دان
عوام کے خوابوں کو ان کا لالچی بن کے استعمال کرتے ہیں
وہ اتنے دل فریب وعدے کرتے ہیں کہ عوام مجھوت ہو
جاتی ہے۔ عوام سے ووٹ لیا جاتا ہے۔ اور رہی
میں... تو میں اس دفتر میں اس لیے کام کر سکتی ہوں
کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اسلام کیسے چلے جاتے ہیں
اور ان کا توڑ کیا ہوتا ہے۔“

”واٹن قانع کے اسے قریب کام کرنے کے
بعد یاد رکھنا کہ تجھے چھپو ہو جائے گی۔“
”تالیہ کی ہمت اب کوئی چھپو نہیں توڑ

سکتی۔“ پھر یوں تک دو انگلیاں لے جا کر ان کو پھونک مار کے ہوا کے حوالے کیا اور مسکرا کے ہاتھ ہلاتی اندر چلی گئی۔

”تالیہ کو کیا ہو گیا ہے!“ داتن پدوکا کی پریشانوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اتنی ٹڈر اور بے خوف تو کبھی نہیں تھی۔ آخر اس رات کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

جدید ملاکہ کے خوب صورت شہر پہ بارش پوری دو پہر دل کھول کے برسی اور پھر بھی تو شام اترنے لگی۔ سن باؤ کے گھر کا صحن گیا تھا اور بجسے کے قریب ایڈم زمین پہ بیٹھا دستانے چڑھائے اینٹوں کو جوڑ رہا تھا۔ کانوں میں ہینڈ زفری لگا رکھا تھا۔

”جی چے تالیہ! صبح تک سارا صحن برابر کر دیا تھا میں نے مگر کیاری والا حصہ بارش نے پھر سے خراب کر دیا۔ جی..... جی اب دوبارہ اسے جوڑ رہا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جینز کے گھٹنے کچھ آلود تھے اور دستانے کارے میں لتھڑے تھے۔ سر پہ ٹوپی تھی اور چہرے پہ مسکراہٹ۔

”آپ بتائیں، آپ کی جاب کا پہلا دن کیسا رہا؟“

دوسری طرف سے چلا بھٹا جواب موصول ہوا۔ ”باڈی دو من بنا دیا مجھے اس غلام نے، جس کی ایک زمانے میں میں نے بھری منڈی میں بولی لگائی تھی۔“ شہزادی تاشہ نے ساتھ میں ”ہونہہ“ بھی کیا تھا۔

”باڈی دو من؟“ اینٹ اٹھاتے ہوئے ایڈم ہنس دیا۔ ”یعنی کہ پرسل ایڈ؟ اوہ جے تالیہ! مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ شہزادی کو غلام کی چاکری کرنی پڑے گی۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے اینٹ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گارا زیادہ ڈال دیا تھا اینٹ برابر نہیں بیٹھ رہی تھی۔

”خود جاب لیس ہو اور مجھ پہ ہنس رہے ہو۔ ارے تمہیں تو کوئی باڈی من تک نہیں رکھتا۔ ایک میں جی جس نے شاعی مورخ بنادیا تھا۔“

ایڈم رکا اور دائیں ہاتھ سے دستانہ اہلر کے اسے الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ”اور یہ معجزہ ہی ہے کہ آپ کی غلامی کے بعد بھی یہ ہاتھ سلامت ہے۔“ ”اگر ہاتھ سلامت ہے تو ایک جاب ہے تمہارے لیے۔“

”حکم کیجیے، شہزادی۔“ اینٹ کو زور سے دھپکا۔ وہ اندر دھنک بیٹھ ہی نہیں رہی تھی۔ کچھ تھا جو غلط تھا۔

”قدیم ملاکہ میں تم شاعی مورخ تھے۔ تمام حالات حاضرہ کو رقم کرتے تھے۔ جانتے ہو ایسے شخص کو جدید زمانے میں کیا کہا جاتا ہے؟“

”کیا؟ جے تالیہ؟“ جھنجھلا کر اینٹ نکالی اور کیاری کے شکاف کو دیکھا۔ برابر سطح میں ایک اسی اینٹ کا خانہ خالی تھا۔ اس نے مٹھی سے مزید اینٹ نکالی۔

”رپورٹر!“

”رپورٹر؟“ ایڈم حیران ہوا۔ ساتھ ہی مٹھوں سے مٹی بھی نکالے جا رہا تھا۔

”ہاں ایڈم۔ تم لکھنا چاہتے ہو؟ وہ بھی ج؟ تو تم رپورٹنگ کی طرف چلے جاؤ اور یہ مت کہنا کہ تمہیں جاب کون دے گا۔ میرا ایک کلائنٹ ایک اخبار چلاتا ہے۔ اس سے تمہارے لیے وقت لیا ہے۔ دو دن بعد تم انٹرویو دینے پہنچ جانا۔“

”آپ اور اتنی مہربان؟“

”اور سنو، کوئی اچھی سی تحریر لکھ کے لے جاؤ۔“ تحریر تمہاری سی وی ہوگی۔ اس کو پڑھ کر ہی وہ چھین نوکری دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کریں گے۔“ اس کی بات کو نظر انداز کر کے وہ کہے جا رہی تھی جب ایڈم ایک دم کراہا۔ ”آؤ ج۔“

”یا اللہ! ایڈم.... کیا ہوا؟“

”جی چے تالیہ.... میں انٹرویو دینے ضرور جاؤں گا۔ اچھا میں ٹھہر کے کال کرتا ہوں۔“ اس نے فون بند کیا اور ٹارچ جلا کے مٹی پر روشنی پھینکی۔ ویسے تو شام کی روشنی پھیلی تھی مگر وہ کافی نہ تھی۔ ایڈم نے چہرہ جھکایا اور تعجب سے چٹلیاں سکڑ کے دیکھا۔ اس کے

پیسے سے ترچہ لے کرے کمرے کمرے سانس لیتا وہ اندر آیا تو وہ فوراً سیدھی کھڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ بیک میں چلا گیا۔

”آپ کی پوسٹ ورک آؤٹ ڈرنک۔ سر“

آگے آئی اور ادب سے ہوسٹ ڈکال کے پیش کی۔ ہوسٹ سلور رنگ کی تھی اور عبداللہ نے سامان کے ساتھ حوالے کی تھی۔ فاتح نے ہوسٹ پکارتے اسے ایک نظر دیکھا۔

”تم آگئیں ناشا“ ہوسٹ منہ سے نکالی۔

گھونٹ بھرا۔ پھر منہ ہاتھ کے ہوسٹ پیچ کی۔

”گناہ ہے تم نے اپنی ساری کڑواہٹ بھی میری ڈرنک میں گھول دی ہے۔“

چوتھی بھرت لڑو کی کسی کمرہ منہ لڑو کی قتل سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے ہوئی۔ ”پہ آپ کی لہرٹ ڈرنک ہے سر“ لیکن اگر آپ نے ابھی ابھی اپنے لہرٹس ہاتھ کاٹ لیا۔ کیا سچے سچے ہاتھ لہرٹ بنا دیں۔ میں اس سے وہی لے لوں گی۔“

”میرے پیچہ ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

ناشا ”ہوسٹ اس کے ہاتھ میں تھمائی اور خود آگے بڑھ گیا۔ ہاتھ لے کر لڑو ڈرنکوں سے اسے ہاتھ دیکھا۔ اس کے ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ”پہ عزتی“ دیکھ کر وہ ہاتھ لے کر لڑو ڈرنکوں سے اس کے ہاتھ دیکھا۔ اس کے ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

ہوسٹ ایک ایک لڑو ڈرنک سے اس کے ہاتھ دیکھا۔ اس کے ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

”آپ کو اس مسئلے سے اس کے ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

وہ کار سے نکلی تو ایک دم بوند باندی شروع ہو گئی۔ چھتری بیک میں تھی اور کے ایل کا موسم وہاں فاتح کے موڈ جیسا تھا۔ ہل میں تولہ ہل میں ماش۔ اخبار کے اسٹال پہنچنے تک پارک کی تیز بوجھاڑ سے نکلی۔ تالیہ بھیک گئی۔ اخبار کو تو پلاسٹک رپر میں ڈالا مگر خود کو کہاں ڈالتی؟ بھانسی ہوئی واپس کار میں آئی اور اندر پناہ لی۔ پھر رپر کھول کے اخبار پیچھے ہاس کی طرف بڑھایا۔

اس نے ایک نظر بیسکی ہوئی لڑکی پہ ڈالی اور اخبار لے لیا۔ پھر عینک لگائی اور چند لمحوں میں سرسری نظر سے خبروں کا جائزہ لیا۔ پیشانی ٹھکان آلود ہو گئی۔

”تم یہ اخبار خود پڑھ لو۔ تمہاری سیاسی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوگا۔“ شاید کسی خبر کو دیکھ کے موڈ خراب ہوا تو عینک اتاری اور ناگواری سے اخبار آگے بڑھا دیا۔

عثمان خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا جیسے پہ چال کی ہے عزتی پھر دوسری ہی نہ ہو۔

اس نے چپ چاپ اخبار لیا اور رول کر کے بیک میں ڈال دیا۔ تاثرات سپاٹ رکے۔ (اپ) میرا اخبار بھی کڑوا ہے کیا؟ (نہ)۔

وہ اس کے اندر چلا گیا تو وہ باہر کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ لڑو ڈرنکوں سے اس کے ہاتھ دیکھا۔ اس کے ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

اس کی ہاتھ کاٹنا ہی چاہیے ہے۔“

ساتھ بیک واپس ملے اس کا لمس دیکھا۔
 فاح نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کھانسیوں
 سے لگا یا۔ دو گھنٹہ بھرے۔ پھر سڑک کنارے
 بھاگتی عمارتوں کو دیکھ کے کہنے لگا۔
 ”تم نے راپا چینی کی بیٹی والی کہانی پڑھی ہے؟“

”نہیں سہرا“ وہ سانس روکے اس کے تاثرات
 پڑھ رہی تھی۔ دل برا ہونے لگا تھا۔

”راپا چینی نے اپنے گھر میں زہریلے پھولوں
 کا باغ لگایا اور بچپن سے اپنی بیٹی کو زہریلے پھولوں کا
 رس پلانے لگا۔ تھوڑا تھوڑا زہر اس کے اندر اترتا تو وہ
 مری نہیں بلکہ زہر سے Immune (محفوظ) ہوتی
 چلی گئی یہاں تک کہ وہ خود ایک زہریلا پھول بن گئی۔
 وہ لڑکی جس پھول کو چھوتی۔ وہ اس کے ہاتھ میں
 مرجھا جاتا۔ جس شخص کو چھوتی اسے اپنے لمس کے
 زہر سے مار دیتی۔ میں اب تک سمجھتا تھا کہ یہ ناممکن
 ہے کہ کسی انسان کے ہاتھ میں اتنی کڑواہٹ بھر
 جائے کہ وہ جس کو چھوئے سر جھٹک کے عثمان کو
 پکارا۔“ پلیز اس کا کافی کو اس پھول بیچنے والے کو دے
 آؤ۔ شاید اس کو یہ اتنی بدمزہ نہ لگے۔“

عثمان نے کار روکی۔ خاموشی سے دونوں کپ
 لیے اور باہر نکل کے ایک پھولوں کے اسٹال تک چلا
 گیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی لب کاٹتی رہی۔ وہ جواب
 نہیں دے گی یہ طے تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا تا کہ وہ
 جواب میں پھٹ پڑے اور وہ اسے نکال دے۔
 نہیں۔ وہ چپ رہے گی۔ وہ اسے خود کو نکالنے کی
 معقول وجہ نہیں دے گی۔ تالیہ مراد اگر کڑوی تھی تو
 وان فاح کو یہ کڑوا گھنٹہ پینا ہی پڑے گا کیونکہ یہ
 اس کی اپنی خواہش تھی کہ تالیہ اس کے ساتھ رہے۔ وہ
 صرف اپنا وعدہ بھاری تھی۔

☆☆☆

ملا کہ میں آج مطلع صاف تھا۔ سن باؤ کا گھر
 خاموشی سے کھڑا اپنے سامنے بنے بازار کو دیکھ رہا

”جی۔“
 ”کانی میکر استعمال کے بعد صاف کر دینا اور
 فز پھر نکال کے پھینک دینا۔ یاد سے۔“ ”خیر
 سے یاد کر لیا تو تالیہ نے بس ایک خاموشی نظر اس پر
 ڈالی۔ (یہ نہیں جانتی کہ ایک دن میں اس کو ٹرمیڈٹ
 کروں گی۔ مگر ایک باڈی وومن کی کو ٹرمیڈٹ کیسے کر
 جاتی ہے؟)

کانی لے کر وہ اندر آئی تو وہ فائزر میں الجھا بیٹھا
 تالیہ لنگر رکھا تو عادی بولا۔ ”ہینکس عہد۔۔۔“
 پھر رکا۔ نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ تاثرات
 پاٹ ہو گئے۔ خاموشی سے مگ اٹھایا اور گھنٹ
 ہرا۔ وہ جان بوجھ کے رک کے اس کے تاثرات
 کیسے لگی۔

”خود بتائی ہے؟“ گھنٹ بھر کے پوچھا۔

”جی سہرا“

”بہت بدمزہ ہے۔ آئندہ مت بنانا۔ نیچے مال
 سے لے آنا۔ اسے گرا دو۔“ ناگواری سے کہتے مگ
 بے دھکیلا اور لیپ ٹاپ سامنے کر لیا۔ ماتھے پہ
 لکھیں اور آنکھوں میں برہمی تھی۔

ملا کہ کی شہزادی کے لیے صبر کے گھنٹ بھرنا
 بہت مشکل ہو گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ جان بوجھ
 کے ایسا کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے وہ خود جاب چھوڑ
 کے چلی جائے۔

”نیچے مال سے لے آتی ہوں سہرا۔“

”اچھی پارلیمنٹ کے لیے نکلیں گے“ جب لے
 آتا۔ وہ کی بورڈ پہ ٹائپ کر رہا تھا۔ بے نیازی سی
 بے نیازی تھی۔ وہ اتنا مصروف تھا کہ اس کے پاس
 تالیہ کو دیکھنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ پلٹ
 گئی۔

فاح کار میں بیٹھ چکا تھا جب وہ کافی کے دو
 گلاس اٹھائے بیک سنبھالتی کار تک آئی۔ عبداللہ نے
 بتایا تھا کہ وہ پارلیمنٹ والے دن راستے میں دھمک
 کاٹی پتا ہے۔ اس نے ایک مگ پکڑ لیا اور دوسرا اس
 کی طرف بڑھا دیا پھر آگے بیٹھ گئی۔ دھڑکتے دل کے

تھا۔ وہاں قطار میں دکانیں اور ریسٹوران تھے۔ باہر کرسیاں میزیں ڈالے بیٹھے لوگ کھانے پینے اور خوش چیموں میں معروف تھے۔

ایسے میں ایک ریسٹوران جون باؤ کے گھر کے عین سامنے تھا اس کے کاؤنٹر کے ساتھ رکھے اسٹول پر داتن بیٹھی تھی۔ کاؤنٹر پر ٹشو کا ڈبار کھا تھا جس سے ٹشو نکال نکال کے وہ آنکھیں پونچھ رہی تھی اور ساتھ کھڑی معمر سبز دامن ہمدردی بھرے تاثرات سے اس کی کھاسن رہی تھی۔

”نہ وہ پیسے بھیجتا ہے نہ ملنے آتا ہے۔ اتنے بڑے آدمی کی نوکری نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا ہے۔“

موٹے موٹے آنسو صاف کرتی وہ گیلی آواز میں بتا رہی تھی۔ سر پر اس کا رقبہ لپیٹے داتن پد کا ایک دکھیا ری عورت لگتی تھی جس کے غم دوسری عورتوں جیسے تھے۔

سبز دامن نے تاسف سے سر ہلایا۔

”یا اللہ.... آج کل کی اولاد۔“ پھر جیسے رائے دینے لگی۔ ”تم اس کے باس سے کیوں بات نہیں کرتیں۔“

”اس کا باس؟ ہونہ۔ وہ وان فاتح... ممبر پارلیمنٹ کا سالہا ہے۔ اشعر محمود۔ اس سے کیا بات کروں۔ میرے جیسوں کو تو وہ اندر گھسنے ہی نہ دے۔“

”وان فاتح کا سالہا؟“ سبز دامن نے چونک کے سڑک کی طرف دیکھا جس کے دوسری طرف سن باؤ کی حویلی تھی۔

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں زہری سے کہتی ہوں وان فاتح سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ تمہیں معلوم ہے۔“ راز داری سے کاؤنٹر پر جھکی۔

”یہ سامنے والی سرخ حویلی وان فاتح کی ہے۔“

”ایں؟“ ردولی ہوئی داتن نے سر اٹھا کے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر منہ ہٹایا۔ ”ادھر ملا کہ میں اس کی حویلی کہاں سے آگئی؟“

”عین کرومیں کی بول رہی ہوں۔“

”خیر۔۔۔ سو بھی سکتی ہے مگر اس جیسے بڑے لوگ یہاں نہیں آتے۔ وہ تو اپنے غلوں سے ہی نہیں نکلتے۔“ آنسو پھر سے اس کی آنکھوں سے اگلنے لگے۔ ”اور ان کے محلات کی حفاظت میرے جیسے جیسے لوگ کرتے ہیں۔“

”نہیں نہیں وہ آتا ہے۔ رک کے دکان والوں کی خیریت بھی پوچھتا ہے۔ میں نے دو مہینے بعد ایک دن کے لیے آ جاتا ہے۔ ابھی جھپٹے بیٹھے ہی وہ آیا تھا۔“ بتانے والی عورت بھی اور شرور ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد داتن سڑک کنارے چلتی فون کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔

”تھوڑا بہت علم ہوا ہے کہ اس رات وان فاتح نے کیا کیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے داتن۔“ تالیہ اس وقت پارلیمنٹ کی گیلری میں بیٹھی تھی اور فون کان سے لگائے روکھے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ نیچے بیٹھن جاری تھا۔ ڈیک سجے تھے اور نیچے بیٹھے اشعر اور فاتح دکھائی دے رہے تھے جو خاموشی سے ایک سا بھی کی تقریر سن رہے تھے۔

”میں نے ارد گرد لوگوں کو کریدا ہے۔ ایک نے تو سی سی ٹی وی فونج بھی دکھا دی ہے۔“

”اور اس میں تم نے مجھے اندر داخل ہونے دیکھا ہوگا۔“

”ہاں۔ اور بعد میں ایڈم آتا ہے فاتح کو لے کر۔ پھر پولیس والے آتے ہیں اور کچھ دیر بعد تم ایڈم باہر نکلتے ہو مگر تمہارے لباس مختلف ہیں۔“

”اور پھر وان فاتح سو جاتا ہے اور صبح جب اٹھتا ہے تو اس کو گزشتہ رات بھول چکی تھی۔“ تالیہ بے زاری سے دہرا رہی تھی۔ وہ لمبی کتھا سننے کے دوران میں نہیں تھی۔ ”اب گفتیش ایمان داری سے مکمل ہوئی ہے داتن تم واپس جاؤ اور سی سی ٹی وی فونج مجھے بھیج دو۔ میں فاتح کو دکھا دوں گی۔“

”وان فاتح سویا نہیں تھا۔ وہ تمہارے جانے

کے بعد گھر سے نکل گیا تھا اور صبح فجر سے پہلے واپس آیا تھا۔“

تالیہ مراد تیزی سے سیدھی ہوئی۔ فظریہ نیچے بیٹھے
 تالیہ پہ جم گئی جو یہاں سے بہت چھوٹا نظر آ رہا تھا۔

”وہ کھر سے باہر گئے تھے؟ مگر کہاں؟ انہوں نے تو کہا تھا کہ وہ اب آرام کریں گے۔“

”اطراف والوں نے اڑتے اڑتے سنا ہے کہ رات والی قاضی کے ساتھ کوئی چوری چکاری کی روایت ہوئی تھی اور وہ پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ یہ چھوٹا لڑکا ہے اور قاضی مشہور آدمی ہے، ایسی باتیں سمجھی نہیں رہیں۔“

ایک دم سے معاملہ دلچسپ ہو گیا تھا۔ وہ چوکنا ہوئی۔

”داتن... تم معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کیا وہ ہماری رات تھانے میں رہا تھا یا نہیں اور بھی گیا تھا۔“

”میں یہی کرنے آئی ہوں ملاکہ لیکن وعدہ کرو کہ واپسی پہ تم مجھے سب سچ بتاؤ گی۔“

تالیف نے جواب دیے ہٹا فون بند کر دیا۔ پھر اپنا
دوسرا موبائل نکالا اور فاتح کو پیغام لکھا۔

”اس رات آپ کے ساتھ چوری کا واقعہ ہوا تھا اور آپ پولیس اسٹیشن گئے تھے۔ کیا ایسا کچھ یاد ہے آپ کو؟“

نیچے اپنی نشستوں پہ بیٹھے افراد بے زار ہو کے ایک قانون ساز کی تقریر سن رہے تھے۔ ایسے میں وان فاح جو فیک لگائے، گال تلے انگلی جمائے بیٹھا تھا، فون کی تحریر اٹھ یہ چونکا۔ حالم اس کے ان چند کاتیکلس میں تھا جن کے لیے اس نے الگ رنگ ٹون لگا رکھی تھی۔ وہاں موبائل کا استعمال پروٹوکول کے خلاف تھا مگر وہ پروا نہیں کیا کرتا تھا۔ اطمینان سے فون نکالا اور اسکرین کو چھوا۔ پھر جواب لکھنے لگا۔

”ہاں۔ جب میں صبح اٹھا تو میرے دوست
کشنر نے مجھے رات میرے بیان کی ویڈیو بھیج دی۔“

”آپ نے مجھے ویڈیو کے بارے میں پتہ

کیوں نہیں جانتا؟“

”کیونکہ تقیہ میں تمہارا کام تھا میرا نہیں۔“ وہاں
بے نیازی کا وہی عالم تھا۔

”او کے مجھے ویلہ ہو چکیں۔ مجھے وہ دیکھنی ہے، ابھی....“ وہ مانتے ہوئے بل لے کر باپ کر رہی تھی۔

تو وہ ان فاحش اس رات فوراً سویا نہیں تھا بلکہ وہ کچھ کرتا رہا تھا مگر کیا؟

فلاح نے اس کے بتائے ای میل ایڈریس پر
کمشنر کی ای میل بھیج دی۔

تالیہ نے چنڈز فری کانوں سے لگائے اور
میکلری سے باہر نکل آئی۔ باہر ایک خاموش راہ داری
میں کھڑے اس نے وہ ویڈیو دیکھی۔

یوں لکھا تھا وہ ویڈیو اس نے خود کو گلی چٹوٹوں سے مطمئن کرنے کے لیے بنوائی تھی تاکہ جب وہ صبح اٹھے تو اسے رات کے واقعات پر شک نہ ہو۔

اس نے عالم کو ہار کر لیا تھا۔

البتہ ایک خیال تالیہ کا دل بردا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے اتنی محنت سے ویڈیو بنوائی تاکہ جب فاتح صبح جاگے اسے بھولے سے بھی ماضی کی کرید نہ ہو۔ وہ تالیہ کو اپنے لاشعور سے بھی نکال پھینکنا چاہتا تھا۔ واہ فاتح صاحب..... واہ..... اس نے بہت سے آنسو اعدا اتارے اور کانوں سے ہینڈ فری فونج ڈالا۔

سامنے لفٹ کے دروازے کھلے اور قاتح
عثمان کے ہمراہ آنا دکھائی دیا۔ ایک تھکا دینے والے
طویل سیشن کے بعد وہ یقیناً تھک چکا تھا۔

”آپ کا انرجی باز سر!“ ایک انرجی بار ایجنٹ
سیاہ ذنبیل سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ قار
نے بار تھما، اس کو الٹ پلٹ کے دیکھا، پھر ایک
خاموش نظر تالیف پہ ڈالی اور بولا۔

فریش ہوں۔“ بے زاری سے کونے میں رکے

ڈسٹ بن میں بار اچھا ل دیا اور راہداری کا موڑ

کیا۔

تالیہ کے گال دیکھنے لگے۔ اندر موجود شہزادی نے کہا کہ لعنت بھیجو اس نوکری پہ اور ابھی اسے مغرور آدمی کے منہ سے دے مارو.... مگر پھر اس نے کڑوے گھونٹ بھر گئے۔

اگر اس کے ہاتھ لگانے سے ہر چیز فاتح کے لیے زہریلی ہو جاتی تھی تو راپا چینی کی بیٹی کی طرح اس سیاست دان کو بھی اس زہر سے Immune ہونا پڑے گا۔ اس نے زور سے ہنسنے لگا اور اس کے پیچھے ہوئی۔

☆☆☆

اس صبح ابھی آفس میں معمولات کا آغاز ہی ہوا تھا کہ لفٹ کے دروازے کھلے اور عمرہ بھٹ محمود اترتی دکھائی دی۔ راہ داریوں میں فائلیں اٹھائے آتے جاتے لوگوں نے مڑ مڑ کے اسے دیکھا مگر وہ ساٹ تاثرات چہرے پہ سجائے سیدھ میں آگے بڑھتی گئی۔ اسکرٹ کے اوپر کوٹ پہنے سر کو اسٹول سے ڈھانے اسٹول کا ایک سر اسانے اور دوسرے کو پیچھے ڈالے وہ ہمیشہ کی طرح مغرور اور طرح دار دکھائی دیتی تھی۔ راستے میں ٹھان نے اسے دیکھا تو فوراً سامنے آیا۔

”مسز عمرہ.... خوش آمدید۔ فاتح صاحب کانفرنس روم میں ایک دوست کے ساتھ ہیں اور....“

”میں اس سے ملنے نہیں آئی۔“ بے رخی سے کہہ کے آگے بڑھ گئی۔ ٹھان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اشعر اپنے بی این کے چھوٹے سے آفس میں موجود تھا اور میز کے پیچھے کھڑے کھڑے کاغذات پہ سائن کر رہا تھا، کو یا بیٹھنے کا وقت بھی نہ ہو، جب دروازہ کھلا اور عمرہ اندر داخل ہوئی۔

اشعر نے محض نظر اٹھا کے دیکھا پھر دوبارہ کاغذوں کی طرف جھک گیا۔ جڑے کی رگیں البتہ بھٹی گئی تھیں۔

”رہی نے کہا کہ تم آج اس آفس میں ملو گے۔“

شکر ہے یہاں مل گئے ورنہ تم سے ملاقات کے لیے تو لگتا ہے اب وقت لینا پڑے گا۔“

”مبالغہ آرائی سے کام مت لو“ کا کا۔ کوئی کام ہے تو بتاؤ۔“ وہ خشک انداز میں کہتے ہوئے جھک کے کھانا کھٹ دستخط کر رہا تھا۔ عمرہ نے زور سے پرس میز پہ رکھا، کرسی چینی اور بیٹھی۔ پھر چبھتی ہوئی نظریں اشعر پہ جمادیں۔

”تم نے معلوم کیا کہ گھائل غزال کا خریدار کون تھا اور اسے کس نے بھیجا تھا؟“

”کا کا! تم کیوں بھول جاتی ہو کہ میرے پاس ایکشن کے علاوہ کسی چیز کا وقت نہیں ہے۔“

”اور تم کیوں بھول جاتے ہو کہ کسی نے تمہاری بہن کی گیلری میں ایک جعلی عرب شہزادے کو بھیجا تھا۔“

”وہ گیلری جو تم نے میرا حق مار کے لی تھی؟“ اشعر نے جھکے جھکے آنکھیں اٹھا کے کاٹ دار انداز میں اسے دیکھا تو وہ کچھ بول نہ سکی۔ پھر اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ آگے کو جھکی اور غرائی۔

”مجھے اس وقت اس گیلری کی ضرورت تھی۔ تم اپنی بہن کے لیے اتنا پرانا بغض سنبھال کے بیٹھے ہو؟“

”اور مجھے اس وقت تمہاری غیر مشروط سپورٹ چاہیے“ کا کا۔ لیکن تم اپنے شوہر کو روک نہیں سکتی۔“ اس نے زور سے فائل بند کی اور سیدھا ہوا۔ چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

”اف ایٹس... وہ برسوں سے اس کرسی کی تیاری کر رہا ہے۔ میری امید تو دکانیں چلنے اور ضمیر ڈوبنے سے ختم ہو گئی مگر وہ تو ابھی تک وہیں ہے۔“ کسی آدمی کے خواب اس سے چوری کیسے کیے جاتے ہیں تم مجھے سکھا دیتے تو وہ بھی کر لیتی۔ اس سے زیادہ کیا کروں میں تمہارے لیے؟“

”میرے لیے؟ مائی فٹ۔“ وہ غرایا۔ ”میرے لیے کچھ نہیں کیا تم نے؟“ کا کا۔ سب کچھ اپنے لیے کیا ہے۔ اپنے خاندان کو ایکشن کی آلودگی سے دور رکھنے

کے لیے اپنے جینی سکون کے لیے۔“

”ہاں کیا ہے میں نے سب اپنے لیے تو پھر تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ جب سے اس نے ایکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہے تم نے مجھ سے اپنا رویہ کیوں بدل لیا ہے؟“ اس کی آنکھیں بھگینے لگیں۔

”میں بیک وقت کئی محاذوں پہ لڑ رہی ہوں“ ایٹس۔ میں تمہاری وہی بہن ہوں جس نے اتنے سال تمہارا خیال رکھا ہے۔“

”مگر میں تمہارا وہ بھائی نہیں رہا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اسے روک لوگی۔ میں نے اتنے ماہ تمہارے وعدے کے بھروسے پہ تیاری کی اور اب تم کہہ رہی ہو کہ تم بے بس ہو۔“

”میرے بس میں ہے بھی کیا؟“ وہ بھگتی آنکھوں کے ساتھ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اشعر چند لمحے کھڑا اسے چھپتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ”تم آجنگ سے کہو اگر اس نے ایکشن لڑا تو اسے تمہیں طلاق دینی ہوگی۔ اسے تمہیں اور چیئر مین شپ میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا۔“

عصرہ چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر ٹشو پیپر کے باکس سے ایک ٹشو کھینچا، اسے موڑ کے نوک بنائی۔ آنکھوں کے کنارے اس کی نوک سے صاف کیے اور کھڑی ہوئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور چپا چپا کے کہنے لگی۔

”ابھی میں اتنی بے وقوف نہیں ہوئی کہ تمہاری ہر بات کی اندھی تقلید کرنا شروع کر دوں۔ اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ اور مجھے اس پینٹنگ کا خریدار ڈھونڈ کے دو۔ دو دن میں رزلٹ میری ٹیبل پہ ہونا چاہیے اشعر محمود! ورنہ یاد رکھنا، اگر میں بابا کی جائیداد میں سے اپنے حصے کے لیے کورٹ گئی تو چند ہفتوں میں بٹوارا ہو جائے گا اور تمہاری سب سے قیمتی ملکیت..... بابا کا قلعہ..... ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور تم اس دن کو یاد کر کے پچھتاؤ گے کہ کاش تم نے دو دن میں مجھے رزلٹ دے دیا ہوتا۔ مت بھولنا کہ تمہاری بیوی بہن ہوں۔ تم سے پہلے دنیا میں آئی

تھی تم سے زیادہ چال بازی آتی ہے مجھے۔“ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتی مڑی اور تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ اشعر جواباً کچھ نہ بولا، بس چپ چاپ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر زور سے فائل پرے اٹھا کے دے ماری۔

عصرہ باہر آ کے سیدھی ریٹ روم کی طرف آ گئی۔ وہاں ایک ہال میں لمبا سا شیشہ لگا تھا جس کے سامنے قطار میں سنگ بنے تھے۔ وہ ایک سنگ کے سامنے کھڑی ہوئی اور تلے ہاتھوں کا پیالہ رکھا۔ پانی ہتھیلیوں میں بھرنے لگا تو اس نے منہ پہ چھیننا مارا۔

”کیا آپ خوش ہیں مسز عصرہ؟“ منہ پہ پانی پڑنے کی وجہ سے بصارت دھندلی ہو گئی تھی۔ چونک کے چہرہ اٹھایا تو دھندلا گیا سا منظر نظر آیا۔

تالیہ اس کے قریب سنگ سے ٹیک لگائے سینے پہ بازو لیٹے کھڑی تھی۔

”سوری؟“ عصرہ نے پیپر ٹاول سے چہرہ تھپتھپایا اور دوبارہ دیکھا تو منظر واضح ہوا۔ وہ سر پہ ترجھی سفید ہیٹ جمائے آج نیلا پھول دار فراک پہنے ہوئے تھی اور آنکھوں میں ڈیروں سادگی لیے عصرہ کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ خوش ہیں مسز عصرہ؟ اور مطمئن بھی؟“ باہر سے آتا فالح اس آواز پہ دروازے کے دوسری طرف رک گیا۔ عثمان نے سرگوشی کی تھی کہ جذباتی انداز میں اس نے عصرہ کو اشعر کے آنس سے ٹپکتے دیکھا ہے تو فوراً اس طرف آیا تھا۔ مگر چونکہ یہ لیڈیز ریٹ روم تھا اسے باہر ہی رکتا پڑا۔

”خوش؟ مطمئن؟“ عصرہ آٹھنے میں خود کو دیکھتے ٹشو سے آنکھ کے کنارے پونچھنے لگی۔

”آپ نے اس روز مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ میرے سیاسی عزائم بھی ہیں۔ ایک زمانے میں میرے سیاسی عزائم نہیں تھے۔ میں اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن تھی کہ میری زندگی

قابل رشک نہیں تھی۔“ وہ اطمینان سے ایک لگائے کھڑی کہہ رہی تھی۔ عصرہ خاموشی سے اپنا میک اپ صاف کرتی رہی۔ وہ آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اس کا تالیہ سے کوئی بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

”مگر پھر میں نے اپنے بابا کو دیکھا۔ وہ بہت دانا سیاست دان تھے۔ ایک دنیا پہ حکمرانی کرتے تھے مگر وہ خوش اور مطمئن نہ تھے۔ ان کے اندر بہت آگ تھی۔ ہوس، عزم، طاقت کی خواہش اور پھر میں نے جانا کہ خوش اور مطمئن لوگ دنیا پہ حکمرانی نہیں کر سکتے۔ کسی ملک کو صرف وہی چلا سکتا ہے جو نہ اپنی زندگی سے خوش ہو نہ اپنے معاشرے سے مطمئن۔ جس کے پاس ٹوٹا ہوا دل ہو، وہی اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کے ارادے سے لگتا ہے اور ان کے دلوں پہ حکمرانی کرنے لگتا ہے۔“

وہ بولے جا رہی تھی اور عصرہ اپنے عکس کو دیکھتی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

”مگر جب کسی کی مشکلیں دور ہو جائیں اور اسے بے پناہ خوشیاں مل جائیں تو وہ نیز اس شخص کو Productive نہیں رہنے دیتا۔ آسانیاں اور راحتیں انسان کو نکما بناتی ہیں۔ بڑے مقاصد کے لیے جینے والے.... بڑی بڑی تحریکیں چلانے والے...“

ان سب کے دلوں کا ٹوٹا ہوا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ وہ دوسروں کا غم سمجھ سکیں۔ میں اب خوش نہیں ہوں۔ دکھی ہوں۔ مطمئن بھی نہیں ہوں۔ محرومی کا شکار ہوں۔ پانے کے بعد چھین لیے جانے کی محرومی۔ اس لیے اب میں اس تحریک کا حصہ بننا چاہتی ہوں۔ اس آفس میں کام کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میں بالکل بھی خوش نہیں ہوں۔ کیا آپ ہیں؟“

کمرے میں لگے ڈھیروں آئینے ہر کونے میں ان دونوں کا عکس دکھا رہے تھے۔ ہیٹ والی لڑکی سنک سے ایک لگائے کھڑی تھی اور عصرہ ابھی تک آئینے میں دیکھتی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤں کی ڈبی بند کی اور تالیہ کی طرف گھومی۔

”اس سیاست نے مجھ سے میری بیٹی بچھین لی۔ مجھے خوشی اور اطمینان کا اب کچھ بھی کیا ہے۔“

زہر خند لہجے میں بولی اور مڑ گئی۔

باہر کھڑا ان قانع آہستہ سے پلٹ گیا۔ عصرہ کو اس کی ضرورت نہیں تھی وہ جان گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کام سے اس کے آفس میں آئی تو دیکھا وہ لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کر رہا ہے اور اس کی کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

قانع نے آج بھی اس کی لائی کافی کو چھوا نہیں تھا۔ اس کے دل کو دھکا سا لگا مگر ضبط سے سپاٹ چہرے کے ساتھ اندر آئی اور فلیٹ کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ اسے وہاں رکھی قانکر کی ترتیب دینی تھی۔

”تمہیں کیوں لگتا ہے کہ خوش اور مطمئن لوگ اچھے حکمران نہیں بن سکتے۔“

ہیٹ والی لڑکی آواز پہ چونک کے مڑی۔ وہ ٹائپ کرتے ہوئے عینک لگائے اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔

(تو اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ کیا کھرا آدمی تھا۔ دو منٹ بھی نہیں چھپا سکا اس بات کو۔)

”کیا مجھے غلط لگتا ہے سر؟“

”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اتنی معقول بات تمہارے ذہن میں کیسے آئی؟“ وہ اس کو آواز عقل مند نہیں سمجھتا تھا یہ تو طے تھا مگر انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ وہ مسکرا دی۔

”مجھے کسی نے کہا تھا ایک مرتبہ کہ خوش اور مطمئن لوگ حکومت نہیں چلا سکتے اور میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ اب مانتی ہوں۔“

”کس نے کہا تھا؟“ وہ مصروف سے انداز میں بدستور ٹائپ کرتے پوچھ رہا تھا۔

”تھا کوئی خود غرض انسان۔“ وہ گہری سانس لے کر پلٹ گئی اور ڈسٹر اٹھا لیا۔

”تم خوش اور مطمئن کیوں نہیں ہو اپنی زندگی سے؟ ہر چیز تو ہے تمہارے پاس۔“ خود غرض انسان

ایسے جیسے جھیل کے پانی پہ سنہری کرفوں نے
سونے کا خول چہ حار کھا ہو۔ اور اس دیکھتے پچھلے
سونے کے اندر ایک منہرا انہرا نجر کے محدود ہو رہا
تھا۔

سنہرا چمکتا تاج اس کے سر پہ بٹا تھا اور تاج
کے پیچھے سے نکلتا سرخ رنگی کپڑا اس کی کمر تک گرا
تھا۔ پاؤں کو چھوتا کام دار سرخ لباس بنے، وہ قد نیم
ملا کہ کی اس سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ کئی پہ
خالی نوکری لٹکی تھی۔

یہ سن باؤ کی حویلی کے سامنے بنی سڑک تھی جس
کے دوسری جانب درختوں سے مزین بنرہ زار تھا۔
وہاں جگہ جگہ جنگلی اور دیسی پھول گئے تھے۔ تالیہ ایک
بودے کے سامنے رکی اور جھک کے پھول توڑنے
لگی۔ دفعتاً درختوں میں ہلچل ہوئی۔ اس نے جھکے
جھکے گردن اٹھائی، پھر مسکراتی ہوئی سیدھی ہوئی۔

”آپ آج جانا نہیں گئے تو آگے؟“
وہ سامنے سے گھوڑے کی باگ تھاے چلا آ رہا
تھا۔ جواب دینے کے بجائے پہلے مسکرا کے سر کو
خصوص انداز میں جنبش دی۔

”شہزادی سلام۔“ پھر قریب چلا آیا۔ سفید
کرتے یا جامے میں ماتھے پہ بال بکھیرے قدم
اٹھا تا غلام شہزادی کو وہاں دیکھ کے جیسے مفلوظ ہوا تھا۔
”آپ نے آج مجسمہ بنانے کا کام نہیں کیا
شہزادی؟“

”ایڈم اندر ہے اور کام کر رہا ہے۔ میں باہر
پھول توڑنے آئی تھی۔“

وہ اس کے قریب آچکا تھا۔ دونوں اب آسنے
سامنے سڑک کنارے درختوں تلے کھڑے تھے۔
فانچ نے گھوڑے کی ہاگ اب تک تمام رکھی تھی۔
نظریں جھکا کے پھولوں کی نوکری کو دیکھا اور مسکرایا۔
”اور تمہیں لگتا ہے کہ میں آسانی سے یقین کر
لوں گا کہ تم یہاں صرف پھول چٹنے آئی ہو۔“

(باقی آئندہ ماہ)

نے سوال کیا۔
”ہر چیز ہونے سے کوئی خوش ہو سکتا ہوتا تو
شہزادیاں سب سے زیادہ خوش ہوتیں سر۔“
”تم ناشکری ہو لڑکی!“ وہ گہری سانس لے کر

کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ چپ چاپ فولڈرز صاف کر
کے صلیف کے اندر رکھتی گئی۔ یکدم چھناکے کی آواز آئی
تو وہ کرنٹ کھا کے پٹئی۔ فانچ بے دھیانی میں کرسی پہ مڑا
تو ہاتھ کافی کے مگ کو لگا۔ مگ میز پہ اونداھا ہو گیا جسے
اس نے تیزی سے تھام لیا۔ مگ خچ گیا مگر کافی میز پہ
گر گئی۔

”اس کو یہاں سے ہٹا لینا تھا، ناشہ!“ وہ
قدرے کوفت سے بولا۔ کافی ہاتھ کی پشت پہ بھی
گری تھی مگر صد شکر کہ اب تک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔
تالیہ تیزی سے وہاں آئی اور جلدی سے ٹشو پاکس سے
ٹشو کھینچ کر نکالے۔ فنانچ میز صاف کی۔ دو ٹشو سے
فرش پہ گرے مانع کو ڈھانپا۔ پھر فانچ کو دیکھا جو ہاتھ
کی لپٹی پشت کو بے زاری سے دیکھ رہا تھا۔ پاکس دور
تھا اور وہ ٹشو نہیں نکال سکتا تھا۔ تالیہ نے پاکس کے
بجائے اپنا بیگ اٹھایا جو صلیف پہ رکھا تھا اور اندر سے
ٹیلے واپس کا پیکٹ نکالا۔ مویجے کی خوشبو والے
واپس دان فانچ کے پسندیدہ تھے۔ اس نے پیکٹ
کھولا تو ایک دم سارے میں مویجے کی خوشبو پھیلنے
لگی۔ اس نے ادب سے پیکٹ سامنے کیا۔

”جاؤ، ناشہ! میں خود کر لوں گا۔“ سرد مہری سے
واپس کو جھٹکا اور آگے بڑھ کے ڈبے سے سوکھے ٹشو
کھینچے۔ پھر انہی سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

تالیہ کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ مویجے میں
جیسے ایک دم کافور کی بو بھل گئی۔

وہ چپ چاپ کام سمیٹ کے باہر نکل گئی۔ نہ
کوئی سخت جواب دیا، نہ لمحے کا اظہار کیا۔ اسے دکھ ہوا
تھا۔

باہر کرسی پہ بیٹھے اس نے ہتھیلیوں پہ چہرہ گرا دیا
اور درخشے کی دیواروں سے بنے کیمین کو دیکھنے لگی۔
ان کے شیشوں پہ مختلف رنگوں کی روشنی پھری تھی۔

جب بھی آتا ہے وہ میرے دھیان میں
پھول رکھ جاتا ہے روشن دان میں

گھر کے بام و درنئے لگنے لگے
حسن ایسا تھا مرے مہمان میں

عکس تیرے، تیری خوشبو، تیرے رنگ
بس یہی کچھ ہے مرے سامان میں

تتلیاں کمرے کے اندر آ گئیں
ایک پھول ایسا بھی تھا گل دان میں

جب درخت انگنائیوں کے کٹ گئے
دھوپ اتر آئی ہے ہر دالان میں

تیرا چہرہ آئینے کے سامنے
اور آئینہ تئے امکان میں

ہاڈب قریشی

رعونوں میں نہ اتنی بھی اتہا ہو جائے
کہ آدمی نہ رہے آدمی، خدا ہو جائے

اسی کے پاس ہو سب اختیار بولنے کا
اور اس کے سامنے ہر شخص بے صدا ہو جائے

گہرے ہوئے ہیں عجب عہد بے یقینی میں
خبر نہیں کہ کہاں، کس کے ساتھ کیا ہو جائے

تعلقات میں گنہائیں تو ہوتی ہیں
ذرا سی بات پہ کیا آدمی خفا ہو جائے

ہم اہل حرف بڑے صاحب کرامت ہیں
ہمارے ہاتھ میں پتھر بھی آئینہ ہو جائے

کہیں تو منزل صبح یقین ملے عارف
کہیں تو ختم گمانوں کا سلسلہ ہو جائے
سید عارف



تیری صدا غزل سرا سماعیں سجا گئی
دیارِ دل بسا گئی، محبتیں سجا گئی
بچھڑ گیا کبھی سکوں، شکست کھا گیا جنوں
تیری وفا غزالِ شب، چراغِ رہ جلا گئی

خاک زادے کا عشق،

رہ و فانیں جا بجا، رکاوٹیں ہزار ہا
امامِ دل تری دُعا، رکاوٹیں ہٹا گئی

خیال سی بے مثال لڑکی
آپ ہی وہ اپنی مثال لڑکی

رکا ہوا خیال تھا، جمود تھا ملال تھا
تری زباں کی چاشنی، بیاں تیا بنا گئی

اُن دیکھا سا، انجانا سا احساس اس کا
پاکیزگی کا پیرا بن لباس اس کا

سخن شناس تھی نظر لکھا تھا جو مٹا دیا
تری کتابِ حیاں تھی جو طر مرا لبھا گئی

سوہنی کا حُسن ماند اس کے سامنے
شیریں کا کوہِ کن غلام اس کے سامنے
تمکنت اس کی بیاں کیسے ہو

وصالِ شب کی داستاں، عجب کمالِ فنِ بنی
تیرے لبوں کی تازگی، مصوری سکھا گئی

ذہیر فیصل عباسی

عشقِ حُسن کا مہماں کیسے ہو
میں ارضی، میں فانی، میں خاکِ زلزلہ
کیسے کر دں اس سے چاہت کا ارادہ

جولاءِ مقصود



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ لہذا جب تمہیں اختلاف نظر آئے تو بڑی جماعت کا ساتھ دو" (ابن ماجہ)

اسلامی مساوات،

حضرت عمرؓ نے غلہ میں بیت المقدس کی فتح کے بعد فوجی افسروں اور عمال کے ساتھ کئی دن تک قیام کیا۔ ایک دن حضرت بلالؓ نے دیکھا کہ فوجی افسر پرندہ کا گوشت اور میدے کی روٹیاں کھاتے ہیں مگر عام سپاہیوں کو معویٰ کھانا نصیب ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔

حضرت عمرؓ نے افسروں سے اس سلسلے میں جواب طلب کیا۔ افسروں نے بتایا۔
"امیر المؤمنین! جتنی لاگت میں عمارتیں روٹی اور کھجور ملتی ہے، اتنی ہی لاگت میں یہاں پرندوں کا گوشت اور میدے کی روٹیاں مل جاتی ہیں۔"
اس معقول جواب پر حضرت عمرؓ نے زیادہ گفت و شنید مناسب نہیں سمجھی لیکن یہ حکم دے دیا کہ ہر سپاہی کو تنخواہ اور مالِ کفایت کے علاوہ کھانا بھی ملنا چاہیے۔

نور آمنہ فدائی

دنیا سنور جاتے گی،

مجھے وہ بات یاد آ رہی ہے جو شاید میں نے ٹی وی پر سنی ہے کہ ایک اخبار کے مالک نے اپنے اخبار کی اس کاپی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جس میں

دنیا کا نقشہ تھا۔ اس نقشے کو تیس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے پانچ سال کے کمسن بیٹے کو آواز دے کر بلاتا اور اس سے کہتا کہ "لو مجھے یہ دنیا کا نقشہ ہے جو ٹکڑوں میں ہے اسے جوڑ کر دکھاؤ۔"
اب وہ بے چارہ تمام ٹکڑے لے کر پریشان

ہو کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اب سارے ٹکڑوں کے پارے ہیں کہ کون کہاں پر ہے، میرے جیسا بڑی عمر کا آدمی بھی نہیں جانتا ہے۔ وہ کافی دیر تک پریشان بیٹھا رہا لیکن کچھ دیر بعد اس نے تمام کا تمام نقشہ درست انداز میں جوڑ کر اپنے باپ کو دے دیا۔
اس کا باپ بڑا حیران ہوا اور کہا۔ "بیٹا! مجھے اس کا راز بتاؤ، کیونکہ اگر مجھے اس کو جوڑنا پڑتا تو میں نہیں جوڑ سکتا تھا۔"

اس پر اس کے بیٹے نے جواب دیا۔ "بابا جان! میں نے دنیا کا نقشہ نہیں جوڑا بلکہ نقشے کے دوسری طرف سیٹھی جلد کا ایک اشتہار تھا اور اس میں ایک شخص کا بڑا سا چہرہ تھا جو شیو کرنا دکھایا گیا تھا۔ میں نے سارے ٹکڑوں کو الٹا کیا اور اس آدمی کو جوڑنا شروع کیا اور چار منٹ کی مدت میں میں نے پورا آدمی جوڑ دیا۔"

اس آدمی نے کہا۔ "بابا! اگر آدمی جوڑ جائے تو ساری دنیا جوڑ جائے گی۔"

(زاویر 2 - اشفاق احمد)

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

۱۔ نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں۔

(لقمان حکیم)

۲۔ مہمان کے آگے کم کھانا پیش کرنا بے مردانہ ہے
افراد سے زیادہ پیش کرنا تکبر ہے۔

گھبراہٹ،

ایک لڑکی ایک میڈیکل اسٹور کے باہر کھڑی اسٹور میں رش کم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرم کے ساتھ بے چینی اور تذبذب کے جذبات صاف جھلک رہے تھے۔ آخر کافی دیر بعد جب میڈیکل اسٹور سے رش ختم ہو گیا تو وہ گھبراہٹ شرماتی اندر داخل ہوئی اور اپنے کاپتے ہاتھوں سے اپنے پرس سے ایک پرچی نکال کر ملنے رکھی اور فرماتے ہوئے بولی۔

”میں ایک اسکول بچہ ہوں۔ میری ایک ڈاکٹر سے شادی طے ہوئی ہے۔ آج ان کا پہلا خط آیا ہے۔ کیا آپ بڑھ کر سنا دیں گے کہ کیا لکھا ہے؟“

موتی مالا،

کسی کے غلوس اور پیار کو اس کی بے وقوفی مدت سمجھو ورنہ کسی دن تم غلوس اور پیار تلاش کر دو گے اور لوگ تمہیں بے وقوف سمجھیں گے۔

اجے لوگوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ انہیں یاد رکھنا نہیں پڑتا یا وہ خود یاد رہ جاتے ہیں۔

جس نے کسی کو اکیلے میں نصیحت کی اس نے اُسے سوار دیا اور جس نے کسی کو سب کے ملنے نصیحت کی اس نے اُسے یگاڑ دیا۔

ماشہ جہانگیر مرالی۔ گھبراہٹ

شکر پارے،

ایک دفعہ ایک چور ایک عزیز آدمی کے گھر جا کھسا۔ عزیز آدمی نے جب اسے دیکھا تو زور زور سے ہنسا شروع کر دیا۔ جب چور نے اس کی وجہ پوچھی تو عزیز آدمی نے جواب دیا۔

”مجھے یہاں دن کے وقت کوئی چیز نہیں ملی تم رات کے وقت کیا نکال لو گے؟“

ایک عورت گاڑی بہت چیز چلا رہی تھی، ایسا ناک اس نے چوک میں کھڑے ٹریفک وارڈن

کو ٹکر مار دی۔ وہ سڑک پر گر کر رہنے لگا۔ عورت کا ریسے یا ہر ٹکلی ادا سے ڈانٹ کر بولی۔

”اب منزل آیا سڑک کے درمیان کھڑے ہونے لگا۔“

ایکشن کے دو امیدوار لیڈروں کا ایک تنگ گلی میں آمناسامنا ہو گیا۔

پہلا بولا۔ ”میں گدھوں کو راستہ نہیں دیتا۔“

دوسرا بولا۔ ”لیکن میں دے دیتا ہوں؟“ وہ ایک طرف ہو گیا۔

ایک عورت بازار سے خریداری کر کے واپس آئی اور اپنے شوہر کو چیزیں دکھاتے ہوئے بولی۔

”یہ کپڑا میں آپ کے رومال کے لیے لائی ہوں۔“

شوہر حیرت سے بولا۔ ”اتنا بڑا کپڑا؟“

عورت بولی۔ ”باقی جو کپڑا بیچ جائے گا اس کی میں سارے بنائوں گی؟“

نورسے محمد۔ بورے والا

لفظ بولتے ہیں،

”معاف کر لے کالم نگار۔“

جائے تو زمانوں کو تلافی میں پانی ہوتا پڑتا ہے۔

”دلوں کے ٹوٹنے کی داستان کون رقم کرے کیونکہ روشنی اور تاریکی میں یکساں منظم وقت تمام شبوں کی سیاہی ابلے لک تدر کر کے بھی دلوں کے مجید نہیں تحریر کر سکتا۔“

وہ بے پناہ مزاحمت بے سمت نہیں ہوتے دیتی بلکہ بے تحاشا تخلیق کا باعث بنتی ہے۔

”غنت اثر دکھتی ہے۔ وہ کتنی ہی خاموش ساعتوں میں ہو۔ دل کے اندر کتنے ہی پردوں میں چھپی رہے لیکن اس کا انعکاس ہو جاتا ہے۔ یہ برقی روشنی طرح دوسرے دل کو چھوئی ہے۔“

نورسے محمد۔ گجرات



پروین ماہرین _____ مانسہرہ
وہ خوش کلام ایسا کہ اس کے پاس نہیں
طویل رہنا بجلی لگتا ہے غنقر رہنا
نادیسیل _____ ہری پور

جیون زہر بھرا ساگر
کب تک امرت گھولیں گے
نہند تو کیا آئے گی دُراز
موت آئی تو سولیں گے

رفت سجاد _____ سیالکوٹ

عشق اتنا بھی کیا ضروری ہے
کوئی بے عشق مر نہیں جاتا
انگلیاں پھیر میرے بالوں میں
یہ میرا دردِ سر نہیں جاتا

سُرت بشر _____ کراچی

آج دل ڈرتے سے ڈرتا ہے
دیکھ ادبیا میں کتنا پانی ہے
ہم نے خود مسکرا کے دکھائے
مسکراہٹ بھی نوحہ خواتی ہے

علیہا ماہرین _____ کراچی

دل ہی تو ہے نہ تنگ و خست درد سے بھرنے لگی
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں
ہاں وہ نہیں وفا پرست! جاؤ کہ بے وفا سہی
جس کو ہودین و دل عزیزی کی گلی میں جلیے کیوں

انعم محمود _____ کراچی

ہمیں ہماری حساس طبیعت نے مار ڈالا
درد نہ پتھر دل ہو کے تو سب کچھ سہہ جلتے

نرہ اتر _____ کراچی
جودل پر نقش ہونا تھا، اسے لکھتے ہیں کاغذ پر
کہاں تحریر کرنا تھا، کہاں تحریر کرتے ہیں
شبنم حنیف _____ لاہور

جیران ہوں سارے شہر کا کردار دیکھ کر
سب ٹھٹک گئے، شاہ کا دربار دیکھ کر
رنگ اڑ گیا ہے مات کے چہرے کا کیوں علم
سہا ہوا ہوں صبح کے آثار دیکھ کر

دورِ غربت _____ بکرات

بس اک فرد اسی بات حق لیکن تمام عمر
وہ مجھ کو جاننے کی سزا دے کے سو گیا
مددِ نورین مہک _____ بکرات

لوگ کیوں بس کے اُجڑ جاتے ہیں، کبھی سوچا ہے
کس لیے جان سے گزر جاتے ہیں کبھی سوچا ہے
جو نظر آتے ہیں آئینہ سی پر شاگوں میں
وہ بھی مٹی میں اتر جاتے ہیں کبھی سوچا ہے
ساحرہ، شازیرہ، بکرت _____ دھڑیل میاںوالی
کہاں اس نے سنی میری، سنی بھی اُن کی گردی
اسے معلوم تھا اتنا، مجھے کچھ اور کہنا تھا

نہا آنند دھانی _____ لاہور

میں آئینہ ہوں کہ عکس کوئی
مجھے خود اپنی خنجر نہیں ہے

نازہ بھٹی _____ پتوکی

مزم غبار کسی کو بنائیں کیا، اس میں بھی خُشابہ انا ہے
جو ساری عمر چپلے ہیں، وہ داز جاتے پڑتے ہیں
ہانا دوق _____ گوجرانوالہ

زندگی تم نہیں کہیں رہنا
میں زمانہ بدل کر آتا ہوں

رموزہ شکیل رائے
کھو ڈاڑھ سے

خزاں کی رُت میں گلاب لہجہ بنا کے رکھنا کمال یہ ہے
ہوا کی زد پہ دیا جلانا جلانے کے رکھنا کمال یہ ہے

ذرا سی لغزش پہ توڑ دیتے ہیں سب تعلق زمانے والے
سوائے ویسوں سے بھی تعلق بنانے کے رکھنا کمال یہ ہے

کسی کو دنیا یہ مشورہ کہ وہ دکھ بھرنے کا محمول بنائے
اور ایسے لمحے میں اپنے آنسو چھپانے کے رکھنا کمال یہ ہے

خیال اپنا، مزاج اپنا، پسند اپنی، کمال کیا ہے!
جو یار چاہے وہ حال اپنا بنانے کے رکھنا کمال یہ ہے

کسی کی رہ سے خدا کی خاطر اٹھانے کے کہنے، ہٹانے کے پھٹنے
پھر اس کے آگے نگاہ اپنی جبکا کے رکھنا کمال یہ ہے

ہزار طاقت ہو، سو دلیلیں ہوں بھر بھی لیے میں عاجزی سے
اصب کی لذت دعا کی خوشبو بھانے کے رکھنا کمال یہ ہے

حمدہ خان
کھو ڈاڑھ سے

تلاش ذات کا سفر آسان نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی اس
ناممکن کی جستجو میں بھٹکتے ہوئے انسان کی عمر تمام ہوجاتی
ہے۔ قاتل شغافی کی یہ عزت قاتلین کی نذر۔

نہ مانے کتنی عمر کے گے اس نادانی میں
اپنے عکس کو ڈھونڈ رہی ہوں کھولتے ہوئے پانی میں

ملے تھے ہر بار نمک سے بنے ہوئے بتلا
اک جیسا انجام تھا میرا ہر طغیانی میں

ساتھ حفر کے پار اترنے آئے تھے کچھ لوگ
وہ دریا میں ڈوب گئے اور میں حیرانی میں

سب کچھ روشن ہے تجھ پر اے سوج توی بتا
دن کو خوشبو کیوں نہیں، موتی رات کی لانی میں

جس سے باہر جانے کی نہیں کوئی راہ قتل
یادوں کا وہ جنگل ہے دل کی ویرانی میں

نمرہ افسر
کھو ڈاڑھ سے

کچھ فتنش بہت گہرے ہوتے ہیں۔ کچھ رنگ بہت
پکے۔ کچھ زخم بھرنے میں بہت دیر لگتی ہے۔ دل ہے
کہ ٹھہرتا ہی نہیں۔ ان ہی جذبول کا اظہار سعد اللہ شاہ
اس غزل میں کر رہے ہیں۔

رنگ اترنے میں بہت دیر لگی
دل ٹھہرنے میں بہت دیر لگی

تیری آنکھوں کی طرح گہرا تھا
زخم بھرنے میں بہت دیر لگی

بات کرنا تھی ذرا سی تجھ سے
بات کرنے میں بہت دیر لگی

کرن

نومبر 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

کرن کا دسترخوان

اب ایک نئے انداز میں

- اداکار ”محمد علی جوش“ سے شاپین رشید کی ملاقات،
- اداکار ”سید فراز رسول“ کہتے ہیں میری بھی بیٹے،
- آواز کی دہائی سے ”اسد چوہدری“ اس ماہ مہمان ہیں،
- اس ماہ ”عابدہ مغل“ کے ”مقابلہ ہے آئینہ“،
- ”فہم غم کی عمر“ رخ چوہدری کا سلسلہ وار ناول،
- ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- ”ساگر کنارے“ ام طہور کا ناول،
- ”جنگ“ شبنم گل کا ناول،
- ”شام رنگ سیاہ“ ایل رضا کا ناول،
- ”ماور“ راجہ افکار کا ناول،
- ”بچ بھلا رانی“ ارہاب گل کا ناول،
- مصباح علی سید، رحمانہ آفتاب، فریدہ فرید، اور مول سلیم کے اگلے اور مستقل سلسلے،

کٹ گئی رات تیرے خوابوں میں
دن گزرنے میں بہت دیر لگی

کب بیٹھا تھا کسی لے مجھ کو
کب بکھرتے میں بہت دیر لگی

زندگی گزری ہے ہر بل میں میری
سعد مرنے میں بہت دیر لگی

اقبلی نامہ

آنکھوں سے خواب اور دل سے تمنا خیمت
ہو جائے تو دل میں سناٹا رہتا ہے۔ ہر شے ایک
رشتہ فانی لیے ہوئے ہے۔ جو وقت کے ساتھ
تمام ہوئی جاتی ہے۔ جن عباس رضا کی غزل نذر ہے۔
آنکھوں سے خواب، دل سے تمنا تمام شد
تم کیا گئے کہ شوق نظارہ تمام شد

کل ترے تشنگان سے یہ کیا معجزہ ہوا
دریا پہ ہونٹ رکھے تو دریا تمام شد

دنیا تو ایک برف کی سل سے سوا نہ تھی
پہنچی ذرا جو آج تو دنیا تمام شد

عشق پر یہ اب کے عجب وقت آ پڑا
مجنوں کے دل سے حسرت لیلی تمام شد

شہر دل تباہ میں پہنچوں تو کچھ کھلے
کیا بچ گیا ہے راکھ میں ادھ کیا تمام شد

ہم شہر ہاں میں آخری نغمہ سنا کے
سجود کہ اب ہمارا تمنا تمام شد

اک یاد یار ہی تو پس انداز ہے من
درد وہ کارِ عشق تو کب کا تمام شد



نانہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendust.com

شمینہ اکرم..... کراچی

میری غیر حاضری کی وجوہات میں سرفہرست میری کچھ سستی، کچھ خرابی طبیعت اور زیادہ تر کھربو مصروفیت رہی۔ پچھلے باہ ہمارے گھر میں خوشیاں ڈیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ میری ننھی پری غنوی اکرم کا رشتہ طے پا گیا ہے۔ رسم بھی ادا کر دی گئی ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھے لوگ ہیں اور پھر اپنے قریبی عزیز بھی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے شعاع اور خواتین کے شوقین اور پرانے قاری بھی..... وہ ڈائجسٹ کے حوالے سے شمینہ اکرم کو بہت اچھی طرح جانتی تھیں مگر جب روپرو دیکھا تو مل کر اتنا خوش ہوئیں کہ جیسے میں کوئی رائٹر ہوں۔ قاری نہیں.....

”ہمارے نام“ محبت بھرے خطوط، چاہت بھرے جواہرات..... ہر ماہ میری توجہ کا مرکز خاص۔ ”کرن کرن روشنی“ میں مستند احادیث مبارکہ سے استفادہ خاص کیا۔ 11 نومبر کو میرے شہید بیٹے معین اکرم کی چھٹی برسی ہے۔

آپ تمام قارئین کرام اور احباب میں سے مائے قدرت کی درخواست ہے۔ اس ماہ کے اسالوں میں علیحدہ نامہ کا اسانڈ ”رشتوں کی چابی“ پھرین رہا۔ یہ سراسر ایک ناول ”ام ایچین“ ابھی یہ کہانی میں نے پڑھا تو روع کی ہے۔ ”عالم“ تمام ہی قارئین دوستوں کو بہت بہت پہنچے آ رہا ہے۔ مگر مجھے تالیف کا اپنے سے دیکھ کر ہر کے دلان فارغ کے عشق میں گرفتار ہونا کچھ خاص پہنچا تھا۔ آ رہا۔ اس سے اچھا تو ایڈم ہے۔ نقص اور ہم غلوں۔ دیکھ دانا فارغ کی گردن میں تو کلف لگا رہتا ہے۔ آپ کا باور پکی ننانہ میں شرکت کا بہت دل چاہتا ہے۔ مگر مصروفیات زندگی میں احمد کا سلسلہ وار ناول ”الف“ ان کے رشتہ باقی ہمارے مہیا سنی شاندار جواب ہے۔ یقیناً یہ ناول بھی واقوں یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر شاہد علی زبانی سے ملاقات خوب رہی مگر اپنے اندر دلوں میں آپ یہ ضرور بتایا کریں کہ ان کا کھینک کہاں واقع ہے۔ ”بیمال زہرا“ بس کہانی کے ساتھ سائرہ رضا کا نام جڑا ہوا، وہ لکھنے پر مجھے اپنے پھرین ہونے کا پتا دیتی ہے۔ زہرا مجھے خوب معلوم لڑکی کا نصیب عاشق جیسے کھنیا انسان کے ساتھ چڑ گیا۔ یہ سب نصیب کے عیال ہیں کہ شہناوی باندی بن گئی..... مگر ایک بات اور ہے۔ زہرا کو اس طرح کسی لڑکے سے چپ کر نہیں مانا چاہتے تھا۔ یہ ناک تھا۔ بہر حال ایک مدت کے بعد بی بی چابی کہانی پڑھنے کو ملی۔ ستمبر میں ایک اور بی بی خوشی مجھے ملی۔ میرا دوسرا بیٹا اسود رہمان بھی حافظہ قرآن بن گیا ہے۔ (ماشاء اللہ) اس نے بہت چھوٹی سی عمر میں اپنا حفظ مکمل کر لیا ہے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میری طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی۔ لعل اور شاہین رشید کو نہ سلام۔

ن: بیاری شمینہ! اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ سب سے پہلے تو آپ کو غنوی کا رشتہ طے ہونے پر مبارک باد..... اللہ تعالیٰ اسے بخیر و خوبی تکمیل تک پہنچائے اور غنوی کو خوشیاں ملیں۔

یہ بہت بڑی سعادت ہے کہ آپ کے دوسرے بیٹے اسود رہمان نے بھی قرآن پاک حفظ کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آپ کا باور پکی خانہ میں ضرور شرکت کریں۔ اب تو آپ نے لگانے بھی لاکر رکھ لیے ہیں۔ تبصرہ کے ساتھ ساتھ باور پکی خانہ کے سلسلے

تبصرہ تو آپ ہمیشہ ہی بہت عمدہ کرتی ہیں۔ کبھی کبھی تو آپ کا تبصرہ پڑھ کر سوچتے ہیں کہ آپ نے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کیوں نہیں دی۔

ٹوبیہ نور..... کشن گڑھ بھاول نگر

”جمال زہرہ“ لا جواب تحریر جیسا کہ سائرہ رضا کا خاصا رہا ہے۔ کہ سائرہ جی کے لفظوں کی جادوگری میں یوں الجھے کہ ارد گرد کا بھی ہوش نہیں رہا تا وقت یہ کہ آخری صفحہ آ پہنچا اور بے اختیار سینے سے گہری سانس برآمد ہوئی۔ معلوم ہوا آغاز سے انجام تک انداز نشست بھی تبدیل نہیں کیا۔ عام سے بھی عام موضوع لے کر اسے لا جواب بنادینا آپ کا کمال ہے۔

”الف“ کی شروعات اچھی ہیں یقیناً ہر آنے والی قسط شان دار ہوگی۔ رویہ نگار سے کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی۔ خوشی ہوتی ہے کہ کوئی تو بونگے پن میں ہمارے آس پاس ہے۔ سسلی، باز کا خط کافی منفرد لگا ان کے خیالات و اعتراضات سے قطع نظر الفاظ کا چناؤ چونکا گیا انہیں لکھنے کی طرف متوجہ کریں۔ تکبیر رحمان والے ناول کی رائٹر تنزیلہ ریاض ہیں۔ واقعی میں ان کی باقی تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی لا جواب تھی۔ تنزیلہ مزاح بھی تو بہت اچھا لکھتی تھیں پلیز ہو جائے صوفی وادارنگ میں ایک آدھ تحریر اور ہاں ایک فرمائش میری طرف سے بھی۔ پلیز تنزیلہ ریاض اور عمیرہ سید کا ٹکڑا سائبرویو کریں۔

بہت جانتے ہوئے چاہ ہم سے، مگر کرو گے نواہ ہم سے؟ ذرا ملاؤ نگاہ ہم سے، ہمارے پہلو میں آ کے بیٹھو شاعری ہو یا کالم، الگ ہی جاشنی ہے انشائی کے کلام میں۔ لکھا تو اور بھی بہت کچھ جاسکتا تھا مگر کیا کیجیے کہ طبیعت نام ساز ہے اور مزاج نام ساز تر، وہ تیرا شاعر کہ بیمار بھی دلگیر بھی ہے۔

ن: پیاری ٹوبیہ! ہر حساس انسان کا یہی حال ہے جو آپ کا ہے۔ دل گیر تو ہم بھی بہت ہیں، جن غریب لوگوں کے گھر سہار کیے گئے ان کی چیخ و پکار، معصوم بچوں کا رونا، غھروں کے سامنے سے یہ منظر ہٹا ہی نہیں۔ یہ ایکشن تو اس وقت ہونا چاہیے تھا جب ان مکانات کی پہلی ایٹ

رکھی گئی تھی اور پھر کچھ لوگوں کے ساتھ رعایت کیوں.....؟ بہر حال یہ زندگی ہے یہاں بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ کوشش ہمارا کام اور نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بات صرف عمل اور نیت کی ہے۔ آپ کس کے ساتھ ہیں؟ اصل دار و مدار اسی بات پر ہے۔

تنزیلہ اور عمیرہ کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔

اقراء ممتاز..... سرگودھا

اس دفعہ خواتین میں پورے سال بعد لکھ رہی ہوں۔ مجھے تو کسی نے یاد بھی نہیں کیا (چلو کوئی گل نہیں) ٹائٹل گرل بہت خوب صورت لگ رہی تھی شاہین رشید کا شکریہ جنہوں نے آئمہ بیک کا انٹرویو لیا۔

سب سے پہلے عمیرہ احمد کا ناول پڑھا۔ فنکارانہ کمیزنگ۔ عمیرہ احمد جب بھی لکھتی ہیں، کچھ منفرد لکھتی ہیں۔ قلب مومن اسٹوری کی جان ہے۔ ”حالم“ نمرہ احمد کے کیا کہنے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ وہ ان قاصد کو سب یاد ہے کہ تالیف اس کی بیوی ہے۔

ام ایمن سیر احمد کی اسٹوری بھی فنکارانہ تھی۔ مگر دیسا نام پسند نہیں آیا۔ لیکن دیسا کی ایک بات پسند آئی کہ جب کسی کو سزا دی جائے تو پھر سنجیدہ رہا جائے ورنہ سزا ایک مذاق بن کر رہ جائے گی۔

دل ہی تو ہے ایک اور بناء کریم کی لڑائی جھگڑے اور ان کی کھٹی مٹھی لو اسٹوری مزہ دے گئی۔

افسانے سارے ہی بیٹ تھے خاص کر کے ”دل عشق میں“ بازی لے گیا۔ ”مسٹر اسائل“ ایک اچھی اسٹوری تھی۔

ن: پیاری اقراء! ایسے نہ سوچیں کہ کسی نے یاد نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اظہار نہیں کیا۔ دراصل ہم کسی کا نام پرچے میں دے کر اسے یاد کریں تو اس میں بھول چوک کا امکان ہے۔ وہ قارئین جن کے نام نہیں دیا گیا۔ انہیں شکایت ہوگی۔ اس لیے ہم کسی قاری، بہن کا نام نہیں لکھتے۔

ایک سال کی غیر حاضری کے بعد آپ کی آمد پر خوشی ہوئی۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے

روز بروز شمع، یا کچھ ساہوکار، یا مہمانی کھپائی کو چرا لیا۔
 چار ہاکمال، رات کو ایک ساتھ، دل خوشی سے کیا
 ہو گیا۔ سب سے پہلے جمال زہرا جیسی، اب انکاظم کوئی
 انسان ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کھپائی کیسے، خیر پہ چار سے
 ہر توڑس ہی آتا۔ کرم اچھا تھا چار۔ کچھ توڑس کئی، عہد اللہ
 فضل کا دارا کچھ سوچ کر تو فیصلہ کرتا۔ ایک بہت ہی اچھی
 اسٹوری۔ آخر میں ہر توڑس کو لے کر آواز ہر کی شادی
 و دارہ ہو کی کہ توڑس خیر ہے۔ سب عاشق ہیں کتنی بھری
 زہرہ کہتا تھا کہ "تیرا اس میں ہوں۔" دل کرنا تھا کہ
 چھوڑ دوں اس پر۔ سارہ ہی کسی کے کمال ہو۔ عالم انکا
 کوئی مزہ توڑس دے رہی۔ آئیں توڑس سے ہار اور دل
 اچھل اچھل کیا سب "دھنک کے دھنک" کو دیکھا اور
 ہر حال شروع کرنے سے پہلے ہی دھنک ٹوبہ ہی پھر ہر
 ہر سے ہوئے ہی آئی وہ اللہ۔

ام آئیں ہر ہر کر یقین ہی توڑس آیا۔ اچھا چھوڑ لی گئی
 لکھ سکتا ہے۔ ہر دارہ جوئی کی اتنی پر ہر ہی۔ ہا چل کا
 مٹھو جوئی کی ہر "تیرا ہر کی ہر" چلی کی کھپائی۔ اس کی
 مسکراہٹ سب کچھ دل بند کرنے والا تھا۔ دیکھا کا آہستہ
 باپ کی لالی ماں کی ہاتھیں کھائی کے مناظر اللہ اللہ۔ دیکھا کا
 یہ تیار کیوں ہوئی اتنی جلدی چھپتی یہ تیار ہی۔
 اللہ میں دھنکی ہر ہر دھنکی ہے۔ قلاب ہر ہر کی
 معصوم ہاتھیں، اللہ کو خدا۔ یقین چاہتے کرتا ہے۔ ہر اس کی
 ہے چینی کی داستان دل کو کھانے والی ہے۔
 نفسیاتی انجمنیں ہر ہر کر لٹوس، وہ اپنی بہن ہے۔ صلح
 کر لیں تو انہی بات ہے۔ اسانے سارے اچھے تھے مسٹر
 اسکل بھی بہت اچھا تھا۔

یہ روز بڑے پاکیزہ اور ام ہائی آپ نے بہت اچھا
 خدا لکھا، ہر کھپائی کی تھیں ہی تھیں۔ بہت شکر ہے۔

ماہا شیر..... ڈاک

ہاگل اچھا تھا۔ آہستہ سے ملاقات انہی۔ ہی، ڈاکٹر
 شہد علی اور قریب آئیں کا انکو بھی پند آیا۔ "اللہ" میرا نام
 کا چھینج آ کے چل کر اچھے سے اچھا ہو گا۔ "عالم" میرا نام ہی
 بہت عجیب کا کہ ہم آپ کے گھر کو پند کر رہے ہیں، تالیہ

کے لیے پند لیا، کچھ پند لیا، سارا ہے۔ "ام آئیں"
 کچھ اچھا کھپائی آئی ہے کچھ دھنک، کچھ دھنک ہی
 کئی آئی ہے، انکاظم انکاظم کچھ دھنک ہے۔ ان کا نام
 خیر لیا، دھنک کچھ، کئی آئی۔ ہاگل ہی، ہاگل
 کی خیر لیا، کچھ، ہاگل۔ ہاگل انکاظم، "ہاگل"
 ہے۔ "خیر دھنک کئی لیا" ہے کئی دھنک لیا، ہاگل اچھا
 اسانے ہر ہر اچھے چھے، عفت و ہر ایک ہی انکاظم
 ہیں؟ ہاگل لکھیں، ہاگل لکھیں ہی۔

ہاگل چاری ماں، خیر دھنک کئی، دھنک ہی، دھنک ہی
 چلی ہی اللہ ہی ہیں۔ شاید آپ کی نظر سے لڑیں، دھنک
 خیر لیا۔ کچھ اچھا لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے
 ہے۔ ان کا ہاگل بہت ہی خیر لیا، ان کے ہی، دھنک
 میں تھا۔ عفت ہر سے لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے
 ہی کر چلی ہیں اب کچھ آپ کی لڑائی ہی طور سے، ہر
 مانگا ہے ہیں۔

میرا حسین..... ڈاک

اچھے کھپائی لکھنے کا، ہر ہر کی عفت ہی، ہر ہر کی
 کے عالم، ہر ہر کی کام لکھیں ہی، ہر ہر کی ہاگل ہے۔ ہاگل
 ہاگل اچھا لکھنے لے ایک ہاگل شعاع میں کچھ لکھیں
 کے ہر ہر ہاگل اور کرن میں ہی خیر لیا، کچھ لکھیں۔ لکھیں
 دھنک ہے، کچھ لکھیں، ہاگل اور لکھنے لکھنے کر لکھیں۔

آپ ہر ہر کی طرف۔ ہاگل ٹوبہ صورت تھا بہت
 پیارا۔ ایسا نظر لہرست ہر اولی تو دل خوش ہو گیا۔ "میرا حسین"
 کو پا کر۔ (کرن کرن روٹی، ہاگل دل۔ ہاگل اس میں ہاگل
 تھیں دھنک کے متعلق دیں۔ کئی ہاگل اچھا لکھا اور آپ کا
 جواب ہے خدا اچھا لکھا۔ ہر کھپائی میں کی ہاگل ہوتے ہیں، سب
 کا اچھا نظر ہے۔ آہستہ سے ملاقات ہے خدا کئی رہی۔
 (اللہ) کی یہ قسط کئی اچھی رہی (ام آئیں) اور میرا حسین لے
 کمال لکھا۔ کچھ لکھیں ہیں۔ ایسے ہی لکھیں رہیں۔ ہاگل
 (دل ہی تو ہے) لکھ ہی اسٹوری پند آئی۔ اسانے
 (دھنک کے دھنک) رہا کمال سے لے کر دارہ اچھا لکھا۔
 (دھنک کی چالی) عفت کا لکھا کچھ پند ہی آ گیا ہے ہر
 کڈ۔ (مسٹر اسکل) لکھ ہی تھی۔ (دل میں) کئی
 اچھی تھی کڈ۔ ہی۔

جہ پڑاری تبسم! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی کہانیاں قلمی اشاعت نہیں ہیں لیکن ماہوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ کوشش کرتی رہیں۔ کامیاب ہوں گی ان شاء اللہ۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ بہت اچھا تبصرہ ہے آپ پر تفصیل سے ہر سلسلہ اور ہر تحریر کے بارے میں لکھا ہے۔

تابیدہ اسماعیل۔ کراچی

کتنی سخی پڑھ کر دل انداز ہو گیا سب سے پہلے محمود پر بھائی کے لیے دعا کی۔ اس ماہ سلی ٹائز (اوج شریف) کے صفحے ہمیں حیرانی کے ساتھ عجیب سی خوشگوار سی مسرت ملا کر دیا، عجیب سی سچی اور صبر ہے ان کی باتوں میں، وہ ایک ماں ہیں ہم بھی ان کا ادب کرتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور سمجھا گئے کہ اللہ نے ہر انسان کو اس کی فطرت پر تخلیق کیا ہے اس کے بعد ہر بچے کی جہن درساوا ماں کی گود ہے، والدین کی اپنی عادت و خصوصیات اور ہر اچھا برا عمل اور گھر کا ماحول بچوں کی شخصیت کو منفی یا مثبت بنانے میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے، والدین کی سوچ، فی وی جوتو، سوشل میڈیا، مودرن سیک کیوں نہیں جانتی جن میں دکھائی جانے والی بے حد پر آسائش اور فحش لائف، غریب اور سفید پوش طبقے کو خواب دکھائی یا محرومیوں کا احساس دلانی انہیں نفسیاتی مریض تک بنا دیتی ہے یہ رہا ہے وغیرہ تو بہت بعد میں آتے ہیں۔ رسالے تو زندگی کی خوب صورتی اور پرصورتی دونوں ہی دکھا رہے ہیں لیکن آپ بچیوں کو نہیں سمجھا پا رہیں تو مطلب (معذرت کے ساتھ) آپ کمزور پڑ رہی ہیں سچی کمزور محبت بچیوں کے لیے ضرور رسالہ ہے۔ آپنی کیا آپ یقین کریں گی کہ میرے ابو نے مجھے محض چار سال کی عمر میں محلے کی لائبریری کا ممبر بنوایا تھا یہ کہہ کر کہ ”یہ میری بیٹی جب بھی کوئی کتاب لینے آئے، اسے دے دیجئے گا“ انکل حیران ہوئے تو ابو یقین سے بولے ”ہاں اسے پڑھنا آتا ہے اور پتا بھی ہے کہ کیا پڑھنا ہے۔ میں آج بھی یہی سوچتی ہوں کہ دو یقین ایک بچی پر نہیں تھا، وہ ان کا اپنی ذات پر اکتفا اور اس اکتفا میں کبھی ہمارے لیے دو تربیت تھی کہ جس نے ہمیں کبھی خوابوں کی دنیا میں یا خواہشوں کے خاردار راستے پر بھٹکنے نہیں دیا۔ ہم

نے تو ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اس کے علاوہ والدین کی تربیت بھی اسٹرونگ ہونی ضروری ہے۔ زندگی خوب صورت ہے، مگر سچی ہزار نعمت ہے یہ جیسے سیکڑوں بار پڑھے اور سنے، پر جب پڑاری سیرا، بدنی اور دیرسا کی کہانی سنا کر کہیں کہ ”زندگی سے منور آپ کی آنکھ جو یہ سطر پڑھ رہی ہے وہ اپنی جسم سے بس اتنا کہہ دے۔ اپنی زندگی اور ممدوستی کی قدر کیجئے“ تو دل گہری سوچ میں کیوں نہ ڈوبے کیا ”امام یقین“ پڑھ کر بھی ناقص رہ پائیں گے۔

جو زمین پر نہیں ہو سکتا وہ آسمان سے ہوتا ہے۔ آج کا سورج کل کے سورج کے لیے غریب ہو گیا۔ یہ چند جملے تو کیا، پوری تحریر کی تحریف کے لیے ذہن میں بالفاظہ نہیں ہمارے۔

”جمال زہرا“ (زبردست تحریر) کی تو ابھی پارہی لیکن ہمارے خیال میں صرف ”تہ کرہ حسن“ نے ہی فساد نہیں ڈالا تھا۔ بروے میں ٹکٹے والی زہرا خود بھی — تو قصور وار بھی ایک: محرم سے ملنا اس کی فطرتی پلس گمراہ تو تھا ہیں اور شاید اسی فطرتی کی پاداش میں اس بے چاری نے عاشق کی صورت میں دردناک سزا جھیلی۔ ”دھنگ کے رنگ“ کی تو کیا سچی بات ہے ہنس ہنس کے پڑھتے اور پڑھ پڑھ کے ہنستے رہے۔

ج: پڑاری تابیدہ! تبصرہ حسب معمول، حسب روایت شان دار اور جان دار ہے۔ کبھی کہانیاں لکھنے کی طرف بھی توجہ دیں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ آپ نے ہماری ترجمانی کی، اس کے لیے تبدیل سے ممنون ہیں۔

مقدس مثل — لاہور

اس بار خواتین ڈائجسٹ بس ٹھیک ہی تھا۔ ٹائٹل بھی اچھا تھا۔ الف، عالم، جمال زہرا زبردست تھا۔ سلام ہے سب رائٹرز پر۔ آپنی ان ڈائجسٹ کا ہر سلسلہ ہی بہت زبردست ہے۔

آخر میں میری بیٹی کے لیے دعا جو کہ مقدور ہے۔ بہت بڑا دکھ ہے میرے لیے۔ لکھنؤ میں یہاں کرنے سے قاصر ہوں۔ سب بیٹوں سے دعا کی احساس ہے۔ کاش مجھے اپنی بیٹی کی پڑاری پر مبرا آ جائے۔ کیا کسی کے پاس ایسا ام ہے؟

ج: پیاری بہن! اسم اعظم کسی کے پاس سے نہیں ملے گا یہ آپ کے اپنے پاس ہے۔ وہ ہے پورے یقین کے ساتھ دعا۔ اللہ تعالیٰ سے اس آزمائش کے خاتمہ کی دعا کرتی ہیں۔ ہم آپ کی بیٹی کی صحت یابی کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت و حوصلہ عطا فرمائے۔

صبا و شریف..... ساہیوال

خواتین میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ خواتین ہمیں 6،7 سے پہلے نہیں ملتا۔ پھر پڑھنا اور پھر بے اختیار تبصرہ کرنے کو دل لچاتا ہے۔ لیکن پھر وہی آپ تک ارسال کرنے کا عین مسئلہ۔ انتظار کرتی ہوں کہ کب کوئی آئے تو شہر جائے۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح آپ کی من مرضی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہی کہ قارئین ماڈل گرل کی جگہ قدرتی مناظر چاہتے ہیں اور آپ؟ ”حالم“ کے کیا کہنے؟ ہر تحریر پہلے سے بڑھ کر۔ فرزانہ کھرل اور سمیرا حمید فلاسفی بہت نکلتی ہیں۔ مشکل مشکل جملے۔ منفرد لکھنے کے چکر میں کچھ عجیب سا لکھ جاتی ہیں۔ امریکہ، عراق، فرانس کی مثالیں۔ دبیا، دورین، خرطوم و لائم۔ پرندوں جانوروں جیسے نام۔ بندہ کم از کم نام تو آسان رکھ لے۔ ”جمال زہرا“ پڑھ کر بے اختیار اپنے ایک عالم کی بات یاد آگئی کہ ”عورتوں کو غلط عورتوں سے بھی پردہ کرنا چاہیے۔“ باقی کا شمار بھی اچھا تھا۔ اپنے ہم خیال خطوط پڑھ کر جہاں دل خوش ہوتا ہے وہیں غلط تجاویز پڑھ کے پارہ بھی ہائی ہوتا ہے اور کچھ کا کہنا کہ صفحات بڑھا کر قیمت زیادہ کر دیں۔ اللہ کی بندیوں! جو چیز جتنی ہے اتنی ہی قبول کر لو باقی اگلے ماہ سہی۔ بہت ساری قارئین ایسی ہیں جو 70 روپے بہت مشکل سے نکالتی ہیں۔ وہ بے چاریاں مزید کہاں سے لائیں گی؟ پہلے مہنگائی کم ہے جو غلط پٹیاں پڑھاتی رہتی ہو معصوم ادارے والوں کو۔ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے کیا شعاع، خواتین اور کرن کے خطوط ایک ہی لفافے میں ڈال کے بھیج سکتے ہیں؟ پلیز اس کا جواب ضرور دیں۔

ج: پیاری صبا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں بخوبی اندازہ ہے کہ ہماری پیاری قارئین کو خط لکھنے اور پوسٹ کرانے میں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی

لیے ہم لیٹ ملنے کے باوجود آپ کا خط شامل کر رہے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ کوئی کتنی بھی پٹیاں پڑھائے۔ ہم قیمت اسی وقت بڑھاتے ہیں جب ناگزیر ہو جائے۔ ہماری حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ ادارہ اضافی اخراجات کا بوجھ قارئین پر ڈالنے کے بجائے خود برداشت کر لے۔

آپ کے لیے خصوصی رعایت ہے کہ آپ شعاع، خواتین اور کرن کے خط ایک ہی لفافے میں ڈال کے بھیج سکتی ہیں۔ دیگر قارئین بھی صرف شعاع اور خواتین کے خط ایک ہی لفافہ میں پوسٹ کر سکتی ہیں۔

آرزو ضیاء..... گلشن معمار

پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ ضرور شائع ہوگا۔ بہت ساری رائٹرز پسندیدہ ہیں جن میں سے کچھ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، سائرہ رضا، سمیرا حمید، تنزیلہ ریاض، آمنہ ریاض، نعیمہ ناز اور فاخرہ جبین زیادہ پسند ہیں۔ ناولز میں سے ”حالم“۔ دشت جنوں۔ مکمل۔ آب حیات۔ سائرہ رضا“ کے ناولز، سمیرا حمید کے ٹیولپ، مہر میراں، وغیرہ بہت پسند ہیں لیکن اس بار کا ”محب رب“ سب سے بڑی لے گیا۔ سمیرا حمید کی لکھی گئی کہانیوں میں سے سب سے اول نمبر پہ یہی ہے۔ پلیز بھی سمیرا حمید کا تفصیلی انٹرویو ضرور لیں اور اے آر وائی پہ چلنے والے ڈرامے ”بلا“ کے ہیرو بلال کا بھی تفصیلی انٹرویو ضرور لیں پلیز۔

ج: پیاری آرزو! آپ کا ناولٹ ابھی پڑھا نہیں۔ پڑھ کر ہی بتا سکتے ہیں۔ آپ میں صلاحیت ہے یا نہیں۔ اطمینان رکھیں۔ قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ خواتین ڈائجسٹ میں جو کہانیاں شائع کی جاتی ہیں ان کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

شازیہ ستار..... ڈیرہ غازی خان

تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد شریک محفل ہوں۔ میری بھابی کی 18 اگست کی رات کو وفات ہوگئی ہے۔ میرے بھائی اور بچوں پر قیامت سی ٹوٹ پڑی ہے۔ باقی ایک ہی بندے پر کیوں اتنی تکلیف اور آزمائش آئی ہے۔ پہلے ماں نو جوانی میں چل بسیں ابو جان کی جوانی میں ڈھچھ ہوگئی۔ نو جوان بہن کی، اب بھابی نو جوانی میں چل بسی، اب تو لوگ بھی باتیں کرتے ہیں کہ پتا نہیں ان بے چاروں کا کیا

لگیں کہ دل چاہتا مائیک لگا کے پوری دنیا کو سناؤں۔ اتنی ہار روئی، ہنسی، مسکرائی۔ کئی کئی دن ان کہانیوں کے اثر میں رہی، کس کس رائٹر کا نام لکھوں۔ خوبیاں گنواؤں..... جس کہانی نے اتنے سالوں بعد اتنا مجبور کیا کہ خدا لکھوں وہ ہے میرا حید کی "محب رب" کیا اعلیٰ سوچ ہے۔

ج: پیاری شائستہ اخواتین ڈائجسٹ سے آپ کا اٹھارہ سالہ ساتھ ہی ہمارے لیے باعثِ طراوت ہے۔ میرا حیدر تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

اقراء الیاس..... مرید کے ضلع شیخوپورہ

اس بار پورا کا پورا ڈائجسٹ ہی بیٹ تھا۔ ماڈل کا میک اپ اور اک ادا سے دیکھنا خوب صورت لگا حقوق العباد سے پر اخلاقیات کا درس دیتی احادیث دل کو لگیں۔ آئمہ بیک سے ملاقات اچھی رہی۔ "ڈاکٹر شاہد علی زیدی" پلیز ایک ریکویسٹ سمجھ لیجئے گا اس سلسلے کو ختم مت کیجئے گا

"الف" عمیرہ احمد بے شک آپ کو گفتگو سے مختلف مگر مختصر انداز میں کہنا آتا ہے۔ "رشتوں کی چابی" حقیقت میں تو اس کے برعکس ہی دیکھا ہے مطلب نکال کر تو کون اور میں کون؟ لیکن میں رائٹر کی سوچ کو سراہوں گی "دل ہی تو ہے" ہلکی پھلکی اسٹوری تھی۔ عرصے بعد ڈائجسٹ میں پرانی جھلک نظر آئی۔ "جمال زہرا" پڑھنے کے بعد کتنے لمبے شاگڈ رہی۔ سائرہ رضا انتظار تو کروائی ہیں مگر پھر شکوہ بھی نہیں رہنے دیتیں۔ میرا حیدنا امید ہی اور اندھیری رات کے مسافروں کے لیے "دوا" اور ان کی "دعا" ثابت ہوئی جو انہیں ہاتھ تمام گہرائیوں سے نکال لائے۔ حیدر نہیں ہوتا آپ کا یقین آپ کا حیدر ہوتا ہے "کہانی پڑھنے کے بعد ایسا لگا ادھوری رہ گئی، بدی کا کیا ہوا؟

ج: پیاری اقراء! میرا حید کی کہانی ادھوری ہی تھی معذرت خواہ ہیں کہ سہا ہاتی آئندہ نہ لکھ سکے۔ اس ماہ کہانی کی دوسری اور آخری قسط شامل اشاعت ہے۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

تسمیہ نعمان..... لاہور

یقین مانیں اس مہینے کوئی ارادہ نہ تھا خط لکھنے کا لیکن

بجز اسے یہ بار بار آزمائش میں بھی آ رہے ہیں۔ اب آپ عیبتا میں ان کو ان کے سوالوں کا کیا جواب دوں؟

ج: پیاری شازیہ! آپ کی بھابھی کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی اور بچوں کو صبر دے۔ آئین۔ آپ لوگوں کی باتوں کا اثر نہ لیں دنیا سے ایک دن سب نے ہی جانا ہے اللہ تعالیٰ نے جتنی عمر لکھی ہے، ہمیں دنیا بھی اسی مقررہ وقت تک رہنا ہے۔ کم یا زیادہ وقت، یہ اس کی محنتیں ہیں۔ دکھ اور تکلیفیں آزمائش ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر آزمائشیں زیادہ آتی ہیں۔

آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔ آپ دوسرا ٹولٹ بھجوا دیں۔

لائیہ اعوان..... لاہور

"الف" میں عمیرہ جی نے اس بار خلاف معمول اشارت ہی میں کہانی اوپن کر رکھی ہے مگر ان کا کمال یہ ہے کہ قاری کا انٹرسٹ پھر بھی پہلے کی طرح برقرار ہے۔ "ام الیقین" پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ میرا حید کے کرداروں اور حالات و واقعات میں اب ماورائی عنصر جھلکے لگا ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحریروں کی سب سے خوب صورت بات یہ ہے کہ وہ قاری کے دل میں امید کے دیے کو کسی نہ کسی طور جلائے ہی رکھتی ہیں۔ افسانوں میں "مسٹر اسٹائل" اور "دل عشق" نے بننے پر مجبور کر دیا۔

ج: پیاری لائیہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ فون کرتی رہیں لیکن آپ کی احتل سے بات نہ ہو سکی۔ آپ کا فون نمبر ہمارے پاس ہے ہم آپ کو خود فون کر لیں گی۔ کہانی مل گئی ہے۔ ابھی پڑھی نہیں گئی۔

شائستہ بٹول..... کراچی

آج سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے اک تعلق قائم ہوا۔ امی سے شوق پیدا ہوا، جب سسرال گئی تو موج ہو گئی اکلوتی جنمائی پہلے سے ہی شوقین۔ بس پھر ان سے لے کے پڑھتی تھی۔ پھر چاب کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا تو ایک پڑسن بھی مل گئی۔ وہ اور میں ایک دوسرے کو بدل بدل کر رسالے پڑھنے کو دیتی رہیں۔ ماہ و سال گزرے۔ اللہ پاک نے دو بیٹوں سے لوازا۔ سب کچھ بدلا مگر رسالوں کا فشر، پیار، چاہت ویسی ہی رہی، اتنی مرتبہ کہا یاں! ابھی

ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور

کتنے ماہ سے آپ سے آدمی ملاقات نہیں ہوئی۔ بس دکھ و سکھ، پریشانیاں، تکلیفیں جیسے آسیب جو زندہ انسانوں کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ رہی سہی کسر دھواں دار بارشوں نے نکال دی۔ مکان کا پہلا ہنا ہوا حصہ۔ بیٹھک، کچن، باتھ روم وغیرہ کی دیواریں کٹر لائن پھٹ جانے سے دراڑیں پڑ گئیں۔ وہ حصہ پورا گرا دیا۔ ہم پچھلے والے حصے میں رہتے ہیں۔ کچن کا سارا سامان۔ دکھوں میں اللہ پاک کہیں کہیں سکھوں کا دریچہ بھی کھلا رکھتا ہے۔ میری شہزادی شمرہ جاوید کی شادی۔ مکان تو ابھی بھی زیر تعمیر ہے۔ بیٹی کی شادی ہال میں کرائی۔

”کہنی سنی“ تلخ اور پُر اثر ”کرن کرن روشنی“ کی ایمان افروز باتیں پڑھ کر جب لگا کر پہنچی۔ عمیرہ احمد کے ”الف“ پر۔ یہ عنوان پڑھ کر ”الف اللہ تے چلے دی ہوئی“ کا کافی یاد آ جاتی ہے۔ مومنہ سلطان کی بے بسی پر خاصا ترس آیا۔ نمرہ احمد کا ”حالم“ لفظوں سے کھلواؤ خوب جانتی ہیں نمرہ۔ مگر ایک چیز کی ابھمن برقرار ہے۔ پچھلے لوگ تو اپنی عمر گزار کر مر رہی جاتے ہیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی (کنویں کے ذریعے نہیں) دنیا میں سفر کر کے چلے جاتے جہاں قدیم، پرانے رسم و رواج چل رہے تھے۔ بادشاہ، شہزادی، ہندابارا۔ تو فہم میں بات آتی ہے۔ سائرہ رضا کے قلم میں دریا کے پانی جیسی روانی ہے سمندر جیسی گہرائی ہے ”جمال زہرا“ بہت اچھی کہانی خاصی دکھی کر گئی۔ ”دھنک کے رنگ“ عفت سحر کا بے حد پسند آیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ”رشتوں کی چابی“ عطیہ خالد کا ”مسٹر اسمائل“ میمونہ صدف ”دل عشق میں“ ربیعہ طارق بہت ہلکے پھلکے اور مزے دار تھے۔ ”ہمارے نام“ خط بڑے مزے کے ہوتے ہیں معصومیت اور اپنائیت سے بھرے۔ آپ کے جواب بڑے شاندار قسم کے۔ ”نفسیاتی ابھنیں“ عدنان بھائی مشورے خوب دیتے ہیں۔

ج: پیاری ملائکہ! اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں آسانیاں لائے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیں زندگی میں صرف خوشیاں اور آسانیاں کم بلکہ شاذ و نادر ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ زیادہ تر کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ کچھ

جمال زہرہ نے اتنا مجبور کر دیا کہ شدید ٹانگوں میں درد کے باوجود اٹھ کر سب سے پہلے کاپی پھل پکڑ کر تبصرہ لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ سائرہ رضا کیا چیز ہو تم ابھی ان میرڈ ہو اور تحریر میں اتنی روانی اتنی چٹکی، اعلیٰ منظر نگاری، کردار نگاری، کرداروں کے جذبات کی عکاسی کرتی، سب ایسے تھا۔ جیسے آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔

”الف“ یہ تبصرہ ادھار ہے ابھی پچھلے سال دینا فضل کریم (ناٹی) کی کہانی پڑھی تھی۔ وہ ذہن سے نہیں جاتی۔ لے مل رضا آئی لو یو سوچ۔ تمہارے ابا جی نے بہت ہنسایا۔ رقص میں شرارتیں بہت مزے کی تھیں۔ لیکن ”پیال ساڑ۔ اقرار کا موسم۔ شکر۔ کال بیساکھی۔ بیٹیوں کی ماں۔ سرخ آندھی۔ ٹنگنوں والی شال“ نے خوب رلایا۔

ج: تسمیرہ رمضان سے تسمیرہ نعمان بننے تک کا سفر۔ مبارک ہو۔ ہمیں خوشی ہے کہ شادی کے بعد بھی آپ کا خواتین ڈائجسٹ سے تعلق برقرار ہے۔

سائرہ رضا شادی شدہ ہیں۔ ان کی ماشاء اللہ تین بچیاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

رابعہ آہیر، رضوانہ آہیر..... میانوالی

ہم میانوالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں الحمد للہ آسودہ حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ سے رشتہ تقریباً دس بارہ سالوں پر محیط ہے اور اس دوران زندگی کے مختلف معاملات میں اس ادارے سے کافی راہنمائی ملتی رہی ہے۔

اب آتے ہیں مصنفین کی طرف تو ادھر پہلی پوزیشن پر موجود ہیں۔ نمرہ احمد ان کی تحریر میں ایک جادو ہے جو سیدھا دل پہ اثر کرتا ہے۔ دوسری مصنفین جیسا کہ عمیرہ احمد، آمنہ ریاض، فرحت اشتیاق اور نایاب جیلانی کو بھی کافی پڑھا اور بہت پسند کیا۔

ج: رابعہ اور رضوانہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند ہے۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔

دوسرے کتے کو پکڑنے کے لیے بھاگتا ہے تو میرے لیے کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔“

27- ”مارٹنگ شو کرنے کا موقع ملے تو؟“

”تو ضرور کروں گی۔“

28- ”گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟“

”اماں ابا دونوں سے..... کیونکہ میں بچپن سے ہی بہت لاڈلی اور چبھتی رہی ہوں۔“

29- ”کبھی بیمار ہوں تو اپنی بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟“

”میری امی کہتی ہیں کہ ”انعم تم بیمار نہ ہوا کرو۔ کیونکہ“

پھر سارے کام رک جاتے ہیں اور تم سے بیماری ہینڈل بھی نہیں ہوتی۔ تو میں بہت زیادہ ڈپرےس ہو جاتی ہوں۔“

30- ”آپ کے ڈراموں کی تعداد؟“

”بہت سارے ہیں، چند ایک کے نام یہ ہیں ”جورو کا غلام“ نور زندگی۔ وعدہ۔ بہورانی۔ دل پر باد۔ حدت“ اور ”لشکارہ“ وغیرہ..... ”اسیر محبت“ انڈر پروڈکشن ہے۔“

31- ”روڈ بینک رول آسانی سے کر لیتی ہو؟“

”اداکاری میری محبت ہے۔ اس لیے کسی بھی قسم کے رول کرنے میں مشکل نہیں ہوتی۔“

32- ”ادب سے آپ کا لگاؤ؟“

”اکثر شعر و شاعری کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ غالب، فیض احمد فیض، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، میرے پسندیدہ ہیں۔“

33- ”کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟“

”یریانی، کڑائی، چائیز اسٹیک اور تھائی فوڈ تو بہت ہی اچھا بنا لیتی ہوں۔“

34- ”رونا کب آتا ہے؟“

”جب امیدیں ٹوٹتی ہیں تو بہت رونا آتا ہے۔“

35- ”ایک خواہش جو حسرت بن گئی؟“

”میں خوش قسمت ہوں کہ میری کوئی خواہش ایسی نہیں جو حسرت بن گئی ہو۔“

36- ”کس کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہیں؟“

”اپنی فیملی کے لیے۔“

37- ”ایک نصیحت جو گرہ سے باندھ لی؟“

”کہ آئندہ کسی دوست کے ساتھ کاروبار نہیں کروں گی۔“

38- ”آپ کو نفرت ہے؟“

”جھوٹ سے، جو آج کل ہر کوئی بول رہا ہے۔“

39- ”خواہش ہے کہ ایسی فلموں میں کام کروں جو؟“

”ایکشن موڈی کرنے کو ملے یا پاکستان کی کسی بھی ”فارس“ میں کام کرنے کو ملے تو ضرور کروں گی۔“

40- ”اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچا لیتی ہیں؟“

”میں بہت خرچ کرتی ہوں، مگر کبھی کبھی بچا بھی لیتی ہوں۔“

41- ”ایک محبت جو بھول نہیں سکتیں؟“

”جس گاؤں جانا نہیں اس کا ذکر بھی کیوں۔“

42- ”کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟“

”ٹریولنگ کے لیے..... چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو۔ میں جانے کے لیے تیار رہتی ہوں۔“

43- ”کس کو دیکھے بنائیں نہیں آتی؟“

”دیکھنے کا تو کچھ نہیں کہہ سکتی، البتہ جب تک سلیپنگ سوٹ نہ پہن لوں بنائیں نہیں آتی۔“

44- ”گھر کے کس کمرے میں سکون ملا ہے؟“

”اپنے کمرے میں۔“

45- ”کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟“

”اسے بڑے وقت میں آزمائیں۔“

46- ”کبھی کراسس میں وقت گزارا؟“

”الحمد للہ ابھی اس بار وقت نہیں آیا۔“

47- ”بی بی ہالی کب ہوتا ہے؟“

”میش بوی ہوا ہے..... ورنہ ہم جس معاشرے
مردہ جے ہیں وہاں تو ہائی ہی ہونا چاہیے۔“

48۔ ”اپنے بیگ میں کیا کیا چیزیں رکھتی
ہیں؟“

”اے ٹی ایم کارڈز۔ سی این آئی سی۔ کچھ کیش
نکے وغیرہ وغیرہ۔“

49۔ ”نصیحت جو بری لگتی ہے؟“

”شادی کر لو اب۔“

50۔ ”کھانے میں کن چیزوں کا ہونا ضروری
ہے؟“

”اچار، رائیہ اور سلاڈ۔“

51۔ ”کھانا کھانا کہاں اچھا لگتا ہے۔ چٹائی،
اپنا بیڈ یا ڈائننگ ٹیبل؟“

”مجھے صوفے پہ بیٹھ کر کھانا کھانے میں مزہ آتا
ہے۔“

52۔ ”ایف بی انسٹا گرام اور انٹرنیٹ سے
آپ کی دلچسپی؟“

”بہت زیادہ دلچسپی ہے ان تینوں سے بہت ایلٹو
رہتی ہوں۔“

53۔ ”وقت کی پابندی کرتی ہیں؟“

”بالکل کرتی ہوں۔۔۔۔۔ اور وقت سے پہلے ہی پہنچ
جاتی ہوں۔“

54۔ ”کوئی کھانا جو کئی دن تک کھا سکتی
ہوں؟“

”کھانا نہیں۔۔۔۔۔ سلاڈ کئی دن تک کھا سکتی ہوں۔“

55۔ ”کوئی ایسی ڈیٹ جو بھول نہیں سکتیں؟“

”9/11 کی (دولڈ ٹریڈ سینٹر)۔“

56۔ ”دوسرے ملک جا کر کیا بات نوٹ کرتی
ہیں؟“

”لوگوں کی انسانیت، سولائزیشن، صفائی، تہذیب،
ترقی اور سب سے زیادہ ان کا سادہ پن۔“

57۔ ”ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟“

”پاکل۔ وکیل اور ”طوائف“ کا کردار۔۔۔۔۔ کیونکہ

اس میں اداکاری کا مارجن بہت ہوتا ہے۔“

58۔ ”ایک کردار جو مقبول ہوا؟“

”نور زندگی کا کردار گلشن آرا بہت مقبول ہوا۔“

59۔ ”ایک کردار جو کر کے پچھتا رہیں؟“

”نہیں ایسا کوئی کردار نہیں ہے۔“

60۔ ”ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند
ہے؟“

”امی کے ہاتھ کا۔“

61۔ ”آپ کی فیوچر پلاننگ؟“

”اپنا ذاتی گھر بنانا ہے مجھے۔“

62۔ ”ایک خواب جو بار بار دیکھتی ہوں؟“

”ایک حویلی جس میں میں اکیلی ہوں۔۔۔۔۔ بار بار
دیکھتی ہوں۔“

63۔ ”پسندیدہ نوڈل اسٹریٹ؟“

”دھوراجی اور بنگا ک نوڈل اسٹریٹ۔“

64۔ ”عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟“

”ذہین عورتوں سے مردوں کی جتنی کہاں ہے تو
عورت تو خوب صورت ہی ہونی چاہیے۔ مذاق کر رہی
ہوں۔۔۔۔۔ عورت کو ذہین ہی ہونا چاہیے۔“

65۔ ”شادی میں پسندیدہ رسم/تحفہ یا کیش؟“

”بہندی/تحفہ خرید سکتے ہیں تو تحفہ بہترین ہے ورنہ
کیش ہی بہتر ہے۔“

66۔ ”آئینہ دیکھ کر سوچتی ہوں کہ۔۔۔۔۔؟“

”اللہ میرا نصیب اچھا کرے۔“

67۔ ”بدلہ لیتی ہیں؟“

”بدلہ نہیں لیتی۔۔۔۔۔ مگر اہیں جدا کر لیتی ہوں۔ یہی
خوب صورت بدلہ ہے۔“

68۔ ”کب فریٹس محسوس کرتی ہیں؟“

”جب ایک سرساز کرتی ہوں تو پھر اپنے آپ کو ہلکا
پھلکا محسوس کرتی ہوں۔“

69۔ ”اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں
کے تجربے سے؟“

”دوسروں کے تجربے سے اور کبھی کبھی تجربہ کر کے

بھی انسان کو مثل نہیں آتی۔“

70- ”دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ؟“

”میری ماں۔“

71- ”لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟“

”سیلفی یا پھر گانا سنائیں۔“

72- ”آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟“

”کے ٹوسر کروں۔“

73- ”ماڈلنگ اور قلم کی؟“

”ماڈلنگ تو بہت کی ہے۔۔۔۔۔ البتہ قلم ابھی نہیں کی۔“

74- ”بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی محفوظ ہے؟“

”میری ماں نے میرے بچپن کے سارے کھلونے اور میرے کپڑے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔“

75- ”آپ کو فوبیا ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔ خون (Blood) اور اونچائی کا فوبیا ہے۔“

76- ”کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟“

”جی بالکل۔“

77- ”اپنی قلمی ماں لیتے ہیں؟“

”جی ہمیشہ۔“

78- ”دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟“

”ہمیشہ دل کی سنتی ہوں۔“

79- ”غصے میں پہلا جملہ؟“

”مجھ سے آئندہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“

80- ”نیند آسانی سے آ جاتی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ بہت وقت لگتا ہے۔ نیند آسانی سے نہیں آتی۔“

81- ”رات سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتی ہیں؟“

”آیت الکرسی اور دعائیں پڑھ کر سوتی ہوں۔“

82- ”محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟“

”دونوں سے۔۔۔۔۔ محنت ہماری ہوتی ہے اور قسمت اوپر والا لکھتا ہے۔“

83- ”پسندیدہ تہوار؟“

”میٹھی عید۔۔۔۔۔ (عید الفطر)۔“

84- ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“

”جب رشتوں پہ سے اعتبار اٹھ جائے یا انسان کی انسانیت مر جائے تب۔“

85- ”مارنگ شو میں جانا پسند ہے؟“

”صبح صبح ایک سرساز کے لیے تو اٹھ جاتی ہوں، مگر تیار ہو کر مارنگ شو میں نہیں بیٹھ سکتی۔ اس لیے بہت کم جاتی ہوں۔“

86- ”گھر سے نکلتے وقت کیا کیا چیزیں لازمی لے جاتی ہیں؟“

”موبائل فون، ڈیٹ کارڈ، پرس، پاور بینک، چارجر، فریٹ بکس اور پانی کی بوتل۔“

87- ”آپ کی اچھی اور بری عادت؟“

”سچ بہت پسند ہے، یہ اچھی عادت ہے اور غصہ بہت جلدی آتا ہے۔ مگر جلدی اتر بھی جاتا ہے۔“

88- ”اس فیلڈ میں نہ ہوتیں تو؟“

”تو پیٹنر ہوتی یا پھر انسانی حقوق کی وکیل ہوتی۔“

89- ”ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟“

”یہ کہ میرے بعد میرے کتے اور بلی کا کیا ہوگا، کون خیال رکھے گا۔“

90- ”کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟“

”کانی۔۔۔۔۔ چاکلیٹ۔“

91- ”خدا کی حسین تخلیق؟“

”یہ دنیا۔“

97- ”اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟“

”ہر شخص کو زوال ہے۔۔۔۔۔ زندگی کو موت ہے۔ شاید یہ بھی اللہ کا امتحان ہے۔“

☆

آپ کا باورچی خانہ

سلسلہ ناز

س: کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: کھانا بناتے ہوئے میں یہی فکر کرتی ہوں کہ بس میرے بچوں کا پیٹ بھر جائے اگر وہ دوبارہ مانگیں بھی تو کھانے کی ایک آدھ پلیٹ مزید ہو۔

س: کھانے کا وقت ہے، اچانک مہمان آجائیں تو.....؟

ج: مہمان آج کل ان گھروں میں آتے ہیں جہاں طرح طرح کے کھانے ہوتے ہیں۔ ہم صرف چائے، شربت اور پاپڑ سمو سے کھلانے والے میزبان ہیں۔ کوئی قسمت کا مارا آ بھی جائے تو جو پکا ہوتا ہے وہی آگے رکھتے ہیں۔

س: بچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج: ہم گاؤں سے شہر بچوں کی تعلیم کے لیے شفٹ ہوئے ہیں۔ کرائے کے بدلتے ہوئے مکانوں میں بچن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ بس پر آمدے کے ایک سائینڈ پچھوٹا سا بچن خود سیٹ کرتی تھی۔ اب جس مکان میں شفٹ ہوئے ہیں، اس کا بچن الگ ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ کھانا پکاتے ہوئے میں ساتھ ساتھ صفائی بھی کرتی جاتی ہوں، کام کے معاملے میں ماشاء اللہ پھرتیلی ہوں۔

س: ناشتے میں کیا خاص چیز بناتی ہیں؟

ج: ناشتے میں، پراٹھا چائے تو پراٹھا اچار، میں چائے کے ساتھ کھاتی ہوں۔ شوہر بچے اچار کے ساتھ پراٹھے کھاتے ہیں۔ چھوٹی بیٹی عمارہ کو چائے پسند نہیں دیتی، نہ لسی۔ بس کچھ کبھی تھوڑے کے ساتھ کھالتی ہے۔

س: مہینے میں کتنی بار ہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج: خواہوں میں باہر کھانے کے پروگرام چلتے رہتے ہیں۔

س: ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: موسم اچھا، ہو خوب صورت ہو تو میرا دل کرنا

ہے میں بہت زیادہ اونچی آواز میں پرانے گیت سنوں مگر شوہر بچوں کی وجہ سے نہیں کر پاتی تو رونا آتا ہے۔ شادی نہ ہوئی غلامی ہوئی۔ اس موسم میں میں چائے اور آٹے کا ملوہ بناتی ہوں۔

س: کھانا پکانے میں محنت کی کتنی قائل ہیں؟

ج: میں توجہ کے ساتھ کھانا بناتی ہوں۔ محنت ضرور ہو، کیونکہ محبت میں اثر نہیں جب محبت کے ساتھ پکاؤں تو کھانا خراب پکتا ہے۔

س: بچن کی ٹپ.....؟

ج: کھانے کے وقت میں "یا اللہ" پڑھتی ہوں اور روٹی بھی رہتی ہوں۔ کھانا بنانے تک۔ سوچتی ہوں ہمارے پیارے آٹا نے کھی والی روٹی کبھی تناول نہیں فرمائی، نہ کھی والا سالن۔ کتنی مشکل زندگی تھی وہ، پیوند والے کپڑے، کھانا کبھی میسر نہ ملتا..... آہ، اور ہم تین چار وقت کھانا، چائے پراٹھے، کم پانی زیادہ کھی والا سالن..... قربان جاؤں میں سو بار، پھر بھی ہمارا ہر وقت کارونا..... رونا..... رونا..... "آہ ہم ناشکری امت۔"

ایک خاص ڈش کی ترکیب لکھ رہی ہوں جو بہت آسان ہے۔

خشک روٹی کی کھیر

خشک روٹی..... ایک عدد

دودھ..... ایک گلو

چینی..... ایک کپ

الاچی..... پانچ عدد

اکثر گھر میں روٹی بچ جاتی ہے اس کو صاف جگہ رکھ کے خشک کریں ایک دو دن بعد اس خشک روٹی کو پانی میں بھگو دیں جب نرم ہو جائے تو پیسلے میں دو لیٹر پانی ڈال دیں جب وہ اٹل جائے تو خشک روٹی ڈالیں اور چمچ ہلاتیں جب یک جان ہو جائے اور پانی گاڑھا ہو جائے تو چینی دودھ اور چھوٹی الاچی ڈال دیں۔

(جو خشک میوہ جات خرید سکتے ہیں، وہ ہر ایک باریک میوے کاٹ کے ڈال سکتے ہیں) یہ سب چیزیں ڈال کے کچا مسلسل ہلاتی رہی گاڑھا ہونے پہ اتار لیں (آپ ٹکڑوں کو گرینڈ بھی کر سکتی ہیں) جن کے پاس فریج ہیں، وہ ٹھنڈا ہونے کے لیے فریج میں رکھیں یہ کھیر کمزور جسم والوں کے لیے اور خاص کر بچوں کے لیے بہت مفید ہے۔

موسم کے پکوان

حکماء کے حوالے

کڑا ہی تنک

سویہن ملوہ

اجزاء:-	اجزاء:-	کوکٹ (مرغی)	آدھا کاگو
نشاہتہ آدھی پیالی	میدہ	پسا اور ک لہسن	آدھی پیالی
آدھا پاؤ	چٹنی	تین	ایک کھانے کا چمچ
ایک کلو	چھوٹی الائچی	پیاز	دو کھانے کے چمچ
چھ سے سات عدد	اخروٹ کی کری	تنگ	ایک عدد
ایک پیالی	بادام	زیرہ	حسب ذائقہ
ایک پیالی	کمی	سوف	آدھا چائے کا چمچ
سوا کاگو	ترکیب:-	ثابت دھنیا	آدھا چائے کا چمچ
	بڑے سائز کے پیلے میں ایک پیالی کمی لے کر	ثابت سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچ
	اس میں میدہ اور نشاہتہ ڈال کر ملائیں پھر اس میں	آئل	پانچ عدد
	تین لیٹر پیانی ڈال کر ابھی طرح ملا لیں۔ اگلی آٹھ پر	ترکیب:-	حسب ضرورت
	اتنی دیر پکائیں کہ اہال آجائے۔ اہال آنے پر چٹنی		
	ڈال دیں۔ جب چٹنی ابھی طرح گھل جائے تو		
	چوبے سے اتار کر دوسرے تین میں گھل کا کپڑا رکھ کر		
	پھان لیں۔ اب مینے ہوئے آمیزے کو ڈھک کر		
	شغری جگہ پر رات بھر کے لیے رکھ دیں۔ پھر دوبارہ		
	سے اگلی آٹھ پر چمچ چلاتے ہوئے اتنی دیر پکائیں کہ		
	اس کی رنگت تبدیل ہونے لگے۔ کمی کا ایک ایک		
	چمچ ڈالتے ہوئے بھونتے جائیں۔ اب آمیزے		
	میں الائچی کے دانے پیس کر ملا لیں۔ ایلو میٹیم کی		
	پایٹ میں ہکا سا کمی لگا کر اس میں سویہن ملوہ نکال		
	لیں اور اس پر اخروٹ اور بادام چھڑک دیں۔		
	ملوے کی سجاوٹ کے لیے اس کے ٹھنڈا ہونے پر		
	اپنے پسند کے ہلپ میں کاٹ لیں اور پھر کسی ایئر		
	ٹائٹ ڈبے میں محفوظ کر لیں۔		

کوکٹ کی بوٹیوں کو دھو کر چھانی میں ڈال کر پانی ٹنک کر لیں۔ زیرہ، سوف، ثابت دھنیا اور سرخ مرچ کو بھون کر پیس لیں۔ اب لہسن اور ک، رسیا ہوا مسالا، دھنی، تین اور تنک کو کوکٹ میں ملا کر دو دھننے کے لیے فریق میں رکھ دیں۔ کڑا ہی میں تیل گرم کر کے ہار یک کئی پیاز کو سنہرا ہونے تک تل لیں۔ اب مسالا لگے کوکٹ کو ابھی طرح بھونیں اور حسب ضرورت پانی ڈال کر دھیمی آٹھ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ کوکٹ گھل جائے تو ابھی طرح بھون کر پو لہا بند کر دیں۔ کوئلہ دھکا کر کوکٹ کے درمیان میں پیاز کا چھلکا یا روٹی کا ٹکڑا رکھ کر کوئلہ رھیں اور ایک چائے کا چمچ آئل ڈال کر کڑا ہی کا ڈھان اٹھ دیں۔ کڑا ہی تنک تان کی ساتھ پیش کریں۔

کھانا خوشامد کی گنجینیں

ن، افکار ملتان

س:- میں تین سال سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں فقے آپ کے سارے مضامین بہت اچھے ہیں خاص طور پر ازدواجی الجھنیں سلسلہ بہت پسند ہے۔ میں اپنا ایک مسئلہ بیان کر رہی ہوں۔ میری شادی کو دو سال ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے اور ایک بیٹی ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ پہلے شوخ کے مافی سماں تھے اب مالا ج بہتر ہیں لیکن اب میری صحت بہتر نہیں ہے۔

مسئلہ:- یہ ہے کہ مجھے رات میں نیند نہیں آتی اور کان میں عجیب و غریب باتیں سنائی دیتی ہیں۔ مثلاً اپنے خاندان کے سارے افراد کی سچے یعنی ان کی آواز میں باتیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ مسئلہ شادی کے تقریباً دو سال بعد شروع ہوا۔ میں اس مسئلہ کی وجہ بہت پریشان ہوں۔

مجھے رات کو نیند پہلے بالکل نہیں آتی تھی لیکن اب میں مہینہ بھر اسپتال ماہر نفسیات سے اپنا علاج کر رہی ہوں اب نیند آ جاتی ہے لیکن پہلے جتنی نیند نہیں آتی۔ بس گزارے الٹا آتی ہے اور نیند آئے بھی تو خواب ساری رات تک کہتے ہیں اور انتہائی گندے خواب آتے ہیں۔ خواب میں کسی کی شادی ہو رہی ہے وغیرہ۔

خوابوں اور کان میں آوازوں کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ خدا را میری مدد کریں۔ میں جس بھی ڈاکٹر کو دیکھا ہوں وہ اس مسئلہ کو سیریس نہیں لیتا اور توچہ سے بات نہیں سنتا۔ میں پرائیویٹ علاج نہیں کر سکتی میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ وقت جسم تھکا تھکا کر رہتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ مسئلہ انتہائی توچہ سے سنتے ہیں چنانچہ میرے مسئلہ کا کوئی حل ہے۔ ڈاکٹری مسئلہ یا کوئی آئینی مسئلہ ہے مجھے مشورہ دیں کہ میں اپنا علاج کس سے کرواؤں۔

ج: اچھی بہن! انسانی ذہن ایک ایسی پیچیدہ چیز ہے جسے سمجھنا آسان نہیں ہے۔ کبھی کوئی معمولی سی صحیح یا جھٹکا میں کسی کی یہ مسئلہ بن جاتی ہے۔ آپ کی طبیعت دور ہو سکتی ہے لیکن اس کے مسئلے کو آپ کو باقاعدہ علاج کرانا ہوگا۔ جن، جھوٹ، آسیب وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جنات کا ذکر ضرور قرآن پاک میں آیا ہے لیکن یہ کہیں بھی نہیں ہے کہ وہ اس طرح انسانوں کو تک کرتے ہیں۔

یہ اچھی بات ہے کہ آپ ماہر نفسیات سے علاج کر رہی ہیں۔ اس سے آپ کو فائدہ بھی ہوا ہے۔ آپ کو نیند آ جاتی ہے باقاعدگی سے اپنا علاج جاری رکھیں، دوائیں لیتی رہیں یہ شکایت بھی رفع ہو جائے گی۔ اس طرح کی بیماریوں میں صحت یاب ہونے میں وقت لگتا ہے۔ اس لیے جلدی نہ کریں۔

ایک ضروری بات نوٹ کر لیں ڈاکٹر جو دوا تجویز کریں۔ اسے باقاعدگی سے استعمال کریں اور جب تک ڈاکٹر نے کس جتن دیا ہے وہ پوچھیں۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے اس کیفیت میں جتنا لوگ کچھ دن تو دوا باقاعدگی سے لیتے ہیں پھر جیسے ہی اتفاق ہوئے گئے وہ دوا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ انتہائی خطرناک بات ہے۔ نفسیاتی بیماریوں میں ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر دوا چھوڑنا یا مسئلہ بن سکتا ہے۔ دوا ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق لیں اور باقاعدگی سے لیں۔ درمیان میں نامہ یا دوا کی مقدار میں کمی بیشی نہ کریں۔

آسیہ خان صوابی

س: میرا مسئلہ ہے حد حساس نوعیت کا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیسے لکھوں۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ہانپے ہوئے ہے اسے اس ڈھنگ سے بیان نہیں کر سکتا جس سے ساری اذیت لکھوں کی صورت پھر نکل آئے۔ میرا تعلق کم ہجے کے لئے متوسط گھرانے سے ہے۔ گھر کا ماحول بے حد سلجھا ہوا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بچپن میں کچھ عجیب و غریب رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک بات بتا دوں، میں بے حد حساس واقع ہوئی ہوں۔ ہر چیز مجھ پر عام لوگوں سے کہیں زیادہ اثر کرتی ہے۔ بچپن میں ایک کزن نے انہیں گھبراہٹ کا نشانہ بنی۔ اس وقت چونکہ میں بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے میں اس وقت تو اس حرکت کو کچھ نہیں مانتی مگر دل میں ایک عجیب سا خوف بیٹھ گیا۔ ذرا بڑی ہوئی تو گھر کا سوا اسٹف لائے گئی۔ دکان پر جاتی تو دکان دار ہاتھ پکڑ لیتا۔ زبردستی گیز میں بند کر دیتا۔ گھر کا ماحول تو بڑا سخت تھا۔ اس لیے کبھی گھر والوں سے ذکر نہیں کیا کہ کہیں وہ میرے گھر سے باہر نکلتے پر پابندی نہ لگادیں۔ کتنی ہی کاٹش کہ اس وقت میں ان سے یہ سب ڈسکس کر رہی تھی۔

ان ہی دنوں میری ایک کزن اپنے شوہر کے ساتھ ہمارے گھر رہنے آئیں۔ ایک روز مہمان زیادہ ہو جانے کے باعث میری دو کزن مجھے اپنے ساتھ سنانے لے گئیں۔ بستر پر درمیان میں میں تھی۔ خود تو وہ گہری نیند سو گئیں۔ میں بھی سو گئی۔ رات کے کسی پہر میری آنکھ عجیب سے احساس سے کھلی۔ میرا ذرا مجھ پر سوار ہو گیا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اس کمزور شخص کا ہاتھ خود پر سے ہٹا سکوں۔

اب حال یہ ہے کہ قریب سے ہوا بھی گزر جائے تو میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ ہر شخص کی تقلید اور گراہوا لگتا ہے۔ ہر مرد سے خوف آتا ہے۔ اس وجہ سے میں پرسکون نہیں رہ سکتی۔ دماغ تھکا تھکا سا رہتا ہے۔ باہر آنے جانے سے بھی گھبراتی ہوں اور تو اور اپنی بھتیجیوں کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس ہو گئی ہوں۔ میری بھابیوں بعض اوقات مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں۔ میری کچھ سس نہیں آتا کہ میں اپنی زندگی عام لڑکیوں کی طرح کیسے گزار دوں؟ میں ہر مرد کو ٹشک کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ کسی بھی نہ محرم کو اپنی بھتیجیوں کو ہاتھ بھی لگنے نہیں دیتی تاہی انہیں ان کے پاس چھوڑتی ہوں۔ میری اس عادت اور ان حرکتوں کی وجہ سے دو بار بھابی میری شکایت بھائی سے بھی کر چکی ہیں۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ وہ بڑے لوگوں محفوظ سے رہیں۔ آپ بتائیں کہ اس میں کیا لفظ ہے۔

مج عزیز بہن! آپ کی سوچ غلط نہیں ہے۔ فی وی اور فلموں نے کوئی کسر چھوڑی تھی تو وہ انٹرنیٹ اور موبائل نے پوری کر دی ہے۔ جس طرح کے روح فرسا واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اس نے ہر حساس دل کو کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایک قصور کی نسبت ہی نہیں نہ جانے کتنے بچے اور بچیاں اس اذیت میں مبتلا ہیں۔ بد قسمتی کی انتہا ہے کہ ہمارے ہاں ایسے بد بخت اور بے حیا لوگ بھی ہیں جو چھوٹے بچوں اور بچیوں کو بھی نہیں بخشے۔ عموماً قریبی رشتہ دار اس گھناؤنے کھیل میں زیادہ ملوث ہوتے ہیں۔ مائیں یا تو اتنی لاپرواہ ہوتی ہیں کہ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اور کبھی کبھی غم ہونے کے باوجود جان بوجھ کر چشم پوشی اختیار کر لیتی ہیں۔ بدنامی کا خوف ان کا راستہ روک لیتا ہے۔ اگر بچے کا کوئی رشتہ دار ہو تو سسرال کے طعنوں کا خوف اور اپنے ہی گھر والوں کی ناراضی کا ڈر ہوتا ہے اور سسرالی عزیز ہو تو شوہر، سسرال والوں کی ناراضی، خلاق کا خوف انہیں کچھ بولنے نہیں دیتا۔ وہ جان بوجھ کر اپنی بچیوں کی آنکھوں سے جھانکنے خوف کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ مسئلہ اتنے معمولی نہیں ہے۔

ماں بننے کے بعد عورت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسے اپنے بچوں کو پروان چڑھانا بلکہ ہر طرح سے ان کی حفاظت و تربیت بھی کرنا ہے۔ بہت چھوٹی بچیوں کو کسی کے قریب جانے ہی نہیں دینا چاہیے۔ بچیوں کو بھی گھانا چاہیے کہ کوئی آپ کے قریب آئے یا چھونے کی کوشش کرے تو آپ شور مچادیں۔ مائیں انتہائی قریبی رشتوں پر بھی غور رکھیں۔ ضروری نہیں کہ روک ٹوک سب کو بتا کر کی جائے بلکہ غیر محسوس انداز میں اپنے بچوں کو کسی سے زیادہ قریب نہ ہونے دیں۔

جہاں تک آپ کے مسئلے کا تعلق ہے جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا اس میں یہ ذہنی کیفیت ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ انسان بہت زیادہ حساس بھی ہو۔ لیکن کسی بھی کیفیت کا حد سے بڑھ جانا انسان کو نارمل نہیں رہنے دیتا۔ ایک بات ذہن میں رکھیں دنیا میں جہاں ایسے بھڑے اور وحشی انسان پائے جاتے ہیں وہاں پاکر دار، نیک اور اچھے لوگوں کو بھی کمی نہیں۔ آپ اپنی بھتیجیوں کا خیال رکھیں۔ انہیں سمجھائیں لیکن اس طرح کہ یہ بات کسی کو محسوس نہ ہو۔ بہت سی باتیں کہانوں کی شکل میں بھی ذہن نشین کرائی جاسکتی ہیں۔

خود بھی اپنے اس خوف پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ اپنے آپ کو یقین دلائیں کہ وہ بچپن تھا۔ میں کمزور تھی۔ بے خبر تھی۔ اب میں کمزور نہیں ہوں۔ اچھے بڑے لوگوں کو پہچان سکتی ہوں۔ ان کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ اس طرح آہستہ آہستہ اپنے خوف پر قابو پالیں گی۔

گھیسرین..... چار جچے
لیہوں کا عرق..... ایک عدد
پھٹکری پسلی ہولی..... دو چٹکی

فرحین شمع..... نوشہرہ صدر

س: موسم سرما میرے لیے مصیبت بن کر آتا ہے۔ سردی بری طرح پھٹنے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی ان سے خون بھی رسنے لگتا ہے۔ کتنا بھی رگڑ کر صابن سے دھو لوں، پھر میلے ہی نظر آتے ہیں۔ چہرے اور ہاتھوں کی جلد بھی کھردری ہو جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ بھی سانولا ہو جاتا ہے، جبکہ میرا رنگ اچھا خاصا صاف ہے۔ بالوں کی خشکی کے لیے کچھ بھی بتائیں؟

ج: حساس جلد موسم کے اثرات زیادہ قبول کرتی ہے۔ جن لوگوں کی جلد حساس ہوتی ہے۔ ان کے لیے سردی کا موسم خاصا تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی تدابیر کی جائیں کہ جلد موسمی اثرات سے محفوظ رہ سکے۔

پاؤں کی جلد جب خشک ہونا شروع ہوتی ہے تو سب سے پہلے ایڑی میں گہرے کٹاؤ نمودار ہونے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی جلد میں انفیکشن بھی ہو جاتا ہے، جس کے بعد علاج کرانا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ پاؤں میں اچھا موچر انڈر پا کاعدگی سے لگایا جائے اور موسم سرما میں موزوں کا استعمال کیا جائے۔ بہت زیادہ صابن اور پانی کے استعمال سے گریز کیا جائے کیونکہ یہ پاؤں کی مزید خشکی کا سبب بنتا ہے۔

سونے سے قبل پاؤں - جھانویں سے رگڑ کر دھو لیں اور پھر موچر انڈر پا کھڑک کر موزے پہنیں۔ اگر آپ ہزاروں سے موچر انڈر خرید سکتی ہیں تو خرید

لیں لیکن کچھ گھریلو نسخوں سے بھی آپ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ یہ طریقے آسان بھی ہیں اور بے حد مفید بھی۔

ان کو اچھی طرح ملا لیں اور دن میں تین بار ہاتھوں پر لگائیں۔ رات کو تین گھاس نیم گرم پانی میں ایک چمچ نمک اور ایک چمچ سرسوں کا تیل ملا لیں۔ دس منٹ تک دونوں ہاتھ اس میں رکھیں۔ اب جھانویں سے اچھی طرح رگڑ کر صاف کر لیں۔ پھر تویہ سے پیر خشک کر کے گھیسرین کا آمیزہ لگائیں۔ پھر سوتی موزے پہن کر سو جائیں۔ صبح پاؤں دھو لیں۔ کچھ دنوں میں ہاتھ صاف ہو جائیں گے۔

ایڑیاں پھٹنے سے بچانے کے لیے رات سونے سے پہلے بکری کا کچا دودھ مل لیں۔ ہاتھوں پر لگانے کے لیے۔

گلاب کا عرق..... ایک کپ
گھیسرین..... دو جچے
اس کو ملا کر محلول بنالیں۔ ایک شیشی میں ڈال کر

پکھن میں رکھ لیں جب کام کاج سے فارغ ہوں تو ہاتھوں پر لگالیں، ہاتھوں کی جلد نرم و ملائم ہو جائے گی۔

چہرے پر دودھ اور گلاب کا عرق برابر مقدار میں لے کر دن میں تین بار لگائیں۔ ایک چمچ دودھ میں دودھ بادام باریک پیس کر اسے چہرے پر لگائیں۔ اس سے آپ کا چہرہ شاداب رہے گا۔

چہرے پر رات سونے سے پہلے کوئلہ کریم سے مساج کریں، اگر کوئلہ کریم نہ ہو تو ایک چمچ بالائی مٹا ایک لیہوں کا عرق ملا کر کریم بنالیں اور رات کو سونے سے پہلے چہرے پر لگائیں۔

بالوں میں خشکی کے لیے دو جچے دہی میں دو جچے سرسوں کا تیل ملا کر نہانے سے آدھا گھنٹہ قبل سر میں خوب اچھی طرح ملیں۔ پھر نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ خشکی دور ہو جائے گی۔

موسم سرما میں بالوں میں تیل یا کاعدگی سے لگائیں تاکہ آپ کے بال خشک نہ ہوں۔